(۱)

بسم اللہ

نمبر ۱۷۵ — فہرست مضامین ماہ جنوری ۱۹۲۶ء — جلد ۳۰

مطبوعات جدیدہ

تصانیف مولانا عبدالحلیم شرر

ابوالحسنین - حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مختصر سوانح حیات - قیمت ۸/

مقالات شرر - مولانا شرر کے ۲۶ مطبوعہ مضامین کا دلچسپ مجموعہ - قیمت عہ

تصانیف خواجہ حسن نظامی دہلوی

شامی جہاد - اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ملک شام فتح کرنے کے تفصیلی واقعات - حجم ۵۳۰ صفحے - قیمت صرف عہ

سلاطین بہمنی - دکن کی اسلامی حکومت کی مختصر تاریخ - قیمت ۶/

اولاد کے کان میں کہنے کی باتیں - زندگی کے روزانہ واقعات سے بچوں کو سبق سکھانے کے لیے یہ روزنامچہ ہدایات مرتب کیا گیا ہے - قیمت ۶/

اردو سکھانے کے مضامین کا پہلا حصہ - بچوں اور غیر اردو داں لوگوں کے سیکھنے کے لیے - قیمت ۶/

پرندوں کی تجارت - جس میں پرندوں کی پرورش انکے علاج اور معرفی انڈے کے بیوپار کے طریقے ہیں - ۸/

حلوائی کی تعلیم - جو حلوائی کا پیشہ کرنا چاہیں انکے لیے اور شوقیہ پکانیوالی عورتوں کے لیے بھی کارآمد ہے - قیمت ۸/

الوسیلۃ - شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ کی لاجواب تالیف - جس میں "وابتغوا الیہ الوسیلۃ" کی تفسیر ہے اور لوگوں نے جو اس آیت کو مشرکانہ خیالات کے جواز کا آلہ بنا لیا ہے اسکی بخوبی تردید کی گئی ہے اور اسلام کی اصلی تعلیم خالص توحید کو نمایاں کیا گیا ہے - ترجمہ کے لیے مولانا عبدالرزاق کا نام ہی کافی ہے - قیمت ۱۲/

کشاف الہدیٰ - مدراس کے مشہور قومی لیڈر یعقوب حسن سیٹھ نے کلام مجید کے متعلق ایک بسیط کتاب شائع کرنے کا ارادہ کیا ہے یہ اسی کا مقدمہ ہے - جسکے ملاحظہ سے "کتاب الہدیٰ" کی اہمیت کا اندازہ ہوگا - یہ مقدمہ بھی قرآن پاک کے متعلق نہایت قیمتی معلومات سے لبریز ہے - قیمت ۱۲/

سیرۃ امام ابن تیمیہ - چودھری غلام رسول مہر بی اے چیف ایڈیٹر اخبار زمیندار لاہور نے یہ مختصر سوانحعمری تحریر کی ہے - قیمت ۹/

تاریخ زوال روما - نامور انگریز مورخ ایڈورڈ گبن کی مشہور ہسٹری آف دی ڈیکلائن اینڈ فال آف دی رومن ایمپائر کے ترجمہ کی پہلی جلد - از مسٹر مطلب حسین عالی بی اے - حجم ۲۰۰ صفحے قیمت ۱۲/

فرہنگ اصطلاحات علمیہ - انجمن ترقی اردو نے گیارہ بارہ سال کی کوشش میں یہ لغت تیار کیا ہے جس میں علم ہیئت، نباتات، ریاضیات، حیاتیات، علم مقدیہ وغیرہ ۲۲ ہزار کے قریب اصطلاحات انگریزی و اردو میں دی ہیں - قیمت ۴/

ملنے کا پتہ :- الناظر بک ایجنسی، لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الناظر

نمبر ۱ جلد ۳۰ — ماہ جنوری سنہ ۱۹۲۶ء

جمہوریتِ افلاطون

فلاسفۂ یونان کے سرتاج افلاطون کے یہ مکالمات جو جمہوریت کے نام سے موسوم ہیں، اُس کی تصانیف میں خاص طور پر ممتاز ہیں۔ ہمارے مکرم جناب مرزا محمد عسکری صاحب بی اے، سکرٹری انجمن اُردو لکھنؤ نے ان کو اردو کا لباس پہنانا شروع کیا ہے۔ اور نمونے کے طور پر کچھ اوراق ہمیں عنایت فرمائے ہیں۔ اگر یہ ترجمہ اہل نظر نے پسند کیا تو امید ہے کہ جلد کتابی صورت میں شایع کیا جا سکے گا۔

ایڈیٹر

مقالۂ اول

شریکِ مکالمہ:- سقراط (Socrates) گلوکان (Glaucan) پولیمارکوس (Polemarchus) ادیمنطوس (Adeimantus) کفالوس (Cephalus) تھراسیماکوس (Thrasymachus) کلائٹوفون (Cleitophon)

سقراط = س، گلوکان = گ، پولیمارکوس = پ، ادیمنطوس = ا، کفالوس = ک، تھراسیماکوس = ت، کلائٹوفون = کل

میں کل ارسطون (Ariston) کے بیٹے گلوکان کے ساتھ پیریوس (Piraeus) گیا تھا کہ دیوی کے مندر میں دعا مانگوں اور یہ بھی خواہش تھی کہ پھر وہ میلہ دیکھوں جو دیوی کے نام سے پہلی مرتبہ وہاں ہونے والا تھا۔ اہل ایتھنز (Athens) کے جلوس کو دیکھ کر میں بہت خوش ہوا، مگر تھریس والوں کا جلوس بھی میرے نزدیک کچھ کم شاندار نہ تھا۔ ہم دونوں آدمی دیوی سے دعائیں مانگ کر اور میلہ کی سیر کرکے شہر کو واپس آنے کا ارادہ کر رہے تھے کہ پولیمارکوس، کفالوس کے بیٹے نے ہم کو دور سے دیکھ لیا اور ایک آدمی دوڑایا اور ہم سے ٹھہرنے کو کہا۔ آدمی نے پیچھے سے آکر میرا جبہ پکڑ لیا اور کہا کہ پولیمارکوس کہتے ہیں ذرا ٹھہر جائیے۔ میں نے پوچھا پولیمارکوس کہاں ہیں۔ آدمی نے اشارہ سے بتلایا کہ وہ پیچھے آرہے ہیں۔ ہم دونوں اُن کے انتظار میں ٹھہرے رہے یہاں تک کہ پولیمارکوس اور اُنکے ساتھ گلوکان کا بھائی ادمینطوس، اور نکیا (Nicias) کا بیٹا نکراتوس (Niceratus) اور چند اور لوگ بھی جو جلوس سے واپس آرہے تھے ہم تک پہونچ گئے۔

پولیمارکوس نے فوراً پوچھا "اگر میں غلطی نہیں کر رہا ہوں تو سقراط آپ کا ارادہ شہر کی واپسی کا ضرور ہے"۔

میں نے جواب دیا "تمھارا خیال غلط تو نہیں ہے"۔

اُنھوں نے کہا "ہمارے ساتھیوں کی کثرت کو کیا آپ نہیں دیکھتے؟"

میں نے کہا "بیشک میں دیکھتا ہوں"۔

انھوں نے کہا "تو پھر یا تو اپنے تئیں ہماری جماعت سے آپ قوی تر ثابت کیجیے، یا ہمارا کہنا آپ کو ماننا ہوگا"۔

میں نے جواب دیا "نہیں، ایک تیسری صورت بھی ممکن ہے یعنی ہم تم کو سمجھا بجھا کر راضی کرلیں"

انھوں نے کہا "یہ کیونکر ممکن ہے کہ ہم آپ کی کچھ نہ سنیں اور پھر بھی راضی ہو جائیں"۔

لہ ایتھنز سے بہت قریب واقع ہے اور عرصہ قدیم سے یونان کا ایک مشہور بندرگاہ ہے۔ ایتھنز اور پیریوس کے درمیان دو لمبی لمبی دیواریں واقع تھیں جنکے نشانات اب بھی کچھ باقی ہیں۔ زمانۂ قدیم میں پیریوس یونان کے جمہوریت پسند لوگوں اور نیز غیر ملکی اشخاص کا ایک بڑا مرکز تھا۔ اب بھی یہ ایک مختصر سا بندرگاہ اور تجارت کی منڈی ہے۔

سلہ یہ دیوی غالباً آرٹمس یا ڈاینا تھی جس کو اہل دیہات و شکاری لوگ بہت مانتے تھے۔

گلوکان نے کہا "بیشک یہ ممکن نہیں"۔
پولیمارکوس نے کہا "تو اب یقین کر لیجیے کہ ہم آپ کی اس معاملہ میں ایک نہ سنیں گے"۔
ادیمنطوس نے کہا "کیا آپ کو نہیں معلوم کہ آج رات کو دیوی کے اعزاز میں گھوڑوں پر مشعل کی دوڑ ہوگی؟"
میں نے متعجب ہوکر پوچھا "گھوڑوں پر مشعل کی دوڑ ——— یہ واقعی قابل دید ہوگی۔ کیا سوار لوگ اپنے ہاتھ میں مشعل لیں گے اور ایک دوسرے کو دیتے جائیں گے اور گھوڑا دوڑاتے جائیں گے؟ یہ نہیں تو پھر کیا ہوگا؟"
پولیمارکوس نے جواب دیا "آپ کا خیال صحیح ہے۔ اسکے علاوہ رات گئے ایک قابل دید میلہ ہوگا۔ ہم سب کھانے سے فراغت کرکے اُسکو دیکھنے چلیں گے اور وہاں اکثر اپنے نوجوان دوستوں سے ملیں گے اور مزے کی باتیں رہیں گی۔ اس لیے میں باصرار کہتا ہوں کہ آج رات کو آپ یہیں رہ جائیے اور ہماری اس درخواست کو نامنظور نہ فرمائیے"۔
گلوکان نے یہ سُن کر میری طرف دیکھا اور کہا "ایسی صورت میں ہمارا ٹھہرنا ضروری معلوم ہوتا ہے"۔
میں نے جواب دیا "اگر تمھاری یہی رائے ہے تو کیا مضائقہ ہے"۔
اس قرارداد کے بعد ہم پولیمارکوس کے ساتھ اُنکے گھر گئے جہاں اُن کے دونوں بھائی لائیسیاس (Lysias) اور یوتھی ڈیموس (Euthydemus) اور تھراسیماکوس باشندۂ کلسیڈان (Chalcedon) اور کارمنیٹی ڈیز (Charmantides) اور ارسٹانیوس (Thrasymachus) کا لڑکا کلائٹوفون یہ سب لوگ موجود تھے۔ پولیمارکوس کے والد کفالوس سے بھی میری ملاقات ہوئی۔ میری رائے میں یہ بہت بوڑھے ہو گئے تھے اور میں نے انکو ایک عرصۂ دراز کے بعد دیکھا تھا۔ وہ ایک گدّے دار کرسی پر آرام سے بیٹھے تھے اور اُنکے سر پر ایک ہار لپٹا ہوا تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ نذر دے کے فارغ ہوے تھے۔ اُنکے قریب ہر دو جانب بنچیں پڑی تھیں جن پر ہم لوگ بیٹھ گئے۔ کفالوس نے مجھ کو دیکھ کر دعا دی اور کہا۔
ک۔ "سقراط، پیریوس میں تو تم بھولے سے بھی نہیں آتے۔ تم کو چاہیے کہ جلد جلد ملا کرو۔ اگر مجھ میں شہر تک پیدل جانے کی قوت ہوتی تو تم کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہ تھی میں تم سے اکثر ملتا رہتا۔ مگر حالت موجودہ میں تم کو آنا چاہیے۔ یقین جانو کہ جسمانی مسرتوں

کے انحطاط سے حکیمانہ گفتگو اور مذاکرہ کا شوق مجھ کو اُسی نسبت سے اور بڑھ گیا ہے اور اب اُسی میں بہت مسرت حاصل ہوتی ہے - اسی وجہ سے میں تم سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ ایک بے تکلف دوست کی طرح جلد جلد ملا کرو تاکہ ان نوجوانوں کو تمھاری صحبت اور گفتگو سے فائدہ اُٹھانے کا موقع حاصل ہو۔"

س - " سچ یہ ہے کہ مجھ کو خود معمر اشخاص سے باتیں کرنے میں بہت لطف آتا ہے - اس وجہ سے کہ جس شاہراہ پر وہ ہم سے پہلے جا چکتے ہیں اُسی پر بہت ممکن ہے ہم کو بھی چلنا ہو، تو ہم کو چاہیے کہ اپنے پیشروؤں سے راستہ کی پوری کیفیت کہ آیا وہ آسان ہے یا دشوار گذار اور آیا وہ ہموار ہے یا ناہموار اور خطرناک، وقتاً فوقتاً پوچھتے رہیں تاکہ ہماری معلومات اُسکے متعلق وسیع ہوتی جائیں اور چونکہ اب آپ عمر کے اُس حصہ پر پہونچ گئے ہیں جس کو ہمارے شاعر "آستانہ عمر" سے تعبیر کرتے ہیں لہذا آپ سے بڑھکر کون شخص اس رائے دینے کا مستحق اور موزوں ہو سکتا ہے - اچھا یہ فرمایئے کہ اس عمر میں زندگی آرام دہ ہے یا تکلیف دہ؟"

ک - " سقراط! میں اپنا ذاتی تجربہ تم سے ضرور بیان کروں گا - میں اور میری طرح کے بعض اور معمر اشخاص اکثر ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور تبادلۂ خیالات کرتے ہیں - ایسے موقعوں پر اکثر ہم میں کے گذشتہ ایام جوانی کو یاد کر کرکے سخت افسوس کرتے ہیں - شباب کی عشقبازیاں، ناؤ نوش کی محفلیں، احباب کی دعوتیں اور جلسے اُنکو یاد آتے ہیں اور اُنکے دلوں پر سانپ لوٹ جاتا ہے - اُنکے نزدیک زمانۂ شباب گویا ایک حق تھا جس کا چھن جانا اُنکو سخت ناگوار ہوتا ہے - اسی وجہ سے وہ کہتے ہیں کہ اُس وقت زندگی زندگی تھی اور اب موت سے بدتر ہے - بعض بوڑھوں کو یہ شکایت ہوتی ہے کہ چونکہ اُنکے جوان عزیز اُن کی کمزوریوں کا مضحکہ اُڑاتے ہیں اس وجہ سے بڑھاپا نہایت بری اور تکلیف دہ چیز ہے - لیکن میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ایسے لوگ اپنے مزاج کی ناشگفتگی کا اصلی سبب نہیں سمجھتے - کیونکہ اگر اس کا سبب بڑھاپا ہوتا تو یہ شکایتیں مجھ کو اور کل لوگوں کو جو اس سن کو پہونچ گئے ہیں ضرور محسوس ہوتیں مگر امر واقعی یہ ہے کہ میں بہت سے ایسے کبیر السن اشخاص سے مل چکا ہوں جنھوں نے اپنے مزاج کی کیفیت اس سے بالکل مختلف بیان کی - مثلاً ایک مرتبہ (Sophocles)

سفوکلیز شاعر[۵۱] سے ایک مجمع میں جس میں میں بھی موجود تھا، کسی نے پوچھا "کہو سفوکلیز۔ عشقبازی کے اب بھی قابل ہو یا نہیں"۔ جواب دیا "بحمداللہ مجھ کو اُس سے نجات مل گئی اور اب میری وہی حالت ہے جیسے کوئی شخص کسی دیوانے اور بے رحم آقا کے پنجے سے نکل کے خوش ہو"۔ میرے نزدیک سفوکلیز کا یہ مقولہ بالکل سچ ہے کیونکہ بلاشبہہ بڑھاپے میں عشق اور اسی قسم کے دوسرے جذبات سے نجات مل جاتی ہے اور دل کو سکون اور اطمینان حاصل ہوجاتا ہے۔ جب بڑھاپے میں خواہشیں کم ہوتی ہیں اور اُن کا زور گھٹ جاتا ہے اُسوقت سفوکلیز کے مقولہ کی صحت معلوم ہوتی ہے اور بے شک نظر آنے لگتا ہے کہ کسی کو دیوانے اور ظالم مالکوں سے چھٹکارا مل گیا۔ مگر بڑھاپے کی شکایتوں اور نوجوان اعزا کے طعنوں کا دوسرا سبب ہے جس کو سن سے کوئی تعلق نہیں بلکہ خود آدمی کے مزاج سے تعلق ہے۔ اگر لوگوں کو اپنے دلوں پر قابو اور مزاجوں میں ہمواری ہو تو بڑھاپا بالذات کوئی ناقابل برداشت چیز نہیں ہوسکتا۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو میرے نزدیک ایسے آدمیوں کی جوانی بھی تکلیف سے خالی نہیں ہوسکتی"۔

[مجھ کو کفالوس کی یہ باتیں بہت پسند آئیں۔ اور اس خیال سے کہ وہ اپنے خیالات اور زیادہ مشرح طور پر ظاہر کریں میں نے کہا]

س "مگر ممکن ہے اور لوگ اس معاملہ میں آپ کے ہم خیال نہ ہوں اور کہیں کہ آپ کی دولت نہ کہ آپ کا مزاج آپ کو اس سن میں مطمئن رکھتا ہے۔ کیونکہ مشہور ہے کہ دولت سے بہت سے اطمینان حاصل ہوتے ہیں"۔

ک۔ "سچ ہے۔ اکثر لوگ میرے کہنے کا یقین نہیں کرتے اور میرے نزدیک اُن کا خیال بھی کسی قدر ٹھیک ہے، نہ کہ اُس حد تک جیسا کہ وہ سمجھتے ہیں۔ مجھ کو اس موقع پر تھیمسٹاکلیز[۵۲]

---

[۵۱] بہت بڑا شاعر اور ڈراما نگار۔ سقراط کا ہمعصر تھا، نہایت حسین، با اخلاق اور نیک مزاج شخص تھا۔ اُسکے سات ڈرامے اسوقت موجود ہیں۔ اپنے دونوں معاصروں اسقیلیوس (Aeschylus) اور یوریپی ڈیز (Euripides) سے بہتر اور زیادہ مشہور ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسٹیج کے تصویر دار پردے اُسی کی ایجاد ہیں۔

[۵۲] ۵۱۴ تا ۴۶۰ قبل مسیح۔ ایتھنز کا مشہور سیاست داں گذرا ہے۔ اس نے ایرانیوں کے مقابلہ میں یونان کی طرف سے بڑی جد و جہد کی۔ اور جب ایرانی درۂ تھرا پلی (Thermopylae) (دیکھیے صفحۂ آئندہ)

(Pindar) "بڑھاپے کی اصلی رفیق" ہے - دیکھو سقراط! پنڈار نے کیا خوب کہا ہے کسی شخص کے متعلق جس کی زندگی عدل اور برگزیدگی کے ساتھ بسر ہوئی تھی کہ
"خوشگوار اُمید اُس کی ساتھی ہے جو اُس کے دل کو ہر وقت خوش رکھتی ہے اور بڑھاپے کی اصلی رفیق ہے - اُمید ہی فانی انسان کی متغیر خواہشوں کو جادۂ استقامت پر رکھتی ہے"

اس میں شک نہیں کہ اس مقولہ میں ایک معرفت چھپی ہوئی ہے اور اسی وجہ سے میری رائے میں دولت ایک بیش قیمت چیز ہے - ہر شخص کے واسطے نہ سہی مگر نیک لوگوں کے واسطے تو ضرور ہے کیونکہ دولت ہی کے ذریعہ سے ہم غیر ارادی فریب اور کذب تک سے بچ سکتے ہیں - اور اگر بالفرض ہم پر کسی دیوتا کی نذر یا کسی انسان کے قرض کا مطالبہ ہو تو دولت ہی کے بدولت ہم بلا کسی خوف کے اور نہایت اطمینان کے ساتھ سفر آخرت کی تیاری کر سکتے ہیں - اس کے علاوہ بھی دولت کے اچھے اچھے مصرف ممکن ہیں مگر میں نے سب کا موازنہ کر کے ایک ہوشیار اور عقلمند آدمی کے واسطے اسی کو دولت کا سب سے اچھا مصرف اور سب سے بڑی خدمت قرار دیا ہے"

س- کفالوس! آپ نے جو کچھ کہا بہت خوب کہا ، مگر یہ تو فرمائیے کہ صفت عدل سے جس کا ذکر آپ نے اپنی تقریر میں دو تین مرتبہ کیا، کیا مطلب ہے؟ کیا ہم اُس کی تعریف یہ کریں کہ عدل صرف صدق اور واپسی حقوق کا نام ہے' یا یہ بھی ممکن ہے کہ اس قسم کے افعال بعض وقت عدل اور بعض وقت ظلم کہے جا سکتے ہیں - مثلاً اس کو ہر شخص تسلیم کرے گا کہ اگر کوئی آدمی بحالت صحت عقل مہلک ہتھیار اپنے ایک دوست کے حوالہ کر دے اور پھر بحالتِ جنون اُنکو واپس مانگے' تو ظاہر ہے کہ یہ امانت ہرگز واپس نہ ملنا چاہیے اور اُس دوست کو کوئی شخص عادل نہ کہیگا اگر وہ اُن ہتھیاروں کو واپس دے یا مجنون سے یہ معاملہ من وعن بیان کرنے پر تیار ہو"

ک "تمھارا خیال بالکل صحیح ہے"

س "تو پھر عدل کی تعریف محض سچ بولنا اور واپسی حق ہوئی" (باقی)

---

۱ یونان کے بہادران قومی کا ذکر اُن میں ہے - بعض مشہور خمریات' اور ناچ کی نظمیں ہیں - بعض مرثیے بھی ہیں مگر اکثر اب مفقود ہیں -

عربی رقم

علیگڈھ کالج کے ایک قابل اور ذہین گریجویٹ، جو میرے وطن میں حکومت کی ایک اونچی کرسی پر متمکن تھے، فقیر پر بے انتہا عنایت فرماتے تھے۔ معمولی شناسائی تو طالب علمی کے زمانہ ہی سے تھی۔ یہاں آنے کے بعد، چونکہ وہ کلب میں جا کر ٹینس اور ٹرمپ کھیلنے کے عادی نہ تھے لہذا شام کے وقت کبھی غریب خانے پر تشریف لے آتے، کبھی مجھے دولتخانے پر بلاتے۔ قریبًا روزانہ ملنے جلنے سے مراسم بہت زیادہ بڑھ گئے اور تکلف و تصنع کے پردے اُٹھ گئے۔

ایک دن کچہری کی تعطیل تھی۔ میں اپنے مکان پر تھا کہ اُنکے اردلی نے لاکر رقعہ دیا جس میں لکھا تھا:-

"بھائی .....

پارسل آیا ہے۔ خانساماں چلا گیا۔ رااہ کی ضرورت ہے۔ شام کو دے دوں گا۔

خدابخش کو دے دیجیے۔ ......"

میں نے اس رقعے کو بلا مبالغہ کوئی تین چار دفعہ تو پڑھا ہوگا مگر کچھ نہ سمجھا۔ بڑے چاچ کے شعر یا ریاضی کے سوال کی طرح ہر ہر لفظ پر غور کیا، ہر پہلو سے اُلٹا پلٹا۔ سمجھنے کی پوری طرح کوشش کی۔ طبیعت پر زور ڈالا۔ مگر مفہوم ذہن میں نہ آنا تھا نہ آیا۔ پانچ متفرق اور غیر مربوط جملے جیسے چھوٹے بچوں کی پہلی کتاب میں ہوتے ہیں۔ سچ بول۔ کواڑ کھول۔ کپڑا اتر ہے۔ وہ اندر ہے۔ الٰہی یہ رقعہ ہے یا تشریح الحروف کا سبق! مجھ سے مذاق سے کیا ہے؟ مگر ایسا ثقہ سنجیدہ جنٹلمین اور مجھ غریب سے مذاق! اور وہ بھی ایسا بھبتی! مذاق نہیں کوئی بات ضرور ہے۔ مگر کیا بات ہے؟ کچھ مانگا ضرور ہے۔ مگر کیا مانگا ہے؟ **رااہ-رااہ** کیا چیز ہے؟

دفعتًہ خیال آیا کہ راہ کو باٹ بھی کہتے ہیں، کہیں تولنے کے باٹ تو نہ منگائے ہوں؟ مگر بی بی کے نہ ہونے سے گھر تو بارہ باٹ ہے تو لیں گے کیا؟ پارسل آیا ہے۔ کیا پارسل تولیں گے؟

میں- "ارے بھئی خدابخش!"

خدابخش- "حضور"

میں- "اس رقعے میں لکھا کیا ہے؟"

خدا بخش۔ "لے بھلا حضور اب مجھے کیا معلوم کیا لکھا ہے۔ لکھنے والے سرکار پڑھنے والے حضور۔ میں جاہل آدمی۔ حکم دیا رقعہ پہونچا دو۔ پہونچا دیا۔ اب جو جواب حضور دیں گے سرکار کو پہونچا دوں گا۔"

میں: "تم سے کہا تو نہیں کہ فلاں چیز لیتے آؤ؟ کچھ تولنا ہے؟ باٹ منگائے ہیں؟"

خدا بخش: "نہیں حضور۔ مجھ سے نہ باٹ کہے نہ ترازو۔ خالی رقعہ دیا اور کہا سید صاحب کو دو۔"

میں: "اچھا ٹھہرو۔ میں خود چلتا ہوں۔"

چنانچہ میں خدا بخش کے ساتھ ہولیا۔ مکان دُور نہ تھا۔ تین چار منٹ میں پہونچ گیا۔

وہ: "السلام علیکم۔ آپ نے کیوں تکلیف کی۔ خدا بخش کو دیدیے ہوتے۔"

میں: "وعلیکم السلام۔ دے تو میں جب دیتا جب جانتا کہ آپ کیا مانگتے ہیں۔ رقعے کا مطلب میری موٹی سمجھ میں تو آیا نہیں۔"

وہ: "یہ کیوں؟ بھائی میں نے ذرا دیر کے لیے اِکاون روپے منگائے تھے۔ پچاس روپے بارہ آنے کا ایک ویلیو آیا ہے خانساماں کمبخت بازار چلا گیا۔ میں نے سوچا آپ ہی سے منگالوں شام کو دیدوں گا۔ رقعے میں نہیں لکھا تھا؟ (رقعہ مجھ سے مانگ کر) "یہ لو یہ کیا لکھا ہے۔"

میں نے روپے منگانے کا انتظام کرکے سلسلۂ کلام جاری کیا

میں: "ہاں اب رقعہ دکھائیے کہاں لکھا ہے؟"

وہ: "یہ دیکھیے یہ لکھا ہے۔"

میں: "بھائی خدا کے لیے انصاف کرو! لکھتے ہو راہ کی ضرورت ہے۔ پڑھتے ہو اِکاون روپے کی ضرورت ہے۔ راہ کے معنی اکاون روپے۔ کس زبان، اور کس لغت میں ہیں۔ طرح طرح سے سوچا کہ خانساماں کے چلے جانے سے راہ کی کیا اور کیوں ضرورت پیش آئی؟ اور وہ کیا چیز ہے جو شام کو آپ مجھے دیدیں گے اور میں خدا بخش کو ابھی دیدوں؟ آپ کی آفیشل اور پرائیویٹ احتیاط کے مقتضیات پر نظر کرکے سوچا کہ راہ کوئی معمّا ہے۔ اشارہ ہے۔ رمز ہے۔ تلمیح ہے۔ قصہ طلب واقعہ ہے۔ مگر کوئی بات ذہن میں نہ آئی۔ راہ۔ طریق۔ سبیل۔ راستہ۔ سب کو اُلٹا پلٹا۔ اِسی ضمن میں خیال آیا کہ راہ کو باٹ بھی کہتے ہیں۔ کہیں تولنے کے باٹ نہ منگائے ہوں۔ پھر یاد آیا کہ آپ تو ہوٹل کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ خانساماں کا بل روزانہ چکا دیا جاتا ہے۔

تولنے کے لیے حافظِ شیراز کا شعر یا مقدمہ کا ثبوت ہی ہے۔ جب دماغ بات سمجھنے اور جواب دینے سے قاصر رہا تو خود دوڑا آیا کہ دیکھوں معاملہ کیا ہے"۔

وہ (سقف شکاف قہقہہ لگا کر) "لاحول ولا قوۃ! میں نے اکاون کے ہندسے سے پہلے روپئے کی رَ سے لکھ دی تھی جیسے انگریزی میں ہندسے سے پہلے روپئے کے لیے R۔ پاؤنڈ کے لیے £ اور ڈالر کے لیے $ لکھ دیتے ہیں۔ واقعی آپ نے راہ ہی پڑھا ہوگا۔ کاش کہ میں نے حرفوں میں ہی اکاون لکھ دیے ہوتے۔ مگر میرے نزدیک یہ بھدا طریقہ تھا۔ ایسے موقعوں پر انگریزی میں تعداد کو ہندسوں ہی میں لکھتے ہیں مگر ہندسے سے پہلے R ضرور لکھ دیتے ہیں تاکہ یہ شبہہ نہ ہو کہ روپئے ہیں یا اُپلے۔ اردو میں ہندسے سے پہلے رَ سے لکھنی خاکسار کی ایجاد ہے"۔

میں: "اگر خاکسار اردو میں یہ ایجاد بندہ نہ فرماتا، بلکہ پرانے قاعدے کے مطابق اکاون کو رقم میں لکھ دیتا تو نہ تعداد پر اُپلوں کا شبہہ ہوتا نہ رقعے پر چیتیاں کا دھوکا"۔

وہ۔ "بھئی رقموں کا لکھنا تو مجھے آتا ہی نہیں۔ اگر سیکھوں بھی تو دوسرے ہی دن بھول جاؤنگا۔ والد صاحب قبلہ تو دیہات کا سارا حساب کتاب رقموں ہی میں رکھتے ہیں مگر میری سمجھ میں تو یہ ردی ناکارہ۔ کالا داک۔ چڑیا کا نٹے نہ آئے اور نہ کبھی آئیں"۔

میں۔ "قیامت تو یہی ہے کہ ہماری آنکھوں نے نئی روشنی سے خیرہ ہوکر۔ ہر پرانی چیز کو ردی اور ناکارہ سمجھ رکھا ہے۔ آپ خود محسوس کرتے ہیں کہ محض ہندسہ جب تک صراحت نہ ہو۔ اس امر کے بتانے کے لیے قطعاً ناکافی ہے کہ وہ روپیوں کی تعداد ہے یا اُپلوں کی۔ رقم میں یہ بات نہیں۔ اُس میں جو تعداد لکھی جاتی ہے وہ روپیوں ہی کی سمجھی جاتی ہے نہ اُپلوں کی۔ پرانے حساب داں اگر پچاس اُپلے لکھیں تو ہندسوں میں اور پچاس روپیہ لکھیں تو ہمیشہ رقم ہی میں لکھیں گے تاکہ غلط فہمی نہ ہو۔ رقم اصلاً وابتداءً روپئے ہی کے لیے ہے"!

وہ۔ "مگر رقم کا یاد رکھنا جو سخت مشکل ہے۔ ایک عدد کے لیے ایک خاص بھونڈی بھدی۔ بے معنی لکیر ہے جس کی قیمتِ مفروضہ اگر ذہن سے اُتر گئی تو مطلب غائب"۔

میں۔ "یہ تو ہندسوں کی لکیروں بلکہ ہر اسم کے متعلق بھی کہا جا سکتا ہے۔ علم اور حافظے کا ساتھ ہے۔ اگر آپ ۸ کے ہندسے کی قیمتِ مفروضہ بھول گئے یا کسی اسم مثلاً گھوڑے اور پانی کے مسمّے کا تصور ذہن سے اُتر گیا تو ۸ کی شکل اور گھوڑے اور پانی کے اسم سے آپ کیا سمجھیں گے؟"

وہ۔ (ہنس کر) "ہندسے تو اپنے معانی کے ساتھ طبیعت میں اس درجہ راسخ ہوگئے

ہیں کہ شکل دیکھتے ہی اُن کی قیمت مفروضہ کا تصور ذہن میں آ جاتا ہے"۔

میں "اسی طرح رقم کو بھی معانی کے ساتھ طبیعت میں راسخ کر لیجیے۔ اور اسکے ساتھ رقم کی یہ خصوصیت بھی یاد رکھیے کہ اُس کی شکل ہی بامعنی ہے۔ یعنی اُس کی قیمت محض فرضی طور پر مقرر نہیں کی گئی بلکہ ہر شکل۔ چلا کر اپنی زبان سے اپنی قیمت بتاتی ہے"۔

وہ (چونک کر) "یہ کیسے؟"

میں "آپ عربی تو جانتے نہیں؟"

وہ "آپ خود جانتے ہیں کہ نہیں جانتا۔ ورنہ جتنا رعب آپ بٹھالیتے ہیں اُس سے سوایا۔ ڈیوڑھا تو میں بھی بٹھالیتا"۔

میں "لائیے آپ کو رقم سکھا دوں اور دعوے سے کہتا ہوں کہ بھلا آپ بھول تو جائیں بشرطیکہ میں جو کچھ میں کہوں اُس پہ توجہ کریں۔ آپ خود تسلیم کرلیں گے کہ رقم بے معنی شکل اور اسکی قیمت فرضی و اعتباری نہیں اسکے بعد آپ داد دیں گے کہ آپ کے بزرگوں کے دماغ نے کیسا بہترین اور سادہ ترین شارٹ ہینڈ ایجاد کیا ہے جس سے بڑھ کر یورپ اپنی ذکاوت و ذہانت اور فہم و فراست کے باوجود آج تک ایجاد نہ کرسکا۔ اب لائیے پنسل اور کاغذ"۔

وہ "یہ لیجیے حاضر ہے"۔

میں "پہلے یہ یاد رکھیے کہ رقم عربی گنتی کی مختصر شکل کا نام ہے۔ اور مختصر نویسی کا پورا تجربہ آپ کو دفاتر کی زود نویسی کی وجہ سے ہو چکا ہے کہ جلدی میں بعض شوشے گوشے بڑھ اور بعض گھٹ جاتے ہیں اور "جوہر کامل" منشی جی کے قلم تلے آکر "چوہے کا بل" ہو جاتا ہے اور "خوگیر کہنہ" "جو کی کھتی"۔ اب سنیے۔

ایک کو عربی میں واحد اور احد کہتے ہیں۔ مگر محاسبین متقدمین نے بجائے واحد یا احد کے ایک دوسرا لفظ عدد منتخب کیا۔ جسے خط شکستہ میں لکھا جائے تو عدد ہوتا ہے۔ لیکن جیسا آگے چل کر معلوم ہوگا، بیس کے لیے جو شکل مقرر کی گئی ہے وہ لفظ عدد بخطِ شکستہ سے اِس قدر اشبہ ہے کہ جلدی میں لکھا جائے تو دونوں میں امتیاز مشکل ہو۔ لہذا اس التباس کو رفع کرنے کے لیے اُنھوں نے عدد بخطِ شکستہ کے آخر میں ایک شوشہ بشکل الف بڑھا دیا جس سے دونوں شکلوں میں مابہ الامتیاز پیدا ہو گیا۔ اور ایک کی شکل یہ ہوئی

عدا

دو　جب ایک کو لفظ عدد سے تعبیر کر لیا گیا تو عربی تثنیہ سے عدد کا دو یعنے تثنیہ عددان ہوا۔ جو بخطِ شکستہ یوں لکھا جاتا ہے　عدد

تین　کو عربی میں ثلثہ کہتے ہیں۔ ہندوستان سے باہر ممالک اسلامی میں تو آج بھی تین کے لیے جو رقم مقرر ہے وہ ثلثہ ہی ہے مگر ہندوستان کے سیاق دانوں نے آخر کا شوشہ کسی قدر نیچے کو کھینچ دیا یعنی　سے

چار　کو اربعہ کہتے ہیں جو خط شکستہ میں لملعہ ہوا۔ درمیانی شوشہ بقول ایک ظریف کے۔ ڈارون والے بندر کی دُم کی طرح کثرتِ استعمال سے گھس گیا اور یہ شکل قائم ہوئی　للعہ

پانچ　کو خمسہ کہتے ہیں جس کی شکل رقم میں آج بھی صاف نظر آتی ہے　صمہ

چھ　کو ستہ کہتے ہیں۔ اس میں آخری شوشہ تین کی طرح کسی قدر نیچے کو کھینچ گیا ہے　سے

سات　کو سبعہ کہتے ہیں جس کی شکل رقم میں بجنسہ صاف معلوم ہوتی ہے۔　سعہ

آٹھ　کو ثمانیہ کہتے ہیں جو بخط شکستہ ممہ ہوا۔ اسکے شوشے گوشے بھی کسی حد تک دفتری قلم کی نذر ہو گئے۔ اور اب یہ شکل محاسبین ہند نے رکھی ہے　ممے

نو　کو تسعہ کہتے ہیں۔ جو رقم میں بھی بجنسہ ویسا ہی ہے　لعہ

دس　کو عشرہ کہتے ہیں۔ چونکہ ش کی کشش نیچے کو کھینچنے سے اکائیوں میں (جن کی جگہ دہائیوں کے نیچے ہے) مل کر بدنمائی پیدا کرتی لہذا کشش کو اوپر کی طرف ایک خوشنما گولائی دی گئی اور یہ شکل ہوئی　عــہ

گیارہ　کو احدعشر کہتے ہیں۔ احد کے لفظ کو خط شکستہ میں یوں لکھیں گے لصد لیکن اس میں اور نو کی رقم میں بھی التباس کا خدشہ تھا لہذا احد کے لیے جو ہر دہائی کے ساتھ آئے یہ شکل مقرر کی گئی۔ لہ۔ جو احد بخطِ شکستہ کی بے شوشہ صورت ہے۔ اور اس لیے گیارہ اس طرح لکھے گئے　لہعــہ

بارہ　دو کی ہر اکائی کے لیے جب وہ دہائی کے ساتھ آئے مستقلاً یہ شکل مقرر ہوئی عــ اور لہذا بارہ یوں لکھے گئے　عــعــہ

اسی طرح تین سے لیکر نو تک اکائیوں کا سرا ایک پڑی لکیر کے ساتھ دہائیوں کے نیچے قائم ہو کر تیرہ سے اُنیس تک یہ شکل قائم ہوئی:۔

تیرہ　عــہ

چودہ — للوعہ

پندرہ — دعہ

سولہ — عہ

سترہ — موعہ

اٹھارہ — ہعہ

اُنیس — لوعہ

بیس کو عربی میں عشرین کہتے ہیں جو خطِ شکستہ میں یوں لکھا جائے عـــ ۔ اسکی شکل کو بھی دس کی شکل سے بچا کر یہ شکل قائم کی — عہ

اسی طرح باقی دہائیوں کی صورت ہے۔ یعنی :۔

تیس — سہ

چالیس — للعہ

پچاس — صہ

ساٹھ — سہ

ستر — معہ

اسی اس پر دفتری عمل کسی قدر زیادہ ہوا اور ہندوستان میں آج کل اسکی یہ شکل ہے۔ — لہ

نوے — لعہ

سو کو عربی میں مائۃ کہتے ہیں۔ چنانچہ رقم میں اسکی شکل بجنسہٖ رہی ہے۔ — ما

دوسو کا تثنیہ مائتین ہوا۔ جسے خطِ شکستہ میں ما لکھیں گے چنانچہ تقریباً یہی شکل رقم میں قائم ہے۔ — ما

اسی طرح سو کے داہنی طرف اکائی کا سرا بڑھا کر نو سو تک شکل مقرر کی گئی ہے

ہزار کو الف کہتے ہیں۔ چنانچہ نہایت ہی خفیف تغیر کے ساتھ یہی شکل مع تنوین اب بھی قائم ہے۔ — الـــً

یہ ہے رقموں کی داستان۔ مجھے امید ہے کہ اب آپ انھیں ردی: ناکارہ ۔ کاواک۔ چڑیا کانٹے۔ نہ سمجھیں گے بلکہ ایک مفید و کارآمد چیز خیال کریں گے اور موجد کی ذہانت کی داد دینگے"

وہ ": بھئی واقعی کمال کیا ہے - میں آپ کی تقریر نہایت صبر سے سنتا اور دل ہی دل میں رقم کے ایجاد کرنے والے کی قابلیت کی داد دیتا رہا - رقم حقیقت میں گنتی لکھنے کا نہایت مختصر - جامع - اور کارآمد طریقہ ہے - اسکی طرف سے بے توجہی انگریزی دانوں کی نافہمی ہے - میری رائے میں اُردو میں روپئوں کی بڑی سے بڑی مقدار تک لکھنے کے لیے اس سے بہتر اور کوئی شکل ہو ہی نہیں سکتی - پنسل سے لکھا ہوا یہ کاغذ آپ مجھے دیدیجیے تاکہ میں رقموں کی شکل ذہن نشین کرلوں - آیندہ میں تو رقم ہی کا استعمال کروں گا "

میں ": شکر ہے کہ آپ کو بے وقوفوں کی کوئی بات تو پسند آئی - ممکن ہے اسی طرح رفتہ رفتہ اور باتیں بھی پسند آجائیں -

اندک اندک عشق بر راہ آورد بیگانہ را

لیکن جیسا میں عرض کرچکا ہوں آپ تو یورپ ہی کی ہر چیز پر ایمان لائے - اور ایشیا کی ہر چیز میں کیڑے ڈالنے پر اُدھار کھائے ہوے ہیں - اگر کبھی دقت کاٹنے (یا گاہان نایب کروں تو کہوں واقفیت بڑھانے) کے لیے جی چاہتا بھی ہے تو علم قرآن تک کے لیے سیل اور پامر - سیرۃ نبویؐ تک کے لیے ولیم میور اور واشنگٹن اِرونگ - اور تمدن اسلام تک کے لیے گبن اور میکڈانلڈ ہی کی طرف رجوع فرماتے ہیں

پس از عمرے گر از حالِ منِ بیمار می پرسی
نمی پرسی زمن - آں نیز ہم از اغیار می پرسی

فقیر مضمون العلی

حبِ وطن "

خدا کی سب سے بڑی نعمت یعنی دل کا وہ جذبہ جسے محبت کہتے ہیں، صرف انسان ہی کے حصہ میں نہیں آئی ہے - ایک جنوبی امریکہ کا نہایت خوبصورت طوطا لازشور (اسکاٹ لینڈ) پنجرے میں لایا گیا - اُسنے اپنے ملکی پھل، میوے، اور خوشبودار مرغزار کو جہاں سے وہ اپنے خوبصورت اور دلپذیر رنگ کے پر لاتا تھا ہمیشہ کے لیے خیرباد کہی، اور ایسی جگہ پہونچا جہاں سوائے گھانس کے دھوئیں، سبزہ زمین بغیر سورج کے دن بہار، اور نیز دھشیوں کے کچھ نہ تھا - لیکن اس سرد ملک میں اسکی خدمت اچھی کیگئی - وہ بہت دنوں تک بولتا اور چہکتا رہا حتیٰ کہ عمر کے باعث اسکے پر کہنہ ہوگئے - وہ اندھا ہوگیا اور اُسنے بولنا اور چہکنا چھوڑ دیا - جنوبی امریکہ کا ایک اجنبی اتفاق سے لازشور آیا - اُس نے اس طوطے کو اپنی زبان میں پکارا - طوطے نے اسی زبان میں جواب دیا خوشی کے مارے بے تحاشہ پنجرے میں ناچنے لگا ہوا ناچتے ناچتے گرپڑا اور مرگیا - "حب وطن از ملک سلیماں خوشتر"

حبیب احمد صدیقی

جاوا کا بورو بدر مندر

جاوا کے بودھی مندر بورو بدر کی نسبت عام طور پر معلوم ہے کہ چند سال ہوئے زمین میں سے دبا ہوا برآمد ہوا تھا۔ اسکی ساخت۔ عمارت اور صنعت حیرت انگیز ہے۔ علم تعمیر کے ماہر جوق جوق اس کا ملاحظہ کرنے آتے ہیں۔ اسکی صنعت اور جسامت کا دنیا کی اور عالیشان عمارتوں سے مقابلہ کرتے ہیں۔ حال میں ایک مضمون نگار نے اخبار اسکاٹس مین میں اسکی کیفیت بیان کی ہے جسکا خلاصہ ہم ناظرین کی ضیافت طبع کے لیے عرض کرتے ہیں:-

جزیرہ جاوا کے جنوب مشرق کی طرف ایک رکابی نما میدان میں جسکے چاروں طرف آتش فشاں پہاڑ ہیں یہ مندر بنایا گیا تھا۔ دنیا کی بودھی یادگاروں میں سے اس کا درجہ اعلیٰ ہے۔ جاوا کی آبادی جو مسلمان ہوگئی اسکو "پرانا مچھلی پکڑنے کا دام" کے نام سے پکارتے ہیں۔ دراصل دور سے یہ ایسا ہی معلوم دیتا ہے۔ اسکی ساخت گاؤدمی ہے یعنی اہرام مصری Pyramids سے مشابہ ہے۔ بنیاد کے عرض و طول سے اسکی بلندی ایک ربع سے کم اور اسکا گھیر تخمیناً ۵۰۰ × ۱۲۰ فٹ ہے۔ اسکے چھ طبقے ہیں جنھیں تختے کہہ سکتے ہیں یہ چوکور ہیں اور ان کے گرد تین اور گول تختے ہیں۔ موجودہ عمارت کے سکھر پر کبھی ایک گنبد کے ہونے کے نشان باقی ہیں۔ سکھر جانے کے واسطے چاروں سمتوں میں خوبصورت دروازے بنے ہوئے ہیں۔ جہاں سے اوپر جانے کے لیے سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔

اس مندر میں پتھر جو استعمال ہوا ہے ایک قسم کی آتش فشاں چٹان سرخی لیے ہوئے ہے۔ جو اسکے نواح میں کثرت سے موجود ہے۔ عمارت اکثر مقامات پر خصوصاً سکھر کی جانب کھنڈر ہوگئی ہے جس کی وجہ موسمی اثر زیادہ تر نہیں بلکہ متواتر زلزلوں سے اور جھاڑ جھنکار کے اُگ آنے سے جو جگہ جگہ دھنس گئی ہے اس کی یہ حالت ہوگئی ہے۔ تختوں کی دیواروں میں طاق بنائے گئے ہیں جو عمارت کو مزین کرتے ہیں۔ ان میں سے بُدھا کی مورتیں سنگ سیاہ کی نیچے کی طرف نظر آتی ہیں۔ جاتری جدھر دیکھے بُدھا کی آنکھیں اُس کی آنکھوں سے ملتی ہیں۔ اور اُس کی سکون بخش صورت اُسے اپنے دیوتا کو فراموش نہیں ہونے دیتی۔ ان طاقوں کے پتھر کے دلوں panels میں ایسی گلکاری کی گئی ہے کہ اپنی آپ نظیر ہے۔ جس کا ثانی دنیا میں

موجود نہیں - گول تختوں کی زیبایش چھوٹے چھوٹے گھنٹے کی شکل کے مندروں سے کی گئی ہے جو پتھر کے بنے ہوئے ہیں - اُن میں بھی گلکاری کی گئی ہے - ہر ایک مندر میں بُدھ کی سیاہ پتھر کی مورتی ہے - گنبد اب کھنڈر ہے اس میں بھی بدھا کی بڑی مورتی ہوگی یا بدھا کی کوئی نہ کوئی تبرک یادگار رکھی ہوئی ہوگی -

تختوں پر جو کھود کر نقش بنائے گئے ہیں دیکھنے والے کو حیرت میں ڈالتے ہیں - منہ بولتی مورتیاں ہیں - ان میں کھانا، پینا، نہانا، پہننا، چلنا، بولنا، شکار کرنا گاڑی چلانا، سواری کرنا، ناچنا، لڑنا، کشتی چلانا، ہل چلانا، فصل کاٹنا دکھلایا گیا ہے - حیوانات بھی بیشمار دکھلائے گئے ہیں -

یہ نقوش بدھا کی کہانی کو زندگی دوام بخشتے ہیں - بعض تو مسیحی کہانی بھی یاد دلاتے ہیں - مثلاً کنواری ماں اور اُس کی گود میں مقدس بچہ - بدھا دریا کی سطح پر چل رہا ہے مثل مسیح کے گیلیلی پر چلنے کے - مچھلیاں اُسکے پیروں کے نیچے تیرتی ہیں اور کنارے دریا پر نظارہ کرنے والوں کا ہجوم ہے - سنتوں اور دیویوں کے چہروں کے گرد ہالہ کا حلقہ ہے جو مسیحی تصاویر میں دکھلایا جاتا ہے -

دالانوں ([illegible]) میں بعض خیالی اور بعض تفنن کے لیے سنگین کندہ نقوش ہیں: مثلاً ایک ولے پر ایک کچھوا سمندر پار ہو رہا ہے اور ایک چھوٹا کچھوا اُسکی پیٹھ پر سوار ہے - دوسرے ایک جگہ ڈوبتا جہاز دکھلایا ہے - اُسکے بادبان چیتھڑے چیتھڑے ہیں - جہازراں رسّوں کو پکڑے ہوئے سہارا لے رہے ہیں - اور اسکے پاس سے ایک سمندری دیو جبڑے پھیلائے ہوئے ہے تاکہ انسانوں کو ہڑپ کر جائے - تیسرے ایک جگہ جہازراں ایک کچھوے کی پیٹھ پر آرام سے بیٹھے سمندر پار ہو رہے ہیں - چوتھی جگہ کچھوا ایک اونچے تخت پر بٹھایا گیا ہے - اور ڈوبنے سے بچے ہوئے جہازراں اُس کی پوجا کر رہے ہیں -

دوسرا سلسلہ ولوں کا ہے جس میں استعاروں سے کام لیا گیا ہے - مثلاً کس طرح انسان نے بیل پر قابو پایا ہے - ایک ولے میں ایک بندر محبت سے اپنے ہاتھ بیل کے گلے میں ڈالے ہوئے ہے گویا کوئی عنایت چاہتا ہے - دوسرے ولے میں بندر بیل کی پیٹھ پر سوار ہے - اُسکے پیچھے حضرت انسان کھڑے ہیں - تیسرے میں بندر بیل کی پیٹھ سے اُتر کر اُسکے رخساروں کو تھپک تھپا رہا ہے گویا اُس کا شکریہ ادا کر رہا ہے

جڑھتے اور اخیر دلے پر بیل اور انسان آمنے سامنے کھڑے ہیں۔ انسان مطالبہ کی صورت میں ہے اور غمزدہ بیل کی صورت سے ہو بہو ظاہر ہوتا ہے کہ وہ انکار نہیں کر سکتا۔

علیٰ ہذا جلدیں کی جلدیں لکھی جا سکتی ہیں جن میں انواع و اقسام کی منہ بولتی مورتیں نہ صرف ابتدائی بدھ مت کی تاریخ ظاہر کرتی ہیں بلکہ اُس زمانہ کے طرز زندگی اور عادات دکھلاتی ہیں جب مندر زیر تعمیر تھا جو شاید ساتویں صدی عیسوی سے چودھویں صدی تک کا زمانہ خیال کیا جاتا ہے۔ ایک ماہر رقم طراز ہے کہ اہرام مصری سے بدرجہا زیادہ صنعت و محنت اس مندر کی تعمیر اور ساخت میں صرف ہوئی ہے

شمیم

غزل

الٰہی دیکھیے کیا ہو جنون فتنہ ساماں سے
دل دیوانہ کو اک گونہ وحشت ہے بیاباں سے

چمن میں فصل گل شاید طرازِ خانۂ گل ہے
ٹپکتی ہے جو وحشت سی در و دیوارِ زنداں سے

فنا ہیں کچھ تو کھنچ جائیں الٰہی منزلِ غم کی
چلا ہے کاروان دل بڑی حسرت سے ارماں سے

شبِ فرقت سہارا ہے یہی تسکینِ خاطر کا
اُلجھتا ہے دل دیوانہ کیوں تصویرِ جاناں سے

خیال مرگ گر وجہِ سکون قلب مضطر ہو
تو ممکن ہے فرشتہ ہو سکے انسان انساں سے

ہر اک تصویرِ قدرت جب نشاں ہو حسنِ معنی کا
لگائے دل بشر پھر کیوں الٰہی بزمِ امکاں سے

خرام نازکا انداز مستی کوئی کیا جانے
یہ نظارہ کوئی پوچھے ہماری چشم حیراں سے

دعائے مرگ خود وردِ زباں ہے مرنے والے کے
توقع گر کوئی ہو بھی تو ہے بے سود درماں سے

ملا تھا دل کہ ہو رسوائے مستی اک زمانہ میں
وگرنہ طور کو نسبت ہی کیا موسیٰ عمراں سے

غرور بیگناہی خود خطا کاری ہے اے زاہد
مرے کام آگیا محشر میں ڈرنا جرمِ عصیاں سے

سنا تو دوں اُنھیں بھی ماجرائے غم مگر پھر کیا
وہ مطلب بھی نکالیں کچھ مرے خوابِ پریشاں سے

خیال ترکِ دُنیا ہے غفور اک سعی لاحاصل
بنا ہے عالمِ ایجاد ہے تصویرِ انساں سے

عبد الغفور خاں بی اے بی اے ایل ایل بی (علیگ)

اکبر
اور
بندوبست اراضی

اکبر کی فتوحات ہم لوگوں کے لیے ایک افسانہ ہیں۔ دین الٰہی صرف ایک مورخ کو متوجہ کر سکتا ہے۔ فتحپور اور آگرہ کی عمارات صرف ایک سیاح یا ماہر فن کے نزدیک قابل قدر ہیں مگر ہماری موجودہ زندگی پر ان کا کوئی خاص اثر نہیں۔ ممکن ہے کہ کوئی فلسفی انکو پڑھ کر یا دیکھ کر بے ثباتیِ عالم پر غور کرے لیکن روزمرہ کی زندگی سے انکو کوئی تعلق نہیں۔ غالباً سب سے اہم کام جو اس غیر معمولی انسان (اکبر) نے انجام دیا وہ نظام ملکی تھا۔ موجودہ برٹش انڈیا میں زمیندار یا رعیت سے لگان وصول کرنے کا طریقہ کم وبیش وہی ہے جو سولھویں صدی عیسوی میں تھا۔ میں اس مضمون میں اکبر کا رعیت سے لگان وصول کرنے کا طریقہ بیان کروں گا۔ نیز وہ ترمیمیں جو اُس نے پٹھان بادشاہوں کے طرز عمل میں کیں ذکر کروں گا۔ اکبر ہمایوں کی وفات کے وقت صرف تیرہ برس کا تھا۔ کبوتر اُڑانے اور گھوڑے دوڑانے کے سوا اس کو کچھ نہ آتا تھا۔ زمام سلطنت اول چار سال (۱۵۵۶ء - ۶۰) بیرم خاں کے ہاتھ میں رہی۔ خان کی معزولی کے بعد چار سال تک (۱۵۶۰ - ۶۴) ماہم انگہ حمیدہ بانو اور دیگر خاتونان حرم ریاست کی مالک تھیں۔ بادشاہ (ابوالفضل کے الفاظ میں) پس پردہ رہا۔

اس زمانہ میں فوج کے سرداروں کو خوش کرنے کے لیے ممالک مفتوحہ کا بیشتر حصہ بطور جاگیر دیدیا گیا۔ معمولی حالت میں اکثر حصہ خالصہ رکھا جاتا تھا جس کی آمدنی براہ راست خزانہ میں آتی اور شاہی صرف میں خرچ ہوتی رہتی تھی۔ بادشاہ کی ذاتی آمدنی کی کمی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ خان خاناں کی اتالیقی کے زمانہ میں اکبر نے کچھ روپیہ طلب کیا مگر خزانچی نے انکار کیا کہ اسوقت فراہم نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ بیس سے زیادہ پنجہزاری اُس زمانہ میں اتالیق کے دسترخوان پر حاضر رہتے تھے۔ چنانچہ اکبر نے کاروبار سلطنت ہاتھ میں لینے پر ۱۵۶۵ء میں مظفر خاں تربتی کو مالی ابتری درست کرنے کے لیے مقرر کیا۔ مظفر نے

زمین خالصہ بڑھانے کی کوشش کی۔ تین سال بعد شہاب الدین خاں مظفر کی جگہ مقرر ہوا۔ آئین اکبری سے معلوم ہوتا ہے کہ شہاب الدین کو سخت مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس لیے کہ "کارپرداران دولت" جو دیانتدار ہوں اور غبن نہ کرتے ہوں، کم تھے۔ پہلے دستور تھا کہ فصل شاہی کارندے جاکر خواہ بوئے ہوئے کھیت کا ایک حصہ تقسیم کر لیتے یا تخمینی قیمت شاہی حصہ کی لیتے یا کھیت کٹنے پر غلہ یا پولیاں بٹوا لیتے۔ ابوالفضل اس طریقہ کو "غلہ بخشی" لکھتے ہیں۔ ہندوستان میں یہ طریقہ زمانہ قدیم سے رائج تھا۔ غلام، خلجی، تغلق، سید، لودی بادشاہوں کے زمانہ میں بھی لگان وصول کرنے کا یہی طریقہ جاری رہا۔ اس میں چند خرابیاں تھیں۔ اول یہ کہ سلطنت کی آمدنی غیر مستقل تھی کیونکہ یہ بات کاشتکار کے اختیار میں تھی کہ ایک مخصوص سال میں وہ کتنی زمین کاشت کرے۔ نیز سرکاری عاملوں کو درمیان میں غبن کرنے کا بہت موقع رہتا تھا۔ کون جان سکتا تھا کہ تحصیل سنبھل میں راجو نے بیس بگھہ زمین کاشت کی اور سات من بگھہ پیداوار ہوئی! بیشتر یہ اختیار عاملوں کے ہاتھ میں رہتا تھا کہ وہ کس قدر وصول کریں۔ رعیت کو شاہی لگان کے علاوہ خواہ مخواہ اُنکو بہت کچھ دینا پڑتا تھا۔ یہ خیال رکھنا چاہیے کہ یہ زمین خالصہ کی حالت تھی۔ جس جگہ حکومت کو زمینداروں سے بطور خراج یا مالگذاری معین رقم ملتی تھی اُس کا ذکر نہیں۔

غرض شہاب الدین خاں نے گذشتہ سالوں کے حساب سے مختلف جگہوں پر پیداوار و نرخ کا تعین کرکے شاہی لگان مقرر کر دیا۔ جو کل پیداوار کے ایک ثلث کی قیمت تھی۔ اگرچہ غلہ کا نرخ بہت ارزاں ہوتا تو رعیت کی آسانی کے لیے لگان سکہ کے بدلے جنس کی شکل میں ادا کیا جا سکتا تھا۔

۷۸ھ-۱۵۷۱ء میں مظفر خاں تربتی جو پہلے ۷۱ھ-۱۵۶۴ء میں مقرر کیا گیا تھا ٹوڈرمل کے ساتھ دوبارہ مقرر ہوا۔ شہاب الدین و مظفر خاں کے پہلے انتظام اکثر (جیسا کہ بعد کی تحقیق سے معلوم ہوا) صرف اندازہ پر مبنی تھے۔ ہر گاؤں میں پہلے آبائی قانون گو ہوتے تھے۔ انکے پاس گاؤں کے مزروعہ کھیتوں کی تفصیل اور مختلف سالوں کی پیداوار و نرخ کی یادداشت رہتی تھی۔ اول ان لوگوں سے مظفر اور شہاب الدین نے ضروری مدد نہ لی۔ ۷۸ھ ۱۵۷۱ء میں مقامی قانونگو سرکاری نوکر رکھ لیے گئے انکی رپورٹیں دس اور اعلیٰ قانون گویوں کے پاس آتیں جو مظفر خاں اور ٹوڈرمل کے زیر نگرانی کام کرتے تھے۔ اس طرح جو کمی شہاب الدین کے بندوبست میں رہ گئی تھی

پوری ہوگئی۔ ۷۶-۱۵۷۵ء میں تمام ملک (بنگال، بہار، گجرات علیحدہ کرکے) تا ہم پرگنہ اور سرکار کے بجائے حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ جن میں سے ہر قطعۂ زمین ایک کروڑ دام[ع] خزانہ کو دے سکتا۔ ان حصوں کو پیغمبروں کے ناموں سے موسوم کیا گیا۔ ایک کو شیث پور دوسرے کو ابراہیم پور وغیرہ وغیرہ کہتے تھے۔ اور حاکم مال کروڑی کہلاتا تھا۔ لیکن ملا عبدالقادر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ انتظام کامیاب نہ ہوا۔ ابوالفضل اسکی کامیابی اور ناکامیابی کے متعلق خاموش ہے۔ مگر جہاں صوبوں، پرگنوں اور محالوں کا بیان ہے کہیں کروڑیوں کا ذکر نہیں۔ حال کے محققوں کا خیال ہے کہ بدایونی کا بیان صحیح ہے۔ کروڑی انتظام ضرور رائج کیا گیا مگر کامیاب ثابت نہیں ہوا۔

اب ان مختلف کوششوں کے بعد جس طرح ہندوستان میں حکومتِ اکبری کے آخری بیس پچیس سال میں بندوبست اراضی رہا بیان کیا جائے گا۔ آئین اکبری کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۵۶۰ء سے بیشتر حصہ سلطنت میں بادشاہ کے ملازم براہ راست رعیت سے زمین کا لگان وصول کرتے تھے۔ پٹھان لودی بادشاہ اپنے امرا کو بڑے بڑے قطعات ملک دیا کرتے تھے۔ یہ نائب شاہ یا رئیس رعیت سے روپیہ وصول کرتے اور شاہ وقت سے پیمان رہتا کہ ضرورت کے وقت ایک معقول رقم اور فوج سے حکومت کی مدد کرینگے۔ اکبر کے عہد میں ان امرا سے زمین نکال لی گئی۔ صوبہ دار خزانہ سے براہِ راست تنخواہ پانے لگے۔ رعیت سے روپیہ وصول کرکے خزانہ میں داخل کرنا پڑتا۔

یہاں یہ واضح کرنا ضرور ہے کہ اس زمانہ میں روپیہ وصول کرنے کے مختلف طریقے تھے۔ (۱) غلہ بخش (۲) ضبطی (۳) نسخ۔

(۱) غلہ بخش۔ جیسا کہ مظفر خاں اور شہاب الدین کی ابتدائی کوششوں کے سلسلہ میں بیان کیا جا چکا ہے اس طریقے کے مطابق کاشتکار سے لگان کے عوض کھیت کی پیداوار کا ایک ثلث لیا جاتا تھا۔ بالعموم یہ قاعدہ ان صوبوں میں رائج تھا جہاں تسلط اچھی طرح نہیں ہوا تھا یا زمین غیر زرخیز تھی۔ مثلاً کابل، کشمیر، جنوبی سندھ، ٹھٹھہ، قندھار۔ وہ حصے جو "نیروشے ضبطی نداشت" کے مصداق تھے۔ اور دوسرے صوبے جہاں ضبطی کا رواج تھا مگر کہیں کہیں زمین بنجر تھی وہاں بھی یہ طریقہ عمل میں آتا تھا۔

ع چالیس دام ایک روپیہ کے برابر ہوتے تھے۔ ع دیکھو ابوالفضل۔

(۲) ضبطی - یہ خاص اکبر کی ایجاد تھی - جہاں اس طریقہ کا رواج تھا اول زمین کی پیمائش ہوتی - بعد کو پیمائش شدہ زمین کی تقسیم چار قسموں میں کی جاتی - (الف) پولج - وہ زمین جس میں ہر سال کاشت کی جاتی ہو اور بہترین فصل پیدا کی جا سکتی ہو - (ب) پراوٹی - جس کو سال دو سال زرخیزی حاصل کرنے کے لیے غیر مزروعہ چھوڑنے کی ضرورت ہو (ج) چچّر - وہ زمین جو دو سال سے پانچ سال کے وقفہ تک غیر مزروعہ رہتی تھی (د) بنجر - یعنے قطعی غیر مزروعہ زمین -

زمین کی تقسیم و پیمائش کے بعد مقامی معتبر لوگوں سے معلوم کیا گیا کہ ایک بیگھے میں کتنی جنس پیدا ہوتی ہے - اس مخصوص جنس کا گذشتہ دس سال کا نرخ معلوم کرکے حساب لگایا گیا کہ ایک بیگھہ کی اوسط پیداوار کی قیمت کیا ہے - اس کا ایک ثلث شاہی لگان (روپیہ کی صورت میں) مقرر کر دیا گیا - ہر سال "کارپردازانِ سلطنت" دیوان اعلیٰ کو رپورٹ بھیجتے تھے کہ کس قدر ایک پرگنے میں زمین کاشت ہوئی اور کیا جنس بوئی گئی اور حساب لگاکر روپیہ طلب کر لیا جاتا تھا - ہر زمین کے لیے نرخ مقرر تھے جو عموماً رعیت کو معلوم رہتے اور عامل زیادہ وصول نہ کر سکتے تھے - سلطنت کو یہ فائدہ تھا کہ آمدنی معین آنے لگی - ضبطی کا رواج صوبۂ آگرہ، اودھ، دہلی، مالوہ، لاہور، اجمیر، گجرات میں تھا -

(۳) نسخ[۵] - اسکے متعلق ماہر فن حضرات کی پیہم کوششوں کے باوجود ابھی تک قطعی طور سے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کس قسم کا طریقۂ وصول لگان تھا - ہماری بد قسمتی سے ابوالفضل نے یہ خیال کرکے کہ لوگ عام طور پر اس قاعدہ سے واقف ہیں اس کا ذکر نہایت اجمال سے کیا ہے - لیکن اکثر عبارات سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ کسی درمیانی آدمی کو زمین کا ٹھیکہ دے دیا جاتا تھا اور اس سے مقرر کر لیا جاتا تھا کہ کتنا روپیہ سالانہ اسکو ادا کرنا ہوگا - آئین اکبری میں ایک جگہ عمل گذار کو ہدایت کی گئی ہے کہ "نسخ باکلانتران دہ نہ کند کہ تن آسانی برخیزد و چیرہ دستان ستم پیشہ را نیرو بخشد بلکہ بہ یک یک کاشتکار" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ طریقہ کم و بیش موجودہ زمینداری یا ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ کی ٹھیکہ داری کے طور پر تھا اور بنگال، بہار، گجرات کے کچھ حصوں میں رائج تھا -

نہال الدین احمد بدایونی - متعلم بی اے - الہ آباد یونیورسٹی

---

[۵] مسٹر عبداللہ یوسف علی اور مورلینڈ اپنے مضمون میں جو جرنل ایشیاٹک سوسائٹی جنوری ۱۹۱۶ء میں شائع ہوا ہے نسخ کے متعلق کوئی یقینی رائے قائم کرنے سے معذوری ظاہر کرتے ہیں لله کلانتر گاؤں کے مقدم یا میر دیہ کو کہتے تھے -

اودھ پنچ کے بیجا اعتراضات

مضمون ذیل عرصہ ہوا جب لکھ کر آیا تھا۔ مگر چونکہ کرمی جناب نجو دموہانی کی ایک بسیط تحریر اودھ پنچ کے اعتراضات کے جواب میں چھپ رہی تھی، اسلیے اسے روکنا پڑا۔

اس مضمون میں اگرچہ اُنھیں اعتراضات کے جوابات دیے گئے ہیں اور بعض جوابات بھی یکساں ہیں لیکن اسلوب تحریر بالکل جداگانہ ہے اور جواب میں متعدد نئے پہلو بھی نکالے گئے ہیں اسلیے امید ہے کہ ناظرین کرام لطف اندوز ہوں گے۔ ایڈیٹر

"اودھ پنچ" میں حال ہی میں شوق قدوائی مرحوم کی یہ رائے شایع ہوئی ہے کہ "اودھ پنچ کی شوخی اب عالمانہ ہے رندانہ نہیں" اس رائے کو صحیح سمجھتے ہوے میں نے اس عالمانہ ظرافت کا جواب خشک طالب علمانہ بحث سے دینا چاہا ہے۔ مسئلہ زیر بحث جناب نجو دموہانی ایم اے کا مضمون متعلقہ شرح دیوان غالب ہے جو ازرہِ کے الناظر میں شایع ہوا۔" اودھ پنچ میں کسی ادبار الشعراء والملک نے (اودھ پنچ نے جنوری ۱۹۲۴ء میں جغد الشعراء اور بوم بے دال ایسے ظریفانہ ناموں پہ اعتراض کیا تھا۔ حالانکہ بوم اور جغد ادبار و نحوست کے نشان ہونے کی وجہ ہی سے بدنام ہیں) اس پر کئی قسطوں میں اعتراضات کیے ہیں۔ میں نے فقط ادبار صاحب کی علمی تحقیقات پر حرف گیری کی ہے۔ جہاں اُنکے اعتراضات محض جناب طباطبائی کی صدا ے بازگشت ہیں میں خلط مبحث کے خوف سے خاموش رہا ہوں۔ ایسے مضمون کا بے ربط اور پریشان ہونا لازمی تھا اس لیے میں نے اسے ظاہری صورت بھی ویسی ہی دی ہے۔

۱۔ ادبار صاحب کی طرح میں بھی جناب نجو کی شرح سے متفق نہیں، اور دو اشعار کے علاوہ قریباً ہر ایک شعر کی شرح سے اصولی اور جزئی اختلاف رکھتا ہوں۔ مگر میں اُن سے ایک بات میں متفق ہوں، اور وہ یہ ہے کہ شرحِ غالب میں جناب طباطبائی کا طرز تحریر بہت گستاخانہ ہے۔ اور اُنھوں نے بڑی بڑی فاحش غلطیاں کی ہیں۔ علمی غلطیاں نہیں، حاشا وکلا نہیں ذوق اور وجدان کی غلطیاں، ایک دو نہیں، بیسیوں۔ مجھے جناب ادبار سے ایک شکایت ہے کہ اُنھوں نے جناب نجو سے بعض جگہ سخت ناانصافی برتی ہے۔ مثلاً

(۱) کتابت کی غلطیوں کو بھی اُن کے سر تھوپا ہے۔ حالانکہ خود جناب ادبار کے مضمون میں

ایسی متعدد غلطیاں ہیں

(۲) طباطبائی صاحب کی حمایت کرتے ہوئے بیخود کے اعتراضات کو پورا نقل نہیں کیا۔

پھر (۳) آپ نے انھیں جناب طباطبائی کا چبا کے تھوکا ہوا لقمہ نگلنے والا تو کہہ دیا مگر ع "ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد" کی جو دو جواب تشریح اُنھوں نے کی ہے، اُس کا جناب طباطبائی کی شرح سے موازنہ نہیں کیا۔ اور اُن کے اس اعتراض سے کہ جناب طباطبائی نے محض داد دی ہے اور تشریح کرنے سے جان بچاگئے ہیں، خواہ مخواہ یہ مطلب نکال لیا ہے کہ بیخود کو فقط طباطبائی کے الفاظ پر اعتراض ہے۔

۲ - ("مرزا خود وجد کرتا ہے اور نکتہ سنجوں کو سجدہ ریزی کی تعلیم"....) یہ جناب بیخود کی عبارت ہے۔ آدبار صاحب تنقیص فرماتے ہیں :-

"آگے آئی آیت! اے حضرت .... سجدہ ریخیت فارسی والوں نے بھی نہیں
کہا خواہ وہ ہندی نژاد ہوں یا ایرانی۔ آپ کون"

آدبار صاحب نے غالباً اس بحث پر کسی لغت کو نہیں دیکھا، ورنہ اس بلند آہنگی سے ایسا بے بنیاد دعویٰ کبھی نہ کرتے۔ "بہارِ عجم" میں ہے "سجدہ افشاں۔ سجدہ گاہ۔ سجدہ ریز.... ہرکدام معروف" علامہ سر اقبال لکھتے ہیں ؎

"در دیر تختۂ گل ز جبین سجدہ ریزم
کہ نیازِ من نہ گنجد بدو رکعتِ نمازے"

ناصر علی کہتا ہے ع "جبینِ ہردو عالم بر درِ او سجدہ ریز آمد"۔ خود غالب نے اپنے اُردو دیوان میں لکھا ہے

"تو ہزار جلوہ گر مبارک ہو ریزشِ سجدۂ جبینِ نیاز"

(جو لوگ ہر وقت بقدرِ ہمت شاعر کے کلام میں ذم کا پہلو نکالنے کی فکر میں رہتے ہیں اُنکے لیے "ریزش" ایک نعمت غیر مترقبہ ہے) یہ تو سجدہ ریختن تھا، بیدلؔ کہتے ہیں

بیدل از پیری سراپایم خمِ تسلیم ریخت سروِ ایں گلزار بودم شاخ بیدم کردہ اند

لطف یہ ہے کہ آدبار صاحب نے اپنے مضمون کی چھٹی قسط میں "سجدہ ریزی" کو فارسی محاورہ تسلیم بھی کرلیا ہے۔

۳ - بیخود صاحب نے لکھا ہے ("مرزا کے خیالات و جذبات ....") جناب آدبار کا اعتراض ہے کہ:-

"جذبات" اگر "جذبہ" کی جمع ہے تو لغت میں اسکے دو معنی ہیں: ۱۔ مسافت ۲۔ سوت کی گڈی (؟)

جذبات بمعنی .... تاثرات یا کیفیاتِ وجدانیہ طالب سند ہے۔ اُردو میں یہی لفظ غصہ کے ہم معنی ہے۔ جذبہ کشش کے معنی میں بھی مستعمل نہیں ..... ولولہ اور اُمنگ کے معنی ہرگز نہیں رکھتا .... کیا مصر میں جو سیکالوجی (؟) کی کتابیں ترجمہ ہوئی ہیں اُن میں جذبات کا استعمال ایسے محل پر ہوا ہے؟ ....''

اس کے بعد جناب آدبار نے اصولِ وضعِ اصطلاحات پر ایک طویل بحث کی ہے۔

اہل زباں میں یہ نقص عام طور پر پایا جاتا ہے کہ وہ زبان دانی کے لیے لغت کو نہیں دیکھتے اور محض اپنے محدود محاورے ہی پر قیاس کر لیتے ہیں اور اُسی کو زبان کا معیار ٹھہرا لیتے ہیں، ورنہ کوئی غیر اہل زباں 'زباں داں' یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا کہ اُردو میں جذبہ فقط غصہ کا ہم معنی ہے کشش کے معنی میں بھی مستعمل نہیں۔ غالب کا شعر ہے:

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے		سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

قدیم عربی زبان میں بھی "جذبة" بمعنے کشش مستعمل ہے۔ "اقرب الموارد" میں ہے "وجذبة الانسان تلقی بین الله والشیطان فان لم یجذبه الیه جذبه الشیطان" معلوم نہیں جناب آدبار کو سائیکالوجی کی مصری کتب کی کیا ضرورت محسوس ہوئی جب اسی موضوع پر خود اُردو میں مولانا عبدالماجد کی تصنیف لطیف "فلسفۂ جذبات" موجود ہے۔ اور کتب کی کیا بات ہے "جذبة" شام اور مصر کے عام محاورے میں بمعنی ولولہ، وارفتگی شوق، اور ہیجانِ قلب مستعمل ہے۔ باقی رہا اردو محاورہ اس کے لیے فرہنگِ آصفیہ کی سند کافی ہے۔ دیکھیے وہاں جذبہ کے معنی "جوشِ دل، ولولہ، شوق" وغیرہ لکھے ہیں۔ شیفتہ کہتے ہیں

ایمن ہیں اہلِ جذبہ کہ رہبر ہیں اُنکے ساتھ		سالک کو ہے خیال نشیب و فراز کا

مجھے اسوقت اتفاقاً وہ اشعار یاد آ گئے ہیں جو عموماً ایران کی مشہور مفتی نادی طاہرہ کے نام منسوب کیے جاتے ہیں:

جذبات شوقك الجمت بسلاسل الغم والبلا		ہمہ عاشقانِ شکستہ دل کہ دہند جاں بہ رہِ ولا
اگر آں صنم ز سرِ ستم پئے کُشتنِ من بے گناہ		لقد استقام بسیفه فلقد رضیت بما رضا

۴۔ آدبار صاحب مُصر ہیں کہ غالب کے اس مصرع (کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا) کے معنی ہجو والے غلط بیان کیے ہیں (اصل یہ ہے کہ طباطبائی نے بھی وہی شرح کی ہے) کیونکہ بقول آدبار: "دلی کے محاورے میں (جناب طباطبائی نے اپنی شرح میں یہ ثابت کرنے کی

کوشش بھی کی ہے میر کی طرح غالب دلی کے محاورے کے متبع نہیں تھے) یاروں کا لفظ نفس متکلم پر دلالت کرتا ہے" کیسا صریح مغالطہ ہے! غالب کے ہموطن میر کا شعر ہے

مت کھا فریب عجز عزیزانِ حال کا پنہاں کیے ہیں خاک میں یاروں نے دام یاں

جناب آوبار کو جاننا چاہیے کہ دلی میں "یاروں" نقط یہی معنی نہیں رکھتا، یہ معنی بھی رکھتا ہے۔ اور وہ بھی بقول صاحب فرہنگ آصفیہ "کبھی بے تکلفی کی گفتگو میں"

۵۔ اوبار صاحب لکھتے ہیں "غالب مرحوم کا یہ مصرعہ اہل زباں (؟) نے کبھی پسند نہیں کیا" اور مصرعہ یہ لکھا ہے "حیرانیِ نگاہ تماشا کرے کوئی" جو غالباً دیوان غالب کے کسی مطبوعہ نسخے میں موجود نہیں!!

اسی ضمن میں فارسی محاورات کے ترجمہ کی بحث کی ہے۔ جناب آوبار اسے نوواردِ آغاؤں کی زبان گردانتے ہیں اور اسکے مقابلہ میں "میر۔ سودا۔ انیس۔ آتش کی زبان" پیش کرتے ہیں۔ میر تقی پر جناب آوبار کا بھی عوام کی طرح ایمان بالغیب معلوم ہوتا ہے۔ غالباً آپ نے جناب طباطبائی کے اُن اعتراضات کو ملاحظہ نہیں کیا جو انھوں نے شرح غالب میں میر مرحوم کی زبان پر کیے ہیں۔ خدا جانے ان دلائل کے بعد معتقدینِ طباطبائی میر کی زبان کو کس طرح "ٹکسالی" قرار دے سکتے ہیں۔ آغائی اُردو کا نمونہ کلام میر میں بکثرت ہے۔ اسوقت کلیات پیش نظر نہیں۔ صرف چند نمونے جو کلیات کے چھ دیوانوں میں سے قریباً ایک ہی دیوان سے لیے گئے ہیں، ملاحظہ ہوں۔ دیکھیے غالب میر کا کس قدر متبع تھا:۔

کروگے یاد باتیں تو کہوگے کہ کوئی رفتۂ بسیار گو تھا
شب فروغ بزم کا باعث ہوا تھا حسنِ دوست شمع کا جلوہ غبارِ دیدۂ پروانہ تھا
تم اور ہم سے محبت تمھیں خلاف۔ خلاف ہم اور الفتِ خوب دگر دروغ۔ دروغ
نقاش کیونکہ کھینچ سکا تو شبیہ یار کھینچوں ہوں ایک نازہی اُس کا میں اب تلک
اب دل گرفتگی سے آزار کھینچتے ہیں لیتے ہیں سانس یوں ہم جوں تار کھینچتے ہیں
یہ زمانہ نہیں ایسا کہ کوئی زیست کرے چاہتے ہیں جو بُرا اپنا بھلا کرتے ہیں
تکلیف نہ کر آہ مجھے جنبش لب کی میں صد سخن آغشتہ بخوں زیر زباں ہوں
شاید کہ کام صبح تک اپنا کھنچے نہ میر احوال آج شام سے درہم بہت ہے یاں
مجھے نسبت جو دیتے ہیں شرار و برق و شعلہ سے تسلی کرتے ہیں نا چار شاعر ان شتابوں سے

آزردہ خاطروں سے کیا فائدہ سخن کا　　تم صرف سر کرو گے ہم گریہ سر کریں گے
بلا ہے ایسا طپیدنِ دل کہ صبر اس پر ہے سخت مشکل
دماغ اتنا کہاں رہے گا کہ دست بر دل رہا کرو گے

شبہا بجال سگ میں اک عمر صرف کی ہے　　مت پوچھو اُن نے مجھ سے جو آدمی گری کی
ع - لڑکا ہی تھا نہ قاتل ناکردہ خوں ہنوز - ع - سجدہ اُس آستاں کا کیا پھر وفات کی -
ع - رہی نگفتہ مرے دل میں داستاں میری - ع - عشق ان شہری غزالوں کا جنوں کو اب کھنچا -
اگر ایسے اشعار کی بھرمار کے باوجود میر کی زبان قابلِ تقلید ہے، تو غالب پر حرف گیری کیسے ہو سکتی ہے؟
حقیقت یہ ہے کہ فارسی یا کسی اور زبان کا محاورہ ترجمہ کرنا عیب نہیں ہے اور اردو کی ترقی کا اصل راز یہی ہے کہ انگریزی کی طرح یہ زبان نہایت لچکدار ہے اور خدا کے فضل کی حیرت انگیز صلاحیت رکھتی ہے -

۶- اودھ پنچ صاحب فرماتے ہیں :- "مشہور الفاظ کے استعمال سے پرہیز کرنا بھی مرزا غالب مرحوم کی ایک خصوصیت ہے ابوالفضل بھی اسی راہ کا سالک تھا" معلوم ہوتا ہے کہ حالی کے الفاظ سے غلط معنی اخذ کیے گئے ہیں - حالی لکھتے ہیں " عامیانہ خیالات اور محاورات سے جہاں تک ہو سکتا تھا اجتناب کرتے تھے " ورنہ ابوالفضل کے طرز تحریر سے جس قدر نفرت غالب کو تھی کسی کو کم ہوگی - اور اسی وجہ سے ان کی سرسید احمد خاں سے شکر رنجی بھی ہو گئی تھی -

۷- ایک کتابت کی غلطی کے تذکرہ میں اودھ پنچ صاحب نے کہہ تو دیا کہ "اس دیوان کے پروف خود مصنف نے دیکھے تھے " مگر غالب کا وہ خط نہیں دیکھا جس میں اُس نے کاتب اور سنگساز کی غلط در غلط تحریر کا رونا رویا ہے - جبھی تو شوکت میرٹھی مرحوم کو غالب کے کلام میں تحریف کرنے کی جرأت ہوئی اور جناب اودھ پنچ کو موقع ملا کہ خواہ مخواہ غالب کو "قفسی رنگ" لکھنے پر کوسنا شروع کر دیا - اصل مصرع " قمری کفِ خاکستر و بلبل قفس رنگ " ہے - اور جناب نجم الدین نے اس کی تصریح بھی کر دی ہے - جناب طباطبائی نے بھی اس قسم کے تصرفات سے کام لیا ہے - چنانچہ ع - کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن - کو ع کہنے کی جب رہی .... الخ بنا دیا ہے اور ایک عجیب و غریب تشریح کی ہے - پھر ع ہے نو آموز فنا ہمت دشوار پسند - کو ع اے نو آموز فنا ہمت دشوار پسند - بنا دیا ہے -

۸- دیوان غالب کے افتتاحیہ مطلع کے متعلق مولانا طباطبائی کی تائید کرتے ہوئے

جناب ادیب بڑے دعوے سے لکھتے ہیں: "کاغذی پیراہن فارسی میں فریادی کو استعارۃً کہتے ہیں کوئی تاریخی ثبوت اس رسم و رواج کا نہیں ملتا کہ ایران میں فریادی کے واسطے کاغذ کا جامہ پہننا لازم تھا.... ہاں یہ صحیح ہے کہ ایک فریادی کا اوڑھنا بچھونا دستاویز درخواست، استغاثہ، محضر، شہادت نامہ اور سند ہے.... بہارِ عجم میں بھی کاغذی پیراہن کے ذیل میں یہ فقرہ لکھا ہے (در قدیم رسم بود) مگر برہان قاطع کے مصنف نے اس رسم کا ذکر نہیں کیا (حالانکہ) صاحب برہان قاطع محمد حسین تبریزی مصنف بہار عجم سے پیشتر گذرے ہیں" پھر لکھا ہے:- "اب ہمیں دیکھنا ہے کہ بیخود صاحب "نقش" سے تصویر اور "شوخی تحریر" سے اردو محاورہ میں ہستی کیونکر ثابت کرتے ہیں"۔

یہ تاریخی اعتراض جناب طباطبائی نے غالب کے ایک خط پر کیا تھا جس میں "کاغذی پیرہن" کو ایک رسم بتایا گیا تھا۔ نفس شعر کا اس سے ہرگز ہرگز کوئی تعلق نہیں۔ لیکن خدا جانے جناب ادیب نے "لازم" ہونے کا بارِ ثبوت مدعی پر کیوں ڈال دیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ کاغذی جامہ یا پیراہن محض استعارہ ہی نہیں بلکہ ایک پرانا دستور بھی ہے۔ جس کا ذکر صاحب بہار عجم نے بھی کیا ہے اور اس سند کے خلاف صاحب برہان کا پیشتر ہونا اور تبریزی کہلانا کوئی ایسی برہان قاطع نہیں۔ صاحب برہان تاریخی اور نیز لغت کی تحقیق میں بہت غیر معتبر ہیں اور غالباً انھوں نے خود تبریز دیکھا بھی نہیں تھا۔ ان کی تحقیقات کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:

"غرناطہ" کے متعلق لکھتے ہیں: "ولایتے است از ہندوستان" اور اسے کرناٹک تصور کر لیا ہے۔

"اندلس": "نام شہریست در حدود مغرب و نام جزیرہ ایست بر بالاے کوہ" کیا تحقیق ہے!

"اسکندریہ" کے متعلق لکھا ہے: "شہریست در کنار دریا بسر حد فرنگ"۔

لغت نویسی کی یہ حالت ہے کہ "کنیسہ (گرجا) کو معبد گبراں لکھا ہے۔ اسکے متعلق مصحح برہان کا ریمارک ہے کہ یہ فاش غلطی ہے۔ اور سنیے "چکاک" (تارک سر) کے معنی "ناصیہ" (پیشانی) لکھا ہے۔ پھر اسی کے معنی "قبالہ نویس" لکھا ہے۔ حالانکہ اسے "صکاک" کہتے ہیں۔ پھر لکھا ہے "کسے را گویند کہ در گوہر سوراخ کند"۔ حالانکہ وہ "حکاک" ہوتا ہے۔" برہان قاطع ایسی متعدد غلطیوں سے بھرپور ہے۔ چنانچہ "صاحب فرہنگ ناصری" نے اس پر کافی شرح و بسط سے لکھا ہے۔ خود جناب طباطبائی سے اس مختصر سی شرح میں ایسی ہی دو ایک فروگذاشتیں ہوئی

ہیں۔ مثلاً ع لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا۔ اسکی شرح میں لکھتے ہیں:-
"دستور ہے کہ کسی کے رعب کے اظہار کرنے کے لیے جو مرعوب ہو جاتا ہے وہ
وہ اپنے دانتوں میں گھانس پھونس اٹھا کر دبا لیتا ہے"
کس قدر مبہم تشریح ہے۔ فارسی میں بھی خس بدنداں گرفتن کا محاورہ موجود ہے۔ اگر ایرانی لکھتے
ہیں کہ یہ محاورہ ہندی الاصل ہے کہ وہاں یہ دستور پایا جاتا ہے۔ اور اسکی توجیہ یہ ہے کہ ہندوستان
میں گائے کو مقدس سمجھا جاتا ہے اس لیے جو شخص شکست کھا کر گر پڑتا ہے وہ دانتوں میں
گھانس کے تنکے لے لیتا ہے گویا وہ گئو ہے اور اس لیے فاتح حریف بھی اُسے قتل کرنے سے
باز رہتا ہے!! یہ توجیہ تاریخی حیثیت سے غیر موثق ہی کیوں نہ ہو، لیکن یہ طباطبائی صاحب کی مہمل
تشریح سے بہرحال زیادہ واضح ہے۔
"کاغذی پیراہن" کے متعلق ایران کا مایۂ ناز محقق اور تذکرہ نویس رضا قلی خاں ہدایت
صاحب "اجمل التواریخ"، "مجمع الفصحا"، فرہنگ "انجمن آرائے ناصری" وغیرہ وغیرہ تفصیل کے ساتھ لکھتا ہے:
"کاغذی جامہ آن است کہ وقتے در شہر سقر رکردہ بودند کہ ہر کہ ظلمے از حکام
جور رود جامہ از کاغذ پوشیدہ و بپائے عَلَمے کہ از جانب پادشاہ در میدان
خاصہ نصب کردہ بودند و آں را "عَلَمِ داد" می نامیدہ، رفتہ تا تحقیق حالش
شدہ رفعِ ظلم ازاں مظلوم بشود"
کاغذیں جامہ اور عَلَمِ داد کے متعلق حافظ کا شعر ہے

کاغذیں جامہ بخوننابہ بشویم کہ فلک رہنمونیم بپائے عَلَمِ داد نہ کرد

غالب نے "پنج آہنگ" میں لکھا ہے کہ "مشعل بکف گرفتن" اور "جامہ سرخ بر سر چوب کردن"
بھی ان ہی معنوں میں مستعمل ہیں۔ غالب کا شعر ہے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

تحریر کے کاغذی جامہ پر کمال اسمٰعیل کا شعر ہے:-

کاغذیں جامہ بپوشید و بدرگاہ درآمد زادۂ خاطر من تا بدہی دادِ مرا

اب ادبار صاحب کے دو اعتراض رہ گئے ہیں۔ "نقش" بمعنے تصویر نہیں ہوتا اور "شوخیِ تحریر"
سے ہستی (ہستی نہیں بلکہ آفریدن۔ ہست کردن مراد ہے) مراد نہیں لی جا سکتی۔ اگر یہ دو
مشکلات حل ہو جائیں تو غالب کا شعر مہمل نہیں رہتا۔
ہمارے عجم میں "نقش" کے اولین معنی "صورت" لکھے ہیں۔ غالب کا ایک اور شعر ہے:

نقشِ نازِ بتِ طناز بہ آغوشِ رقیب پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے

["نقش" اور "تصویر" میں مصور ایک اصطلاحی فرق بتاتے ہیں۔ وہ نقش کو ڈیزائن کا مرادف قرار دیتے ہیں یا اُن تصاویر کا جو چپٹی ہوتی ہیں]

"نقاش" (نقش ساز۔ نقش بند۔ نقش پرداز) کے معنی تصویر بنانے والے ہر لغت میں دیکھ لیجئے۔ میر تقی کا یہ شعر پہلے بھی لکھا جا چکا ہے: نقاش کیونکہ کھینچ سکا تو شبیہ یار ...... الخ

اور نقشبندِ حوادث" "نقاشِ ازل" اور "نقشبندِ ازل" خدائے تعالیٰ کے معروف کنایات ہیں۔ باقی رہا "شوخیِ تحریر" کا جھگڑا۔ سو ظاہر ہے کہ تحریر سے مراد تحریرِ نقش ہے۔ تحریرِ نقش یا تصویر کو تخلیق سے جو مناسبت ہے وہ ظاہر ہے۔" تحریرِ نقش کی سند کے لیے بہارِ عجم سے ایک شعر نقل کرتا ہوں۔ محتشم کاشی

تا خلعت یافتہ تحریرِ رخِ سادہ رخاں پیشِ رخسارِ تو نقشے ست کہ بے تحریر است

اردو اور فارسی کیا، انگریزی میں بھی یہی کنایہ ہے۔ آجکل آرٹسٹ کا لفظ شاعروں، مصوروں، اور فنونِ جمیلہ کے جملہ ماہروں کے لیے مستعمل ہے۔ اردو میں صنّاع یا صانع کا لفظ اسکا صحیح مترادف ہے۔ چنانچہ میر تقی لکھتے ہیں:

صنّاع ہیں سب خوار ازاں جملہ ہوں میں بھی ہے عیب بڑا اُس میں جسے کچھ ہنر آوے

قدیم انگریزی میں اسکے معنی خالق تھے جس طرح آجکل اردو میں صانع سے خالقِ کائنات مراد لی جاتی ہے

نقشے تو بہت صانعِ قدرت نے بنائے پر بن نہ سکا پھر دہن ایسا کمر ایسی

ہر زبان میں آرٹ کو تخلیق سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ شعرا کا خطاب "خلاق المعانی" تجویز ہوتا ہے۔ غالب کا کنایہ بہت بلیغ ہے اور اُسکی جڑیں زبان کی تہوں تک پہونچی ہوئی ہیں۔ یہ محض نظریات ہی نہیں۔ "بہارِ عجم" میں "نقش افتادن" کو ایک علیحدہ لغت قرار دیا گیا ہے اور اسکے معنی ہیں "آفریدہ شدن (پیدا کیا جانا)۔ مصور گردیدن"۔ اور "نقش بستن" کے متعلق برہان میں "کنایہ از آفریدن۔ تخیل نمودن، تصویر کردن" آیا ہے۔ غرض شرح خواہ وہ بیخود کی ہو یا طباطبائی کی مہمل ہو سکتی ہے مگر غالب کا یہ شعر ہرگز مہمل قرار نہیں دیا جا سکتا۔

۹۔ ادیار صاحب غالب کے اس مصرعہ پر (حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزو خرامی) اعتراض کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "..... (ایسی) ترکیبیں فارسی کے دیوان میں نہیں ہیں"

عنایت صرف اُردو پر مبذول رہی "۔

میں دوبارہ جناب آدبار کی توجہ میر تقی کے اُن اشعار کی طرف دلاتا ہوں جو شق (۵) میں درج ہوئے ہیں۔ اور اگر فارسی میں ترکیب سازی کا تماشا دیکھنا ہو تو غالب کیا، بیدل اور ظہوری اور ناصر علی اور اہل زبان عرفی شیرازی کا کلام (خصوصاً مثنوی) ملاحظہ فرمائیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُنھیں بھی جناب طباطبائی کی طرح دھوکا ہوا ہے اور اُنھوں نے بھی "آرزو خرامی" سے ؟ کی مراد خرام سبب آرزو" سمجھی ہے۔ طباطبائی صاحب اپنی شرح میں اس قسم کی غلطیوں کے ایک آدھ دفعہ ہی مرتکب ہوئے ہیں۔ مثلاً

حباب موجۂ رفتار ہے نقش قدم میرا		نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا

اس شعر کی شرح میں فرماتے ہیں "یک بیاباں ماندگی کہو یا صد بیاباں ماندگی مراد ایک ہی ہے۔ اگر یہ ترکیب یوں ہی ہوتی جیسا کہ طباطبائی صاحب نے سمجھا ہے تو صد بیاباں ماندگی کہنا بہتر ہوتا۔ مگر یہ ترکیب یوں نہیں۔" ماندگی " سے "بیاباں" کا کوئی ترکیبی تعلق نہیں۔ وضاحت کے لیے مصرعۂ اول کی نثر کیے دیتا ہوں۔ غالب کہتے ہیں کہ " ماندگی سے میرا ذوق (دشت نوردی) ایک بیاباں (بھر بھی) کم نہ ہوگا"۔

مجھے اس مضمون میں جناب طباطبائی کی شرح غالب کی غلطیاں دکھانا منظور نہیں۔ کیونکہ (جیسے ابوالمعانی مرزا یاس عظیم آبادی لکھنوی (؟) غالب کی بدمذاقیوں (!) کے متعلق تحریر فرمایا کرتے تھے) اس کے لیئے ایک مستقل کتاب چاہیئے۔ یہ ذکر ایک ترکیب کو غلط سمجھنے کے ضمن میں آگیا تھا اور بس۔ خیر۔ یار زندہ صحبت باقی کبھی اسکے متعلق تفصیلی طور پر لکھوں گا۔

۱۰ — (ع۔ جی کس قدر افسردگیِ دل پہ جلا ہے) - غالب کے اس مصرع پر جناب طباطبائی ایراد فرماتے ہیں کہ " جی جلنا" محاورے میں ناگوار ہونے کے معنی پر ہے۔ یہاں یہ معنی مقصود نہیں بلکہ " جی کڑھنا" مقصود ہے۔ آدبار صاحب نے ایک غیر ذمہ دار ناقد کی طرح جناب نجود کا پورا جواب نقل نہیں کیا اور نہ یہ سند نقل کی ہے (اور نہ اُس کا جواب دیا ہے) جو اُنھوں نے میر کے کلام سے "جی کڑھنے" کے معنوں پر درج کی ہے

گویا یہ ہے چراغ غریباں کی گور کا		بیکس کوئی مرے تو جلے اسپہ دل مرا

غالب محاورے کے ہر پہلو سے پوری طرح واقف تھے۔ ایک اور جگہ لکھتے ہیں

ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتشبار ہے		جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں

مگر طباطبائی صاحب نے اپنے محدود روزمرہ پر قیاس کرتے ہوئے اُردو کے محاورے کی وسعت کو نظرانداز کر دیا اور خواہ مخواہ غالب پر ایک اعتراض وارد کر دیا۔

"افسردگی" کے متعلق جناب آوبار فرماتے ہیں کہ اس کا ترجمہ "بجھنا" مشہور ہے۔ شعلہ ہو یا چراغ یا آگ .... پست ہمتی یا بے دلی اس کا ترجمہ نہیں .... ہم نے نہ کتب لغت میں ... اور نہ کتب اخلاق میں (یوں) دیکھا ہے"

جناب اودھ پنچ ہر بار کتب لغت کا ڈراوا دیتے رہتے ہیں مگر ہر بار تحقیق فرمانے میں کوتاہی برتتے ہیں۔ افسردگی سے مراد "بجھنا" مسلّم (علامہ سر اقبال کا مصرعہ ہے ع کیا لطف زندگی کا جب دل ہی بجھ گیا ہو") مگر اس سے یہ کیسے لازم آیا کہ "افسردگیٔ دل" سے فقط "اسکا شعلۂ عشق سے خالی ہونا مراد ہے"۔ دل میں ہر قسم کے احساسات کی آگ ہوتی ہے اور اہل دل کے نزدیک اس آگ کے جلتا رہنے سے ہی دل کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے۔ پست ہمتی، بددلی اور مردہ دلی سے اسی مطلب کی توضیح ہوتی ہے۔ مشہور مصرعہ ہے ع افسردہ دل افسردہ کُند انجمنے را۔ اس میں عشق کی کیا تخصیص ہے۔ اسی طرح صبا کا شعر ہے

آنکھیں صبا پُرآب ہیں اُس نور کے لیے افسردہ دل ہیں آتش منفور کے لیے

یہاں بھی افسردگی سے "غمگینی" مراد ہے۔ غالب کا شعر ہے

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرم تماشا ہو کہ چشم تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

شیفتہ:

تمھاری بزم میں افسردہ ہیں نہ بیٹھونگا نسیم باغ میں چالاک ہے صبا گستاخ

"افسردہ دل" کے معنی "فرہنگ آصفیہ" میں "مُردہ دل" بھی لکھے ہیں۔ افسردن کے لغوی معنی ہیں "سرد شدن" اور "یخ بستن" کے۔ مولوی معنوی:

کاہ نبود آں کہ باد دے پرید آب نبود آں کہ سرما فسرد

فارسی کی مستند ترین لغت "فرہنگ ناصری" میں "افسرد" کے تحت میں "دل سرد شدن نیز آمد" لکھا ہے۔ اور مجازاً تو کئی معانی نکلتے ہیں۔ بیدل فرماتے ہیں: ع فسرد گہہاے ساز امکاں ترانہ ام را عناں نہ گیرد۔

ناز آنکہ اوج ہاں گرد شکست آرزوست ہر قدر افسردہ گرد و رنگ بےدل ساماں تراست

تا لب افسردۂ ما در غبار وہم سوخت غرقۂ بحرے کہ ما بودیم ساحل بودہ است

دیکھیے اساتذہ اور اہل لغت نے کس قدر وسعت سے کام لیا ہے اور آپ زبان کو کس قدر تنگ کرنا چاہتے ہیں!

اسی شعر کے تحت میں جناب آدبار لفظ "وحشت" کے معانی بیان کرتے ہیں: "اے حضرت وحشت کے معنی غم - ڈر - تنہائی وغیرہ ہیں" جناب طبا طبائی فرماتے ہیں: "لفظ وحشت اس شعر میں مصنف نے ذوق وشوق کی جگہ باندھا ہے اور اصل میں وحشت و نفرت کے معنے قریب قریب ہیں وہ یہاں نہیں بنتے" فاضل نقاد خود "وحشت" کے معانی کے متعلق خیالات رکھتے ہیں - دونوں اُردو کو ایک تنگ دائرہ میں محدود کرنا چاہتے ہیں اور دونوں اپنے اپنے محاورے پر قیاس کرتے ہوئے غالب ایسے قادر الکلام پر ناواقفی کا الزام رکھتے ہیں - افسوس ہے کہ تحقیق معانی کے متعلق بہت لاپروائی برتی جاتی ہے اور خود لغت نویس لغوی معانی اور کنایات میں تفریق نہیں کرتے - اس عالمگیر اصولی غلطی کا سب سے پہلے غالب ہی نے رد کیا تھا اور بڑے بڑے مستند بُت توڑے تھے اور اس جُرم میں پتھر بھی کھائے تھے "وحشت" ہی کا لفظ لیجیے - "بہار عجم" میں اسکے معنی "رمیدن" بھی لکھے ہیں - اُردو میں اس لفظ کا استعمال کئی طرح ہوا ہے۔ اور عام محاورے میں اس سے مراد ایک سودا اور جنون کی سی پریشانی حواس کی حالت ہے جس کا مظہر وحشی جانوروں کی سی نفرت ہے اور اس نفرت کا نتیجہ رمیدگی ہوتا ہے!! پریشانیِ حواس اور فراوانیِ جذباتِ عشق کے معنی میں شعرا نے کثرت سے استعمال کیا ہے۔ آتش کے اس شعر سے یہ مطلب واضح ہو جاتا ہے۔

جوشِ وحشت ہی ہے قطع تعلق مقراض　　سگِ دیوانہ کو پابند نہ دیکھا در کا

دیکھیے "وحشت" "قطع تعلق" (تنہائی کا ذریعہ ہے) اور دیوانگی سگ اسکی مماثل ہے - غالب کہتا ہے

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی　　میری وحشت تری شہرت ہی سہی

شیفتہ: جوش وحشت میں ملے پر یہ ید　　بس تیرا ہی نام دم کریں گے

آفریں طغیان وحشت مرحبا جوش جنوں

اہل وحشت کو مری شورش سے لازم ہے حذر　　میں وہ مجنوں ہوں کہ مجنوں کے مقابل ہوگیا

ہوش تو دیکھو کہ سُن کر میری وحشت کی خبر　　چھوڑ کر دیوانہ پن کو قیس عاقل ہوگیا

غالب ایسے اساتذہ کے کلام پر ایراد کرنے سے پہلے اپنی استعداد علمی اور وسعت نظر

کا جائزہ کر لینا چاہیے - ورنہ یوں تو ہر کوئی ہر کسی پر اعتراض کر سکتا ہے

چو بشنوی سخنِ اہلِ دل مگو کہ خطاست
سخن شناس نۂ دلبرا خطا اینجاست

فقیر محسن تاثیر ایم اے

از لاہور

غزل

ایک مجبورِ قفس، محو ہے ارمانوں میں
کہہ دیا کس نے؟ بہار آئی گلستانوں میں

خارزارِ غم و حرماں سے نہ گھبرائے دل
منزلیں عشق کی طے کر انھی میدانوں میں

تم ہی تنہا نہیں، بیہوشِ تجلی ہوئے
جبلِ طور بھی ہے سوختہ سامانوں میں

تیرے دیوانے بھی ہیں منتظرِ فصلِ بہار
ہاتھ ڈالے ہوئے بیٹھے ہیں گریبانوں میں

یاد آ جاتی ہے اجڑی ہوئی دنیا دل کی
درسِ عبرت کبھی پاتا ہوں جو ویرانوں میں

اقتضائے تپشِ عشق کی شعلہ ریزی
شمع نے آگ لگا رکھی ہے پروانوں میں

میری فردوس نگاہی بھی ہے تزئینِ جنون
کہ گلستاں ہی گلستاں ہیں بیابانوں میں

رتبۂ اہلِ جنوں، عقل گرفتہ دیکھیں
عالمِ قدس نظر آتا ہے زندانوں میں

ذکرِ آوارگیِ قیس و آلِ فرہاد
کس لیے آپ پڑھا کرتے ہیں افسانوں میں

ہیں قدح خوار ترے مستِ الستے ساقی
مئے وحدت ہے چھلکتے ہوئے پیمانوں میں

یہی کل تک تھے تری بزم کی رونق کا سبب
اہلِ دل جن کا شمار آج ہے دیوانوں میں

نہ ہوا سیلِ حوادث سے مراد امن تم
دل کو مضبوط رکھا دہر کے طوفانوں میں

مطمئن ہوں کہ امانت کی طرح ہیں محفوظ
میرے دل کی خلشیں آپ کے پیکانوں میں

آستاں بوسِ حقیقت ہیں نگاہیں میری
نظر آتا ہے خدا مجھ کو صنم خانوں میں

آپ، اور شیوۂ اصنام پرستی ارشد
خیریت ہے کہ داخل ہیں مسلمانوں میں

ارشد تھانوی

جاپان

اور اسکا

تعلیمی نظم و نسق

کچھ عرصہ ہوا سرکار نظام دکن نے سید راس مسعود صاحب ناظم تعلیمات حیدرآباد دکن کو جاپان اس غرض سے بھیجا تھا کہ وہ وہاں جاکر اُس ملک کے نظام و سررشتۂ تعلیم کا بغور مطالعہ کریں اور اس سے پوری واقفیت حاصل کرکے واپس آئیں تاکہ اُنکے تجربوں سے حکومت اور رعیت فائدہ اٹھا سکے - سید راس مسعود صاحب نے جاپان جاکر اس مسئلہ کے مطالعہ میں سرگرمی سے اپنا وقت صرف کیا - بلکہ وہاں کے محکمۂ تعلیم میں کئی مہینے خود کام کیا اور سررشتۂ تعلیم کی تمام باتوں سے پوری واقفیت حاصل کی - آپ نے اپنی ان تمام معلومات کو ایک کتاب کی شکل میں شایع کیا ہے جو تقریباً ۲۵ ابواب پر مشتمل ہے - اس کا حجم تقریباً ۵۰۰ صفحے ہے - لکھائی چھپائی اچھی ہے اور کتاب کا تمام مسالا کافی محنت اور کوشش سے ترتیب دیا گیا ہے - گو کہ کتاب کے نام اور عنوان سے شبہ ہوتا ہو کہ یہ تصنیف صرف تعلیمی نظم و نسق اور تعلیمی مباحث سے سروکار رکھتی ہوگی، تاہم اصلیت یہ ہے کہ صاحب تصنیف نے کوشش اس امر کی کی ہے کہ جاپان کی گذشتہ تاریخ - اسکے عروج و اقبال کا فسانہ - ملک کے آئین و دستور - حکومت اور قوم کے خصائل و آداب - ان سب کی کیفیت حتی الوسع اس میں قلمبند کی جائے - اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ قابل مصنف کو اس میں کامیابی نہیں ہوئی - سچ تو یہ ہے کہ جہاں تک ایسے لوگوں کا تعلق ہے کہ جنکو تعلیم سے خاص دلچسپی نہیں اُن کے لیے صرف شروع ہی کے ابواب باعث دلچسپی ہو سکتے ہیں - نصف سے زیادہ حصہ اس کتاب کا جاپان کی گذشتہ تاریخ، قوم کے مذہب و خصائل، دستور حکومت کی خصوصیات اور دور جدید کے کارناموں سے معمور ہے اور واقعی دلچسپ ہے - نصف سے کم اور آخری حصہ میں وہاں کے تعلیمی نظم و نسق سے بحث کی گئی ہے اور وہاں کے محکمہ سررشتۂ تعلیم کے تمام قواعد و ضوابط مدارج و نصاب تعلیم وغیرہ کا مفصل و مشرح حال درج کیا گیا ہے - حتیٰ کہ قابل مصنف کی باریک بین نظر نے اُستادوں اور عملہ والوں کی تنخواہوں - نصاب تعلیم کی کتابوں کے ابواب اور سبقوں اور

تعلیم کے گھنٹوں کے طول طویل اور غیر دلچسپ نقشوں کو بھی نہیں چھوڑا ہے اور کئی ابواب انہیں کے اندراج میں صرف کیے گئے ہیں۔ اس لحاظ سے کہ سید راس مسعود صاحب بہ حیثیت ناظم تعلیمات حیدرآباد جاپان تشریف لیگئے تھے اور اپنے ملک کی ضروریات کو خوب سمجھتے ہونگے غالباً ان سب باتوں کا تذکرہ بجا اور برمحل سمجھا جاوے تاہم معمولی ناظرین کے نقطۂ نظر سے یہ حصہ کتاب کا نہ صرف غیر دلچسپ بلکہ مد فاضل ہے۔ بہتر ہوتا کہ قابل مصنف ہم کو یہ سمجھانے کی کوشش کرتے کہ جاپان کا تعلیمی نظم و نسق ہمارے یہاں کے سررشتۂ تعلیم پر بہ حیثیت معیار و اصول تعلیم کس طرح فوقیت رکھتاہے ہم جاپان سے اس بارے میں کیا سبق سیکھ سکتے ہیں۔ ہماری کمزوریوں کے وجوہ و اسباب کیا ہیں اور جاپان کی ترقی اور اُولوالعزمی کا کیا راز ہے۔ سید صاحب نے اس جانب بہت کم توجہ کی ہے اور جہاں کہیں زبان سے کچھ نکل بھی گیا ہے تو وہ محض جملۂ معترضہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ اور ایسے موقعوں پر بھی آپ کی نظر ریاست حیدرآباد کے حدود سے باہر مشکل سے جاتی ہے۔ آخر باب میں آپ نے جو نتایج نکالے ہیں اور سرکار نظام کی توجہ جن باتوں کی جانب دلائی ہے وہ بہت کچھ مفید اور کارآمد ہیں اور بعض ایسے بھی ضرور ہیں کہ جن کا اطلاق نہ صرف حکومت و رعیت حیدرآباد تک محدود ہے بلکہ تمام قوم اور ملک کے لیے قابل لحاظ ہیں۔ مثلاً آپ فرماتے ہیں "کہ مسئلہ ابتدائی تعلیم کے بارے میں میری یہ رائے ہے کہ ......" (صفحہ ۴۷۲ - ۴۷۱) ... غیر مطمئن اور ناراض نہیں رہتے" آپ نے جیسی کہ توقع بھی صنعتی و حرفتی تعلیم اور سائنس کی تعلیم پر بہت کچھ زور دیا ہے۔ مختلف صوبوں میں انگریزی حکومت بھی کچھ کر رہی ہے لیکن اس میں ہمارے یہاں بھی بہت زیادہ توجہ توسیع تعلیم کی جانب دی جا سکتی ہے۔ آخر میں سید راس مسعود صاحب فرماتے ہیں کہ "سب سے زیادہ اہم مسئلہ جو ہم کو درپیش ہے ..... (صفحہ ۴۸۰ - ۴۷۹) .... ہم کسی چیز کو بھی جو ہماری امداد کا ذریعہ ہو سکے نظر انداز نہیں کر سکتے"۔ مثل اور صوبوں کے ہمارے صوبہ میں بھی محکمہ حفظان صحت نے پچھلے چند سال سے اس جانب کچھ توجہ دینی شروع کی ہے اور دیہات میں اس قسم کے لیکچروں کا سلسلہ شروع ہوا ہے۔ لیکن جس جہالت کا ہم کو مقابلہ کرنا ہے اُسکے سامنے یہ کوشش بجائے نفی ہے اور ضرورت اس امر کی ہے کہ ایک جدید تحریک شروع کی جائے جس میں علاوہ حکومت کے احباب قوم خود کافی انہماک اور کوشش بلیغ کا ثبوت دیں۔

چونکہ یہ کتاب بحیثیت رپورٹ کے انگریزی میں ترتیب دی گئی تھی اور اُس کا ترجمہ اس کتاب

کی شکل میں شایع ہوا ہے، عبارت میں سلاست اور روانی جیسی کہ ہونی چاہیے نہیں ہے، ہم یہ ایک ایسا نقص ہے جس سے کتاب کی خوبی اور دلچسپی میں کسی قدر فرق آگیا ہے۔ بہرحال جو کوشش کی گئی ہے وہ ہی کم قابل ستایش نہیں۔ کتاب غالباً صدر دفتر انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن سے مل سکتی ہے۔

کشن پرشاد کول

امنڈ آتا اگر طوفاں بلائے ناگہانی کا
نہ آتا پھر لب ساحل سفینہ زندگانی کا

نظر بھر بھر کے پڑتی ہے تجھی پر اب زمانہ کی
نکھر جانا قیامت ہو گیا رنگِ جوانی کا

ہمیں تڑپا رہا ہے انتظار وعدۂ محشر
یہی دے دے کے اک دن ہے ہماری شادمانی کا

بھیانک رات ہے دریا مہیب اور دور ساحل ہے
تھپیڑوں میں ہے موجوں کے سفینہ زندگانی کا

کشاکش اور پھر وہ بھی کشاکش قیدِ ہستی کی
مقرر ہی نہیں ہے وقت مرگِ ناگہانی کا

عیادت کے لیے تیرا نہ آنا رنج دیتا ہے
خیال آیا تو کب آیا تری نامہربانی کا

ہمیں واقف ہیں ایذائیں اٹھائیں ہر نفس جتنی
بھلا ہو دور میں الفت کے دورِ آسمانی کا

ہمیں آماجگاہِ ناوکِ صد رنج و غم ٹھہرے
ہمیں پر تنگ عرصہ ہو گیا ہے زندگانی کا

کوئی پرسان حال اپنا نظر آتا نہیں اقدس
گلی کوچوں میں ذکرِ خیر ہے اکی جوانی کا

ارمان زندگی جو تجھے ناگوار ہے
کیا دھن کچھ اور تجھ کو دلِ بے قرار ہے

اک داغِ آرزو دلِ مرحوم دے گیا
اس مٹنے والے کی تو یہی یادگار ہے

پرچھائیں پڑ گئی نہ ہو تیرے عتاب کی
بیگانہ وار کیوں نگہِ شرمسار ہے

عہدِ وفا ہو آپ کا یا میری زندگی
دونوں کا طور دیکھیے بے اعتبار ہے

اک آگ سی دہکتی ہے میرے جگر میں آج
مرا ہر اک نفس نفسِ شعلہ بار ہے

بجھتی نہیں شراب تمنا کی تشنگی
سرمستیِ شباب کا کتنا خمار ہے

پیش نظر نہ ہو کہیں تصویر یاس کی
بیتاب کس لیے نگہِ انتظار ہے

دشوار کیا ہے خرمنِ ہستی کا پھونکنا
بجلی تمہارے حسن کی خود بیقرار ہے

ہم زندگی سے روٹھے ہیں وہ ہم سے ہے خفا
کیا بے نیازِ حسن تغافل شعار ہے

پھر وقت رخصت آگیا اقدس کو تیرا یاد
پھر آرزوئے گریہ بے اختیار ہے

اقدس (حیدرآبادی)

سیر انصار

حصۂ دوم

(مولفۂ مولوی سعید صاحب انصاری سابق رفیق دار المصنفین)

نسیم سحر کے فرحت زا جھونکے آنے لگے، سپیدۂ سحر نمایاں ہوگیا۔ جو لوگ محفل میں پہلو بدلکر محو آرام ہو چکے تھے دوبارہ سنبھل کر بیٹھ گئے۔ نیاز مندپروانوں کی تعداد بھی شمع ادب کے گرد سرگرم طواف نظر آنے لگی۔ یعنی مطبع سے سیر انصار کا دوسرا حصہ شایع ہوا اور برخاست شدہ محفل کا رنگ دوبارہ جم گیا۔

دور حاضرہ کی معاشرتی خامیاں دیکھتے ہوئے اس بات کی نہایت ضرورت تھی کہ قرون اولی کی محترم بالذات نفوس قدسیہ کی حیات قابل تقلید سے دلچسپ معاشرتی۔ سیاسی اور مذہبی واقعات ہم لوگوں کی دیسی زبان میں لکھے جائیں تاکہ آجکل کی نئی تعلیم یافتہ جماعت کے لیے شمع ہدایت کا کام دیں۔ اس کمی کا دار المصنفین نے شکریے احساس کیا۔ چنانچہ اس لاجواب کتاب کا پہلا حصہ جس پر مکمل تبصرہ گذشتہ اشاعت میں کیا جا چکا ہے۔ مشہور خلایق ہو چکی ہے۔ زبان کی شیرینی اور ادبی چاشنی جو حصہ اول کی ممتاز نوعیتیں تھیں وہ اس حصہ میں بھی برابر نمایاں ہیں۔ جس ادیبانہ اور انشا پردازانہ طرز اور قادر البیانی سے یہ کتاب لکھی گئی ہے اُس کا اندازہ ناظرین کو اقتباسات سے ہوگا۔ اس کتاب میں انصار کرام کے حالات اور اُن کی تعلیمات کا خلاصہ نہایت دلآویز طریقہ پر اُردو میں لکھنے کی زحمت گوارا کی گئی ہے۔ طرز استدلال نہایت ہی دلچسپ اور دلکش ہے۔ انصاری صاحب مشاق ادیب ہیں۔ قلم پر کافی قدرت ہے۔ وسیع المطالعہ ہونے کے ساتھ ہی دور حاضرہ کی سیاسیات اور مختلف زبانوں سے کما حقہ واقف معلوم ہوتے ہیں۔ شروع سے آخر تک مسلسل اور اس قدر خوشگوار انداز میں حالات لکھے گئے ہیں کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ ادبی حیثیت سے بھی اکثر مقامات قابل توجہ ہیں۔ ہم اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ ناظرین نظر انصاف

خود اس بات کا اندازہ کریں گے کہ جو کچھ ہم نے کہا ہے وہ کوئی عقیدتمندانہ لے، خوشامدانہ طرز، یا محض مفرطانہ تالیف نہیں ہے۔ بلکہ ایک حقیقت ہے۔ اور اظہار حقیقت نہ کرنا میرے عقیدہ میں کس حد تک "کفر" ہے۔

(۱)

اللہ اکبر! یہ کیسا عجیب منظر ہے ..... حاکم عراق، خلافت عظمیٰ کا دست و بازو عہد فاروقی کا ایک مدبر اور معزز افسر اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مسند نبوت کا ایک حاشیہ نشین (حضرت عثمانؓ) کس بے رحمی سے ذلیل و رسوا کیا جاتا ہے۔ ---- جو شخص کل تک جاہ و جلال طبل و علم، خیل و سپاہ، خدم و حشم، تیغ و سنان کا مالک رہ چکا ہے ---- آج بیکسی کے اس انتہائی درجہ پر ہے کہ اس کیلئے خود اسکا ..... سر بھی وبال جان ہو گیا ہے ....
........" (ص ۱۰۹ و ۱۰۸)

(۲)

"........ گلستان سیرت نسیم اخلاق سے شگفتہ ہے ...... خدمت رسولؐ، زہد و اتقا ...... جود و سخا .... شجاعت .... ہر دلعزیزی و بے تعصبی اس زبان و ساعدہ (حضرت قیس بن سعد بن عبادہ) کے گلہائے شگفتہ میں ہیں ...." (ص ۱۳۵)

(۳)

معاذ بن جبل امارت یمن پر نامزد کیے جاتے ہیں حسن سلوک، صدقہ اور جزیہ کے مسائل ذہن نشین کیے جاتے ہیں سفر کے ارادہ سے خدمت نبوی میں باریابی کا شرف حاصل کرتے ہیں..... ہمراہیوں کا مجمع کافی ہے۔ روانگی کا وقت قریب آتا ہے ----
خود حضور سرکار دو عالم مشایعت فرماتے ہیں ---- حضرت معاذ اونٹ پر سوار ہیں ..... لیکن آقائے مدینہ ---- پاپیادہ .... مشایعت میں ہیں ---- وداع کا وقت قریب آتا ہے ---- محبت و شفقت کا اظہار ایک ایک حرف سے ہوتا ہے۔ اس وقت ایک عجیب منظر ہے ---- حضور سرور کائنات اپنے محبوب جاں نثار سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو رہے ہیں .... حضرت معاذ [illegible] زار قطار رو رہے ہیں .... جانتے ہیں کہ یہ آخری ملاقات ہے ...."

(ص ۱۶۴)

(۴)

تاجدارِ مدینہ سے رخصت ہو کر - امیر یمن سفر کا ارادہ کرتا ہے ۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔

سپیدۂ سحر نودار ہوتا ہے ۔۔۔۔۔ خورشیدِ امارت جبیں سے طلوع ہوتا ہے ۔۔۔۔۔ اسلامی جاہ وجلال بشرہ سے نمایاں ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ حضور روحی فداہ کا قاصد کسی دنیاوی فرماں روا کا نائب سلطنت نہیں ہے - ظاہری شان وشوکت سے اُس کا جلوس بالکل خالی ہے ۔۔۔۔۔۔ خدم وحشم ۔۔۔۔ نقیب وچاؤش - خیل وسپاہ ۔۔۔۔۔ غرضکہ کوئی شئے فانی اُس کے قبضہ میں نہیں ہے ۔۔۔۔ تاہم اسلام وایمان کا "دریا" "درخشندہ" نور چہرۂ انور پر رعب وہیبت بنکر چمک رہا ہے ۔۔۔۔۔۔۔ زبان ولب نعرۂ تکبیر بلند کر رہے ہیں ۔۔۔۔۔۔ نسیم ۔۔۔۔۔۔۔ کی خوش آیند بے پایاں موجیں پیام ربانی کو یمنی کانوں میں پہونچا رہی ہیں - دہن مبارک سے تکبیر کی لرزہ بر اندام صدائیں نکل رہی ہیں اور ہیبت حق کا لرزہ کفر وشرک کے اندام پر طاری کرتی ہیں ——— قصر کفر کی سست بنیادیں متزلزل ہو چکی ہیں ——— اور کفرستان یمن ۔۔۔۔۔۔۔ بات کی بات میں نعرۂ توحید سے گونج اُٹھتا ہے " (ص ۱۶۵)

اقتباسات کہاں تک پیش کیے جائیں - ہر ہر صفحہ پر ادبی چاشنی اور فاضل مولانا کی تحقیقات علمی کا بیش بہا نمونہ موجود ہے - یہ کتاب حقیقتاً ادبیات اُردو کے لیے ایک نئے باب کا شاندار اور وسیع افتتاح ہے - اگر فاضل مولانا طبع آیندہ پر اپنی "عربیت" کا ثبوت دُور کر دیں تو کتاب بہت ہی عام فہم ہو جائے گی ——— کتاب کی لکھائی چھپائی نہایت دیدہ زیب - قیمت ۱۲؍ - ملنے کا پتہ :- دار المصنفین اعظمگڈھ -

مشیر احمد علوی کاکوروی (علیگ) متعلم بی اے کلاس

آخری سبق

موسم گرما میں ایک شام کو جبکہ شدت کی اُمس تھی، گرو گوبند سکھوں کا پیشوا تنہا بیٹھا تھا۔ گذشتہ زندگی کے کُل واقعات ایک ایک کرکے اُسکے سامنے آرہے تھے۔ اُس کا لاانتہا ہی سلسلہ ٹوٹنے نہ آتا تھا۔ ایامِ جوانی کی وہ شعاع امید جو آب و تاب و نظر فریبی میں قوس قزح کے دلکش رنگوں کو بھی مات کرتی تھی اُسوقت اُسکی چشمِ تصور کے سامنے تھی۔ یہ امید کسی وقت دلکشی میں ہر رنگ و دیدہ زیب کو شرماتی تھی۔ ایک سیل نور تھا جس کا سلسلہ کبھی منقطع نہ ہوتا تھا۔ آنکھ اُس کے دیکھنے کی تاب نہ لاسکتی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ کم ہوگئی۔ غائب ہوگئی۔ شباب میں اُسکے دل میں یہ شعاع اُمید پیدا ہوئی تھی اُس نے آہستہ آہستہ بہت فروغ حاصل کیا۔ یہاں تک کہ عالم خیال میں اُس نے کل ہندوستان کو محیط و مسخر کرلیا۔ اب صبح پیری میں اس کا کہیں وجود نہ تھا۔ یہ امید بہ تدریج کم ہوتی گئی یہاں تک کہ بالکل نہ رہی۔ وہم و گمان اور یاس و ناامیدی کی شکل میں تبدیل ہوگئی۔ یہ اُمید جو اُسے سنبھالے تھی، جو اُسے عالم جوانی میں قوی بنائے تھی، اب کہیں نظر نہ آتی تھی، اُس کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ گوبند بیٹھا ہوا خیال کرتا تھا "کیا یہ اُمید سراب کی نمود تھی۔ خواب و خیال تھا۔ کاغذی پھول کی خوشبو۔ کیا میری اتنی زندگی بے مصرف رہی۔ کیا اتنے ایام زیست بیکار گذرے۔ شکوک و اوہام سے پریشان وہ اس خیال میں غرق بیٹھا تھا۔ دل اور داغ دونوں افسردہ تھے۔ جسم و جان دونوں خستہ۔ ایک پٹھان آیا اور گرج کر بولا" میں اپنے گھر جاتا ہوں۔ جو گھوڑا تم نے خریدا ہے اُس کی قیمت دے ڈالو" گوبند نے جواب دیا "خاں صاحب، سلام۔ میرے دوست کل میں تمھارے روپیے ادا کردوں گا" پٹھان نے کڑک کر کہا" نہیں نہیں۔ آج ہی دے ڈالو" اُس نے گوبند کا ہاتھ پکڑ لیا، بُرا بھلا کہا، طعنہ زنی کی، چور بنایا۔

گوبند کے خون میں جوش آیا۔ اُس نے میان سے تلوار کھینچ لی اور چشم زدن میں پٹھان کا سر تن سے کٹ کر زمین پر گر پڑا۔ خون کے فوارے جاری ہوگئے۔ گوبند لڑکھڑایا۔ اور اب اُس کی آنکھیں کھلیں، کہ اُس نے کیا کیا۔ اُس نے اپنا سر ہلایا اور اپنے دل میں کہا "آج مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میرا زمانۂ عروج جو کچھ ہونا تھا ہوگیا۔ اس بدبخت تلوار نے میرے تمام

منصوبوں پر پانی پھیر دیا۔ مجھے اس جرم کی تلافی کرنا چاہیے۔ اس گناہ کا کفارہ دینا چاہیے۔ مرنے کے قبل اس ندامت کو دُور کرنا ضروری ہے۔ آج سے یہی میری زندگی کا مقصد ہوگا۔ یہی میرے دل کی تمنا، یہی میرا نصب العین۔ پٹھان کا ایک چھوٹا بچہ تھا جسکو گووند اپنے گھر لے آیا۔ ماں کی طرح اُسے رات دن اپنے سینے سے لگا کر پرورش کی۔ جب لڑکا سن تمیز کو پہونچا، گووند نے اُسکو شاستر پڑھائے۔ اُسے فوجی تعلیم دی۔ بڈھا گرو گووند صبح وشام اُسکے ساتھ بچے کی طرح کھیلا کرتا تھا۔ اسکے چیلے تعجب سے کہتے۔ اے پتا۔ یہ کیا ہے۔ ہمیں خوف ہے چاہے جتنی کوشش کی جائے شیر کے بچے کی جبلت تبدیل نہیں ہو سکتی۔ جب وہ جوان ہوگا اسے باپ یاد رکھو اسکے ناخن ضرور تیز ہوں گے۔

عاقبت گرگ زادہ گرگ شود گرچہ با آدمی بزرگ شود

گرو گووند نے مسکرا کر جواب دیا۔ میں یہی چاہتا بھی ہوں۔ میری کوشش و محنت بیکار ہے اگر میں شیر کے بچے کو شیر نہ بنا سکوں۔ گرو گووند کی مادرانہ خبرگیری کی تحت بچہ بڑھ کر جوان صالح ہوا۔ محمود اُسکے بڑھاپے میں بیٹے کی طرح خدمت کرتا۔ سایہ کی طرح اُس کے ساتھ ساتھ رہتا۔ دل و جان سے اُسکے ساتھ محبت کرتا۔ ایاز کی طرح اُس کا غلام تھا۔ نوجوان پٹھان کو گرو کا داہنا بازو کہنا چاہیے۔ گرو گووند کے تمام لڑکے جنگ میں مار ڈالے گئے تھے۔ پیری میں اُس کی تمام امیدیں محمود کی ذات سے وابستہ تھیں۔ اُسکے ٹوٹے ہوئے دل کا یہی آسرا تھا۔ زخم جگر کا یہی مرہم تھا گویا ایک پرانے پیڑ کے درخت کے کھوکھلے میں جس پر بجلی گر چکی تھی ہوا نے اُڑا کر ایک چھوٹا سا بیج ڈال دیا۔ وہ جما۔ کلے پھوٹنے سے اور بڑھا۔ پرانا خشک درخت نئے درخت کی سبز پتیوں سے ڈھک گیا۔ برسیں گذر گئیں۔ دوزانو ہو کر پٹھان نے گرو کے سامنے عرض کی۔ آپ کی شفقت سے میری تعلیم و تربیت ختم ہو چکی۔ اب مجھے اجازت دیجیے کہ تلاش معاش میں باہر نکلوں تاکہ آپ کو بڑھاپے میں کچھ آرام دے سکوں۔ گووند نے محمود کو سینے سے لپٹا کر اور اسکے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا میرے بیٹے۔ ابھی مجھے تمہیں ایک سبق اور سکھانا ہے۔

دوسرے دن شام کو گووند تنہا چلا اور محمود کو مخاطب کرکے کہا آؤ تلوار لیکر میرے ساتھ چلو" دوسرے چیلوں نے ہمراہ چلنے پر اصرار کیا۔ مگر گرو نے سب کو واپس جانے کا حکم دیا۔ دونوں آہستہ آہستہ جنگل کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں کوئی بات چیت نہ ہوئی۔ ایک دریا کے کنارے پر پہونچے۔ گرو نے کہا۔ محمود یہاں آؤ اور اس جگہ کو کھودو۔ زمین کے نیچے سے ایک پتھر

نکلا جس پر میلے میلے سرخ نشان بنے ہوئے تھے - گووند نے کہا کیا تم پتھر پر یہ سرخ نشان دیکھتے ہو۔ یہ تمہارے باپ کا خون ہے - اس جگہ پر میں نے اُسکو قتل کیا تھا - اُس کا قرض ادا نہ کیا۔ مدت کا موقعہ نہ دیا - پٹھان - کیا تو اپنے باپ کا فرزند لایق ہے ؟ اگر ہے - نیام سے تلوار نکال لے اپنے باپ کے قاتل کو قتل کر اور اُسکی تشنہ روح کی پیاس میرے گرم خون سے بجھا -

محمود کی آنکھیں غصے سے سرخ ہوگئیں - وہ بڑبڑاتا ہوا گرو پر جھپٹا - گرو گووند سنگ مرمر کی مورت کی طرح خاموش کھڑا رہا - پٹھان نے اپنی تلوار پھینکدی اور دیکھتے ہی دیکھتے گرو کے قدموں پر گر پڑا اور دست بستہ ہوکر یوں منت سماجت کی " گرو دیو - اس طرح میرے ولی جذبات کو اشتعال نہ دیجیے - خدا جانتا ہے کہ میں اپنے باپ کو بھول گیا - اُسکے خون ناحق کی یاد نہیں باقی نہ رہی - آپ نے مجھ پر پدرانہ شفقت کی ہے - آپ میرے دوست ہیں - رہنما ہیں - میرے نفس پر اس محبت کا غلبہ رہنے دیجیے - مجھے اپنے قدموں کی خاک عطا کیجیے - یہ کہکر وہ ہانپتا ہوا جنگل کے باہر بھاگ گیا - پیچھے مڑ کر نہ دیکھا - ایک لمحہ نہ ٹھہرا - گووند کی غمناک پلکیں آنسوؤں سے تر ہوگئیں -

اُس دن سے محمود گرو کی حضوری سے قصداً دُور دُور رہتا - علی الصباح اُسکی خوابگاہ میں اُسے بیدار کرنے کے لیے تنہا کبھی نہ جاتا - تمام قسم کے ہتھیاروں سے نفرت کرتا - اس کی خوابگاہ کے قریب رات کو کبھی پہرا نہ دیتا - کبھی اُسکے ساتھ شکار کو نہ جاتا - طلب کیے جانے پر بھی تنہائی میں اُس سے ملنے سے گریز کرتا -

ایک دن گووند اور پٹھان شطرنج کھیل رہے تھے - سورج غروب ہوگیا - دن ختم ہوا - لیکن کسی کو خبر نہ ہوئی - محمود بازی پر بازی ہارتا تھا - شام کا وقت نکل گیا - اچھی خاصی رات ہوگئی - لیکن کھیل نہ ختم ہوا - گووند کے ساتھی بھی اُٹھ کر چلے گئے -

رات کی خاموشی چاروں طرف چھائی ہوئی تھی - سکوتِ شب کا عالم تھا - پٹھان سیدھا تنا ہوا بیٹھا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کون چال چلوں - گووند نے بساط اُلٹ دی - مہرے مٹھی میں لیکر محمود کے سر پر زور سے مارے اور خوفناک انداز سے قہقہہ لگاکر کہا " ایک بزدل کس طرح جیت سکتا ہے - ایک بزدل جو اپنے باپ کے قاتل کے ساتھ کھیلتا ہو " محمود نے بجلی کی طرح اپنا خنجر نیام سے نکال لیا اور گووند کے سینے میں بھونکدیا - گووند نے مسکرا کر کہا آج تجھکو یہ معلوم ہوا کہ بُرائی کا بدلہ کیونکر لیا جاتا ہے - میں نے تجھے آخری سبق دم آخر سکھادیا ہے اور دست بدعا ہوں کہ میرے بیٹے - خدا تجھے ہمیشہ خوش رکھے - (رابندر ناتھ ٹیگور) باسط بسواتی

تضمین بر غزل حضرت سنائی رحمۃ اللہ علیہ

حضرات - اس زمانہ میں ایک شاعر کے لیے بی اے یا علیگ ہونا ضروری ہے
افسوس کہ میں ان دونوں صفتوں سے محروم ہوں - لہذا ناظرین سے بکمال ادب مستدعی ہوں کہ
خمسۂ ذیل میں خصوصیاتِ مروجہ کی تلاش کی زحمت نہ گوارا فرمائیں - غزل درحقیقت پندرہ
شعر کی ہے - پہلے چھ شعروں کی تضمین ظفر مرحوم نے فرمائی - بقیہ میرے حصہ میں آئے - ہاں
میں نے مطلع کو دوبارہ تضمین کیا ہے - مقصود محض حمد ہے - نہ اظہار قادر الکلامی کا خیال ہے
نہ ظفر مرحوم کی برابری کا دعوےٰ - خفاش کرانی

رہی دن رات ظرافت میں بہت ہرزہ سرائی (۱) نہ ہوئی ذہن کو جس سے رہ عقبیٰ میں رسائی
مگر اب غیب سے یہ بات مرے دل میں ہے آئی ملکا ذکرِ تو گویم کہ تو پاکی و خدائی
نہ روم جز بہ آں رہ کہ تو آں راہ نمائی

طلبِ وصل میں تیری میں ہوں عشقِ مجسم (۲) سرِ شوریدہ سے یارب نہ یہ سودا ہو کبھی کم
یہ تمنا ہے کہ حبّ کرے ہے دم میں مرے دم ہمہ درگاہِ تو جویم ہمہ در راہِ تو پویم
ہمہ توحیدِ تو جویم کہ بتوحید سزائی

کوئی کعبے کا ہے ساکن تو کلیسا کا کوئی باشی (۳) کوئی گرجا کا ہے شیدا - کوئی دلدارِ کاشی
ہے ولے متفق اس بات پہ ہر یک متلاشی نہ بُدے خلق تو بودی نہ بود خلق تو باشی
نہ تو خیزی - نہ نشینی - نہ تو کاہی - نہ فزائی

تو ہے ادراک سے بالا تو ہے اندیشہ سے فائق (۴) نہ کھلے بحث و دلائل سے کبھی تیرے حقائق
وہ تجھے دل ہی میں پا لیتے ہیں جو ہیں ترے شائق نہ سپہری نہ کواکب - نہ بروجی نہ دقائق
نہ مقامی نہ منازل - نہ نشیبی - نہ بپائی

کوئی ہندی ہو کہ شامی - عجمی ہو کہ ہو تازی (۵) وہ ہو سرمد کہ ہو منصور - وہ طوسی ہو کہ رازی
جو ہے اس راہ سے واقف ہے یہی لب یگانہ بازی بری از چون و چرائی - بری از عجز و نیازی
بری از صورت رنگیں بری از عیب و خطائی

نہ تو ہے جان سے زندہ نہ تو رکھتا ہے کوئی تن (۶) نہ تو اعضا نہ جوارح نہ لباس اور نہ دامن
نہ تو فرزند ہے تیرے۔ نہ کفو ہے نہ کوئی زن بری از خفتن و خوردن بری از تہمت و ظن

بری از بیم و امیدی بری از رنج و بلائی

کروں ہر لحظہ ثنا تیری یہی چاہتا ہے جی (۷) مگر عاجز ہوں ہمیشہ تو بھلا کیا مری ہستی
نہ یہ قدرت ہے قلم کی نہ یہ طاقت ہے زباں کی نہ تواں وصف تو گفتن کہ تو در وصف نگنجی

نہ تواں شرح تو کردن کہ تو در شرح نیائی

نہ چھپی تجھ سے تھی کیفیت یوسف بہ اسیری (۸) جو تھی ادہم کو تری دھن انھیں دلوائی فقیری
یہی فاروق سمجھتے تھے بایں شان امیری تو علیمی تو حکیمی - تو خبیری - تو بصیری

تو نمایندۂ فضلی تو سزاوار خدائی

نہیں ہم تھے نہ سوا تیرے کسی سے بھی مدد لی (۹) رہی ہم ہیں کہ صفت ایک بھی باقی نہیں اگلی
تری رحمت سے پھر اب ہو نہ کرے حالت اصلی احد لیس کمثلی - صمد لیس کفضلی

لمن الملک تو گوئی کہ سزاوار خدائی

یہی خواہش گنہگار کو مرشد سے ملی ہے سند (۱۰) کہ کرے ذکر خداوند جہاں گر رہے خردمند
رہے ہر وقت یہی دھن نہ ہو جبتک کہ زباں بند لب و دندان سنائی ہمہ توحید تو گویند

گر از آتش دوزخ بودش زود رہائی

محمد وارث حسین کرمانی وکیل

رسید کتب

(مالکین ڈپو نے بھیجیں)

کتاب	مصنف / ناشر	قیمت
۱- فرہنگ اصطلاحات علمیہ	انجمن ترقی اردو	قیمت ۷ر
تاریخ سنجیہ	مولانا اسلم جیراجپوری	عہر
تاریخ السلطنت	صاحبزادہ عبدالباری معنی اجمیری	صہ
قریۂ ویراں	سید راحت حسین بی ایل	عہر
نغمہ	انجمن اتحاد کلیہ جامعہ عثمانیہ	۸ر
سالومی	حضرت مجنوں گورکھپوری	۱۲ر
نقادی کے نکتے	چودھری محمد علی ردولوی	۴ر
تاریخ زوال روما	[illegible] بی اے	عہ

انعامی مضمون

جملہ اہل قلم کو دعوت دی جاتی ہے کہ مضمون ذیل پر طبع آزمائی فرمائیں

عنوان

عہد میر تقی میر کے بعد سے اسوقت تک غزل گوئی میں کون شاعر سب سے زیادہ کامیاب ہوا ہے۔ اور اُس کے (منتخب اشعار ایک صفحہ میں آجائیں) بہترین اشعار کون ہیں؟

شرائطِ مقابلہ

(۱) غزل کے لوازم، اپنے ممدوح کی خصوصیات اور اُسکے کلام کا معاصر یا مشہور غزل گویوں کے اشعار سے موازنہ کرکے اسبابِ ترجیح نمایاں کیے جائیں۔

(۲) مضمون فلسکیپ کاغذ کے کم سے کم ۳۰ صفحوں پر صرف ایک جانب لکھا جائے۔

(۳) ۳۱- اگست ۱۹۲۶ء تک رجسٹری کے ذریعہ دفتر الناظر میں وصول ہو جائے۔

(۴) اصحاب ذیل مضامین کی جانچ کریں گے:-

۱- مولوی سید محفوظ علی بی اے - بدایوں

۲- مولانا عبد السلام ندوی دار المصنفین اعظمگڈھ

۳- مولوی عبد الماجد بی اے دریاآباد ضلع بارہ بنکی

۴- مولوی سید ہاشمی - دار الترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی

۵- مولوی امیر احمد علوی بی اے بینچ چھاؤنی

۶- مرزا محمد عسکری بی اے سکرٹری انجمن اُردو لکھنؤ

۷- مرزا جعفر علیخاں اثر لکھنوی بی اے ڈپٹی کلکٹر اُناؤ

(۵) دو انعامات دیے جائیں گے:-

اول - پچاس روپیہ کی تھیلی اور پچاس جلدیں مضمون کی بعد طبع -

دوم - پچیس روپیہ کی تھیلی اور پچیس جلدیں مضمون کی بعد طبع -

(۶) جن مضامین پر انعام دیا جائیگا اُنکے طبع و اشاعت کے حقوق دائمی طور پر بحق الناظر محفوظ ہوں گے۔

(۷) دیگر مضامین بھی مجموعہ شایع ہونے تک کہیں نہ چھپ سکیں گے اور مجموعہ کے طبع و اشاعت کے جملہ حقوق بحق الناظر محفوظ ہوں گے۔

ظفر الملک

تیسری قسم اُن اخلاق کی ہے جنھیں انسان عادت یا وراثت سے حاصل کرتا ہے اور انھیں
اخلاقِ کسبیہ کہتے ہیں۔

یہ تینوں قسم کے اخلاق باہم وابستہ و پیوستہ اور ایک دوسرے سے متاثر ہوتے ہیں،
نیز سب کے سب تربیت و عادت سے گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں۔ مثلاً قتل ایک نہایت بد فعل ہے،
لیکن قاتل جب دوسری مرتبہ اس کا مرتکب ہوتا ہے تو اُس کے دل میں وہ نفرت باقی نہیں رہتی
جو پہلی مرتبہ محسوس ہوئی تھی، پھر جب بار بار اُس کا ارتکاب کرتا رہتا ہے تو یہ جرم اُسکے لیے کچھ
ایسا پسندیدہ اور پُرتکلف ہوجاتا ہے گویا وہ اُس کا ایک طبعی حق ہے جس سے کسی طرح باز نہیں
رہ سکتا۔ بالکل یہی حال مستبد حکام اور سرکش اربابِ سیاست کا ہے۔ یہ لوگ خونریزی کو
معمولی کھیل سمجھتے اور اُس سے خاص لطف حاصل کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے اُنھیں جلاد
کہنا چاہیے۔ کیونکہ ان میں اور جلادوں میں کوئی فرق نہیں، جلاد تلوار سے کام لیتے ہیں اور یہ
قلم سے، بلکہ اِن کا جرم اُن سے کہیں زیادہ سنگین ہوتا ہے، وہ اشخاص کی زندگی ختم کرتے
ہیں اور یہ قوموں کی قومیں فنا کرنے اور اُن کی آیندہ نسلوں تک کو غلامی کی لعنت میں
ڈھکیل دیتے ہیں۔

گرفتارانِ استبداد میں بداخلاقیاں راسخ ہوتے ہوتے آخر اُنکے رگ ریشہ میں پیوست
ہوجاتیں اور نسلاً بعد نسلٍ اُن میں منتقل ہونے لگتی ہیں۔ اُنکی اولاد شر میں پیدا ہوتی ہے، شر میں
پلتی ہے، اور شر ہی میں پوری زندگی بسر کرتی ہے۔ جن لوگوں کی یہ حالت ہو اُن میں جبلی، کمالی
اور کسبی اخلاقِ حسنہ کیونکر موجود ہو سکتے ہیں؟ ہزاروں مفاسد میں تنہا ریاکاری ہی اخلاق
کی پوری عمارت کو بیخ و بن سے اُکھاڑ دینے کے لیے کافی ہے جس کی خو استبداد کے قیدیوں
کو مجبوراً پڑتی اور بڑھتے بڑھتے طبیعت ثانیہ ہوجاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خود اعتمادی
کے جوہر سے خالی ہوجاتے ہیں حتیٰ کہ خود اپنے بارے میں بھی کوئی مستقل رائے قائم نہیں
کرسکتے، اپنی امانت داری پر بھروسہ نہیں رکھتے، اپنی ثابت قدمی پر یقین نہیں کرتے،
زندگی بھر اپنی نسبت سوءِ ظن رکھتے ہیں، اپنے مشاغل میں استقلال نہیں رکھتے، ہمیشہ اپنی
سستی کے شاکی رہتے ہیں، سدا اپنا نقص محسوس کرتے رہتے ہیں۔ یہ سب کرتے ہیں مگر
کبھی نہیں سوچتے کہ آخر یہ بلا آئی کہاں سے؟ ہوتے ہوتے اپنے خالق پر بھی الزام رکھنے
لگتے ہیں۔ حالانکہ خدا نے اُنھیں ایسا ناقص پیدا نہیں کیا تھا۔ پھر کبھی اپنے مذہب میں

شاک کرتے ہیں، کبھی اپنی تربیت کو گالیاں دیتے ہیں، کبھی اپنے زمانہ کو بُرا بھلا کہتے ہیں، کبھی اپنی قوم پر لے دے کرتے ہیں - حالانکہ کسی کی بھی خطا نہیں، جتنی خطا ہے خود اُنکی اپنی ہے، اور وہ صرف یہی ہے کہ آزاد پیدا ہوے تھے مگر اپنے ہاتھوں غلامی کی بیڑیوں میں جکڑ گئے ہیں -

علماء اخلاق کا قول ہے کہ انسان میں جو بُرائی یا خوبی ہوتی ہے، وہی اُسے سب میں نظر آتی ہے، مثلاً ریاکار سب کو ریاکار، اور امانت دار سب کو امانت دار سمجھتا ہے - چونکہ استبداد کے قیدیوں میں عموماً بدترین اخلاق پائے جاتے ہیں اس لیے وہ کسی پر بھروسہ نہیں رکھتے، اجتماعی، قومی اور شخصی ضرورتوں میں باہم مدد نہیں کرتے - اس بے اعتمادی اور نفسی نفسی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بدبختی اُنھیں ہر طرف سے گھیر لیتی ہے۔

باہمی مددگاری، دنیا کی ترقی کا راز ہے، اسی پر نظام شمسی قائم ہے، اسی سے سلسلۂ نسل جاری ہے، اسی سے جملہ اجسام کی بقا ہے، اسی سے قومیں زندہ ہیں، آگے بڑھ رہی ہیں، زندگی کے فوارے چھوٹ رہے ہیں، اسی کی بدولت ترقی یافتہ قوموں کی عظیم الشان سلطنتیں اور حیرت انگیز کارنامے ہیں -

ممکن ہے اعتراض کیا جائے کہ باہمی مددگاری کا مسئلہ ایسا نہیں ہے کہ اُس پر روشنی ڈالنے کی ضرورت ہو، سب اُس کی اہمیت سے واقف ہیں - اور لکھنے والے اسپر اتنا لکھ گئے ہیں کہ اب بحث میں کوئی ندرت باقی نہیں رہی - سچ ہے، لیکن بُرا ہو استبداد کا جس نے مشرقی مصنفین کو اُسکی اہمیت و ضرورت پوری طرح واضح نہ کرنے دی اور محض ضمنی بحثوں میں اُلجھا دیا - چنانچہ جب وہ اس موضوع پر قلم اُٹھاتے ہیں تو مقدمات اس طرح ترتیب دیتے ہیں "مشرق بیمار ہے، اُس کی بیماری جہالت ہے، جہالت ایک بُری بلا ہے، جسکی علت مدارس کی قلت ہے، مدارس کی قلت کا سبب قوم میں باہمی اعتماد و مددگاری کا فقدان ہے" کچھ اور لوگ اُٹھتے ہیں اور کہتے ہیں "مشرق کی بیماری بے دینی ہے" اور چُپ ہو جاتے ہیں، حالانکہ اگر سلسلۂ کلام جاری رکھیں تو معلوم ہو جائے کہ یہ بے دینی بھی استبداد کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے، اور یہ کہ مشرق کی تمام بیماریوں کا علاج صرف اُس کی سیاسی آزادی میں ہے، مگر کوئی بھی یہ بات مُنہ سے نہیں نکالتا اور نہ پبلک کی اس طرف رہنمائی کرتا ہے۔

مصلحین کی رائے ہے کہ اخلاق بگڑتے بگڑتے قومیں اِس درجہ پست ہو جاتی ہیں کہ

خطاب کے قابل بھی نہیں رہتیں اور یہ کہ قوموں کی اخلاقی اصلاح سب سے زیادہ مشکل کام ہے جسکے لیے بڑی عقل، بڑی ہمت، بڑے عزم، بڑے حوصلہ کی ضرورت ہے۔ اُنھوں نے یہ بھی تسلیم کرلیا ہے کہ جب کسی قوم میں اخلاقی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں تو سب سے پہلے بادشاہ میں پیدا ہوتی ہیں پھر اس سے وزیروں اور سپہ سالاروں میں منتقل ہوتی ہیں پھر اُنسے تمام عہدہ دار، اہلکاروں اور فوجی سپاہیوں کو لگتی ہیں، پھر اُنسے متعدی ہوکر قوم کے ہر ہر گھر اور ہر ہر فرد کو لگجاتی ہیں طبقہ امرا پر اُنکا اثر سب سے زیادہ اور سب سے پہلے ہوتا ہے، عوام اُن کی تقلید کرتے ہیں اور اس طرح پوری قوم میں یہ بیماریاں وبا بنکر اس درجہ عام اور پیوست ہو جاتی ہیں کہ علاج ناممکن ہو جاتا ہے۔

انبیاء نے اپنی قوموں کو شقاوت سے نکالنے کے لیے تدریجی طریقہ اختیار کیا تھا چنانچہ سب سے پہلے عقلوں کو غیر اللہ کی تعظیم و اطاعت سے آزاد کیا اور یہ اُس فطری ایمان کو تقویت دیکر جو ہر انسان کی جبلت میں موجود ہے۔ پھر کتاب و حکمت کے ذریعہ اُنھیں بتانا شروع کیا کہ انسان اپنے خیالات و اعمال میں کیونکر اپنے ارادہ و اختیار پر قابو حاصل کرسکتا ہے، یعنی کیونکر تمام خارجی پابندیوں سے آزاد ہوکر اپنے ارادہ کا مالک ہو سکتا ہے؟ اس طرح اُنھوں نے استبداد کے تمام قلعہ ایک ایک کرکے ڈھا دیے اور فساد کے سرچشموں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر پاٹ دیا۔ جب دماغ آزاد ہوگئے تو اُنھوں نے بتانا شروع کیا کہ انسان صرف قانونِ انسانیت کا پابند ہے اور مکارم اخلاق کا ضابطہ ہی وہ ضابطہ ہے جس پر اُسے چلنا چاہیے۔ اس طرح اُنھوں نے اپنے موثر مواعظ اور حکیمانہ تربیت کے ذریعہ اپنی تعلیم عام کردی۔

قدیم حکماء سیاست نے بھی انبیاء کی راہ اختیار کی۔ یعنی اصلاح کا آغاز مذہبی نقطہ سے کیا تاکہ سب سے پہلے عقل آزاد ہو جائے۔ پھر مسلسل تعلیم و تربیت سے اصلاح کا کام آگے بڑھاتے رہے۔

لیکن متاخرین حکماءِ مغرب کے ایک گروہ نے بالکل جدا راہ اختیار کی ہے۔ اُنھوں نے اپنی قوم کو مذہب سے بیزاری کی دعوت دی اور قطعی بے قیدی اور فطری تربیت کو کافی بتایا ہے۔ اُن کا نظریہ یہ ہے کہ، مذہب اور استبداد، دونوں ایک ہی چیز کے دو نام ہیں، اس لیے دونوں سے گریز کرنا چاہیے۔

اِس راہ کے اختیار کرنے میں اُنھیں بڑی مدد اس سے ملی کہ علم، جو اگلے زمانوں میں

صرف کا ہنوں اور مذہبی پیشواؤں کی میراث تھا، اب عام ہو چکا ہے اور عقل انسانی اُسکے ذریعہ بتدریج آزاد اور روشن ہو رہی ہے۔ بنا بریں اُنھوں نے دین و مذہب کی جگہ وطن اور حُب الوطن کو قائم کیا اور سیاسی اصلاح آگے بڑھائی۔

وقت آگیا ہے کہ تمام مشرقی قومیں، عام اس سے کہ مسلمان ہوں یا عیسائی، بودھ ہوں یا یہودی، ہندو ہوں یا مجوسی، آنکھیں کھولیں اور اپنے جاہل اور اندھے مذہبی پیشواؤں کے غوغا کی پرواہ کیے بغیر اپنے اپنے مذہب سے بدع و زوائد کو نکال پھینکیں، دین کو بے میل کر دیں، اور بے روک ٹوک ترقی کی شاہ راہ پر چل کھڑے ہوں۔ لیکن اگر وہ اپنی اسی سستی کاہلی، لہو و لعب، اور دل خوش کُن خوابوں میں پڑے رہے، خود ستائی اور خود پرستی کے خوگر رہے حقائق کے فہم اور فرائض کی ادائی سے غافل رہے، مصائب کا مقابلہ محض کھوکھلی آرزوؤں اور اوراد و پری دعاؤں سے کرتے رہے، اولو العزمی و سرگرمی کے بجائے صرف اتفاقاتِ زمانہ پر آس لگائے بیٹھے رہے تو یقین کر لیں کہ دُنیا تو جا ہی چکی، دین بھی عنقریب رخصت ہو جائے گا۔ دہریت و الحاد کی آندھیاں اُسے بیخ و بُن سے اُکھاڑ پھینکیں گی اور خود اُن کا وہی حشر ہوگا جو اُن سے پہلے اشوریوں، فینقیوں اور دوسری برباد شدہ قوموں کا ہو چکا ہے!

استبداد اور تربیت

قدرت نے انسان کو خیر و شر دونوں کی استعداد دی ہے، ماں باپ اُسے اچھا بُرا بناتے ہیں۔ تربیت اُسکے جسم، روح اور عقل پر وہی اثر کرتی ہے جو رنگ سفید کپڑے پر کرتا ہے۔ تربیت اگر اچھی ہے تو وہ اچھا ہوگا، بُری ہے تو بُرا ہوگا۔ یہ تربیت کا خاصہ ہے، اس کے برخلاف بے رحم استبداد ہے جس سے کسی حال میں بھی بھلائی کی اُمید نہیں۔ وہ اگر جسم پر حملہ کرتا ہے تو اُسے طرح طرح کے روگوں میں مبتلا کر دیتا ہے، روح پر یورش کرتا ہے تو اُسے گندہ اور کالا کر ڈالتا ہے، عقل پر نرغہ کرتا ہے تو اُسے کند اور بے نور کر کے چھوڑ دیتا ہے۔ بنا بریں تربیت اور استبداد دو متضاد نتائج رکھنے والے مؤثر ہیں، تربیت باوجود اپنی کمزوری و سست رفتاری کے جو کچھ بناتی ہے استبداد اُسے اپنی سرکش قوت سے ڈھا دیتا ہے۔

انسانی استعداد و قابلیت کی کوئی حد نہیں، وہ اونچا ہوتا ہے تو کمال میں فرشتوں سے

بھی بڑھ جاتا ہے، اور گرتا ہے تو شیطانوں سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ بد انسان بے سبب بھی برائی کرتا ہے بلکہ کبھی خود اپنے ساتھ بھی بدی کرنے لگتا ہے۔

انسان بچپن میں سبز شاخ کی طرح ہوتا ہے، قدرت کے سُبک ہاتھ اُسے سیدھا اور لچیلا پیدا کرتے ہیں، تربیت کی ہوائیں اُسے دائیں بائیں جھکاتی رہتی ہیں جس سے کسی کا رُخ خیر کی طرف ہو جاتا ہے اور کسی کا شر کی جانب۔ جس طرف زیادہ دن جھکا رہتا ہے، شاخ کی طرح انسان بھی اُسی پر خشک اور سخت ہو کر رہ جاتا ہے، پوری زندگی اسی حالت میں گذرتی ہے بلکہ مرنے پر بھی روح ابد الآباد تک اسی پر رہتی ہے۔

تربیت ایک ملکہ ہے جو تعلیم، تمرین، مشق، پیروی، تقلید، اقتباس سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ ملکہ اگر شر کا ہوتا ہے تو نفس اور شیطان کا ہم نوا ہو کر بدی اور شرارت میں اُس کا شریک بن جاتا اور برابر اپنے قدم مضبوط کرتا جاتا ہے۔ اور اگر خیر کا ہوتا ہے تو خواہشات کے خونناک سمندر میں ڈگمگاتا رہتا ہے۔ اور اس کا صرف وہی حصہ ہوا و ہوس کی طوفان خیز موجوں کا مقابلہ کرتا ہے جو مذہبی یا سیاسی ہوتا ہے، بشرطیکہ اس کے موجب برابر عمل ہوتا رہے۔

.... استبداد ایک تند و تیز آتشیں طوفان ہے جو انسان کو کبھی ایک حالت پر رہنے نہیں دیتا۔ وہ مذہب کو بگاڑتا ہے خصوصاً اسکے اُس حصہ کو جو اخلاق سے تعلق رکھتا ہے کسی طرح بھی گوارا نہیں کرسکتا۔ لیکن وہ عبادات سے زیادہ پرخاش نہیں رکھتا کیونکہ وہ اکثر اس کی مصلحت کے موافق ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غلام قوموں میں مذہب صرف عبادات کی شکل میں باقی رہ جاتا ہے جو عادت ہو جانے کی وجہ سے نہ طہارت نفس کا کام دیتی ہیں، نہ جسم و عقل کو فحشاء و منکر کی گندگیوں سے بچاتی ہیں۔ یہ اس لیے کہ اُن میں اخلاص باقی نہیں رہتا اور اخلاص اس لیے باقی نہیں رہتا کہ خود دل اخلاص سے بالکل خالی ہوتے ہیں، کیونکہ استبداد کی ترکتازیاں انہیں مجبور کرکے عادی بنا دیتی ہیں کہ ہمیشہ دروغ، ریا، مکر، نفاق کے دامنوں میں پناہ لیں۔ اس صورت حال میں اسیر استبداد سے ہرگز بعید نہیں کہ بھی اوصاف اپنے ماں باپ، قوم و وطن حتیٰ کہ خود اپنے ساتھ بھی برتے۔

تربیت کی قسمیں اور زمانے مختلف ہیں: محض جسم کی تربیت کا زمانہ دو سال ہے اور قمر

ماں کا فرض ہے۔ تیسرے سال سے جسم کے ساتھ نفس کی بھی تربیت شروع ہو جاتی ہے اور سات سال تک رہتی ہے، یہ ماں باپ اور خاندان کا فرض ہے۔ پھر جسم و نفس کے ساتھ بلوغ تک عقل کی تربیت کا وقت ہے اور یہ اُستاد کا فرض ہے۔ پھر عہدِ ازدواج تک رشتہ داروں اور دوستوں سے کسب و اقتباس کے ذریعہ تربیت کا زمانہ ہے۔ پھر تربیتِ رفاقت کا زمانہ آتا ہے جو زن و شو کے فرائض میں سے ہے اور جدائی یا موت تک قائم رہتا ہے۔

بلوغ کے بعد جتنے دَور انسان پر آتے ہیں اُن میں ماحول، سوسائٹی، قانون، سیاست اور خود انسان کی اپنی تربیت، ان سب کا درست اور ساتھ ہوتا بیسا ضروری ہے۔

منظم حکومتیں قوم کی تربیت اُس وقت سے شروع کرتی ہیں جب وہ باپ کی پیٹھ میں ہوتی ہے، اور یہ اس طرح کہ وہ نکاح کے قوانین وضع کرتی ہیں، دائیوں جنائیوں اور طبیبوں کو بڑے اہتمام سے مہیا کرتی ہیں۔ لاوارث بچوں کے لیے یتیم خانے قائم کرتی ہیں، مکتب، مدرسے، کالج، یونیورسٹیاں کھولتی ہیں۔ ابتدائی تعلیم عام اور جبری کر دیتی ہیں۔ مفید اجتماعات میں سہولت پیدا کرتی ہیں۔ نتیجہ خیز تماشوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ انجمنوں کی حمایت کرتی ہیں۔ کتب خانے جاری کرتی ہیں۔ آثارِ قدیمہ جمع کرتی ہیں۔ یادگاریں قائم کرتی ہیں۔ محافظِ حقوق و آداب قوانین وضع کرتی ہیں۔ قومی عادات کی حفاظت اور وطنی جذبات کی ترقی میں کوشاں رہتی ہیں۔ اُمیدوں کو تقویت دیتی ہیں، حوصلے اُبھارتی ہیں۔ تجارت میں آسانی پیدا کرتی ہیں۔ لاچاروں کو فاقوں مرنے سے بچاتی ہیں۔ قوم کے محسنوں اور خدمتگذاروں کے جنازے دھوم دھام سے اُٹھاتی ہیں۔ اس اہتمام کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوم میں اولوالعزمی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ خواہش کرنے لگتی ہے کہ اُس کا ہر فرزند جب تک زندہ ہے، خوش و خرم رہے اور کبھی اس خیال سے پریشان نہ ہو کہ مرنے کے بعد اُسکی اولاد کی کیا حالت ہوگی نیز جب مرے تو اطمینان و مسرت کی موت مرے اور اُسکی آخری صدا یہی ہو کہ "زندہ باد قوم!"

لیکن مستبد حکومتوں کے زیرِ سایہ انسانی زندگی ہر طرح کی تربیت سے محروم ہوتی ہے۔ اس میں صرف نمو ہی نمو ہوتا ہے جو خودرَو جنگلی درختوں کے نمو سے مشابہ ہوتا ہے کہ جن پر آگ، سیلاب، بجلی اور آندھیوں کا دورہ رہتا ہے، لکڑہارے کا بے رحم کلہاڑا شب و روز چلتا ہے، اور وہ اسی وقت تک زندہ ہیں جب تک لکڑہارے کی مرضی ہے، اتفاقاتِ زمانہ پر اُن کا بھروسہ ہوتا ہے، بعض ٹیڑھے ہو جاتے ہیں، بعض سیدھے رہ جاتے ہیں، بعض میں پھل آتے ہیں، بعض بے پھل

رہتے ہیں۔

برخلاف اسکے انصاف و آزادی کے سایہ میں انسان چاق و چوبند رہتا ہے۔ دن کام میں ہنسی خوشی گذرتا ہے، رات غور و فکر اور میٹھی نیند میں کٹتی ہے۔ اگر کھاتا ہے، لذت و مسرت پاتا ہے۔ اگر کھیلتا ہے، قوت و تسلی حاصل کرتا ہے۔ عدل و حریت کے زمانہ میں تمام مرد، زن، امیر، غریب، بادشاہ، فقیر، سب محنت مشقت میں لگے ہوتے ہیں۔ محنت سے ایک پیسہ کمانے والا اس کروڑپتی پر فخر کرتا ہے جسے دولت باپ دادا سے وراثت میں ملی ہے جس آدمی کا دل و دماغ مطمئن ہے، اُسے اپنی محنت میں کامیابی ہوتی ہے تو خوش ہوتا ہے، اور اگر ناکامی ہوتی ہے تو رنج نہیں کرتا۔ وہ زندگی میں کتنا ہی ناکامیاب ہو، ہرگز مایوس نہیں ہوتا۔ بلکہ برابر ایک کام کے بعد دوسرا کام شروع کرتا، ایک خیال سے دوسرے خیال کی طرف منتقل ہوتا اور اس طرح ہمیشہ اپنی اُمیدوں کے جھرمٹ میں فرحاں و شاداں زندگی بسر کرتا ہے۔ اُسے کتنی ہی ناکامی ہو مگر کبھی بھی اُس کے حق میں شرمناک نہیں ہوتی کیونکہ وہ ہر کام میں اپنا فرض ادا کرتا ہے، حتی الوسع پوری محنت اور ہوشیاری سے کام کرتا ہے۔ محنتی آدمی ہر حال میں، چاہے کامیابی ہو یا ناکامی، خوش و خرم اور باحوصلہ رہتا ہے کیونکہ وہ لاچاری اور کاہلی کے عیب سے بالکل پاک ہوتا ہے جو کلفت و حسرت کا پیش خیمہ ہے۔

لیکن اسیرِ استبداد کے نصیب میں یہ خوشی کہاں؟ وہ سستی، اُداسی، بے ہمتی کی زندگی بسر کرتا ہے۔ ہمیشہ پریشان خیال رہتا ہے کہ کیا کرے؟ کس طرح اپنے گھنٹے، دن، مہینے اور سال گزارے؟ گویا اپنی موت تک جلد سے جلد پہونچنے کے لیے بیچین ہوتا ہے، تاکہ مٹی کے نیچے دب کر اپنی ذلت دنیا کی نظروں سے چھپا سکے۔ بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ استبداد کے قیدی، خصوصاً جو اُن میں تہیدست ہیں، قید کی تکلیف محسوس نہیں کرتے، کیونکہ اگر محسوس کرتے تو اُسکے دفعیہ کی کوشش کرتے۔ لیکن یہ خیال درست نہیں۔ وہ قید کی مصیبت محسوس تو کرتے ہیں مگر اُس کا سبب نہیں جانتے۔ اکثر طبیعت اُداس رہتی ہے، کام میں جی نہیں لگتا۔ وہ اِسے محسوس کرتے ہیں مگر اصلی علت نہ جاننے کی وجہ سے مفرح دواؤں کے استعمال پر اُتر آتے ہیں۔ حالانکہ اِس سُستی کا اصلی سبب یہ ہے کہ اُنھیں اپنی محنت سے فائدہ اُٹھانے کا یقین نہیں ہوتا، بلکہ ہر وقت اسکے منائع جانے کا اندیشہ لگا رہتا ہے۔ مستبدوں کی لگاتار لوٹ دیکھتے دیکھتے اُنکے غلام بھی اِسے مکروہ سمجھنے کے بجاے جائز اور قدرتی سمجھنے لگتے ہیں اور ان میں بہت سے لوگ تمنا کرنے لگتے

ہیں کہ کاش اِنھیں لُوٹیروں کے زمرہ میں ہوتے اور کمزوروں کو کھسوٹا کرتے! اِس احساس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ غلام کوئی کام شروع ہی نہیں کرتے اور اگر کرتے ہیں تو چُستی و پختگی سے خالی ہونے کی وجہ سے قدرتاً ناکامیاب رہتے ہیں۔ پھر چونکہ ناکامی کی حقیقی علت سے ناواقف ہوتے ہیں اس لیے اُس وہمی چیز کو گالیاں دینے لگتے ہیں جس کا نام اُنھوں نے قسمت، تقدیر، بخت، نصیب، رکھ چھوڑا ہے۔

استبداد کا قیدی چونکہ دنیاوی عذاب میں مبتلا ہوتا ہے اس لیے اگر کسی مذہب کا پیرو ہے تو دل کے سمجھانے کے لیے آخرت کی خیالی مسرتوں، جنّتوں اور حوروں کے خیال میں مگن رہتا ہے مگر ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں سوچتا کہ دنیا، آخرت کا نشان اور ہیشہ خمیہ ہے۔ جو بزدلی کی وجہ سے یہاں ذلیل و خوار ہے وہاں کیونکر سرخرو ہو سکتا ہے؟

یہ تمام ہمت شکن طفل تسلیاں اُس زہر ہلاہل کی تلخی کم کر دیتی ہیں جس کا جام ہمیشہ اسیرانِ استبداد کے لبوں سے لگا رہتا ہے اور اُن راہوں کو اور بھی زیادہ تاریک کر دیتی ہیں جن پر چلنے سے شقاوت کا سرچشمہ معلوم کیا جا سکتا ہے۔ غلام اسی خیالی پلاؤ کے پکانے میں پڑے رہتے ہیں اور اپنی بدبختیوں سے یا تو غافل ہو جاتے ہیں یا اُنکی پوری ذمہ داری مستبد کے کاندھوں سے اُٹھا کر خدا یا تقدیر کے سر ڈال دیتے ہیں۔ اس طرح مستبد نڈر ہو کر جس طرح چاہتا ہے ظلم کرتا ہے

تربیت، علم و عمل کا نام ہے۔ غلام قوموں کے متعلق یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اُن میں تربیت کے ماہر اور معلم موجود ہو سکتے ہیں۔ علماء کا ہونا تو بڑی چیز ہے، اُنکی کتابیں تک صحیح علم تربیت سے بالکل خالی ہوتی ہیں۔ رہا عمل تو غلاموں کو اُسکی توفیق کہاں نصیب؟ عمل اُسی وقت ممکن ہے جب پہلے عزم موجود ہو، عزم بغیر یقین کے محال ہے اور یقین بغیر علم کے ناممکن۔ ظاہر ہے کہ یہ سُست، بے ارادہ، بے دست و پا غلام کب اسکی قدرت رکھتے ہیں کہ کسی اعلیٰ مقصد کی طرف اپنا خیال متوجہ کریں یا کسی مفید عمل میں اپنا جسم تھکائیں؟

تربیت کیا ہے؟ آنکھ کو صرف محاسن وغیرہ کے مشاہدہ کے لیے وقف کر دینا، زبان کو قولِ خیر کا عادی بنا دینا، ہاتھ کو کمال کا خوگر کر دینا، نفس کو پستی سے بلند رکھنا، ضمیر کو باطل پرستی سے بچانا، تمام کاموں میں ترتیب و سلیقہ کا لحاظ رکھنا، دولت و وقت میں کفایت شعاری

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مسالک النظر

بائیس سال ہوتے ہیں کہ سڈنی ایڈمنز ویسٹن نے پہلی مرتبہ جناب سعید بن حسن الاسکندرانی کا عربی رسالہ موسومہ مسالک النظر فی نبوۃ سید البشر امریکہ کی اورنٹیل سوسائٹی کے رسالہ میں شایع کیا۔ اس سے قبل یہ رسالہ امریکہ کی ییل یونیورسٹی کے عربی زبان کے قلمی نسخوں کے کتب خانہ میں تھا۔ شہرۂ آفاق پروفیسر گولڈ زیھر الازہری نے وقتاً فوقتاً اس میں سے کچھ کچھ اقتباس کیا تھا، لیکن مکمل رسالہ ۱۹۰۳ء ہی میں شایع ہوا ہے۔ جیسا کہ نام ہی سے معلوم ہوتا ہے، رسالہ کا موضوع حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوتِ مبارکہ سے متعلق ہے۔

سعید بن حسن اسکندرانی اسلام لانے سے قبل اسرائیلی مذھب کے پیرو تھے۔ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ انھوں نے مئی ۱۲۹۸ء میں اسلام قبول کیا، جس کا فوری سبب غالباً یہ تھا کہ وہ ایک نہایت شدید مرض سے شفایاب ہوئے تھے اور اس وجہ سے اُن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات سے ایک خاص اُنس ہو گیا تھا۔ بہرحال اس کتاب کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اُن کو اپنے مذھب کی کتابوں اور صحیفوں سے کس قدر غائر واقفیت تھی اور یہ کہ وہ اسلام اور شارع اسلام کے کس قدر گرویدہ تھے۔ انھوں نے نہایت کاوش سے حضور پرنور کے متعلق جس قدر پیشینگوئیاں عہدِ عتیق میں مل سکتی تھیں سب جمع کی ہیں۔

چونکہ یہ رسالہ دلچسپ اور معلومات سے پُر ہے، اس لیے میں اسے ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔ ذیل کی سطور میں اس رسالہ کا تمام وکمال ترجمہ باصرہ نواز ناظرین ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ رب تمم بخیر۔ آمین۔

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والتسلیم علیٰ سیدنا محمد خاتم النبیین وعلیٰ آلہ واصحابہ الفارہ وازواجہ الطاہرات امہات المومنین وعلی التابعین لھم باحسانٍ الیٰ یوم الدین۔

اب ہم اللہ کا نام لیکر شروع کرتے ہیں اور اسلام کی برکتوں سے مدد چاہتے ہیں کہ ہم حضرت سید الانام محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب الصادق الامین کی نبوت کا اظہار کریں —— وہ نبی جس کے ظہور کی بنی اسرائیل کے انبیاء کو خوشخبری دی گئی تھی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وما نرسل

المرسلین الا مبشرین ومنذرین۔ اور۔ اذ اخذ اللہ میثاق النبیین لما آتیتکم من کتاب و حکمۃ ثم جاءکم رسول مصدق لما معکم لتؤمنن بہ ولتنصرنہ قال ءاقررتم واخذتم علیٰ ذلکم اصری قالوا اقررنا قال فاشہدوا وانا معکم من الشاہدین۔

فصل۔ انبیاء (صلوات اللہ علیہم وسلامہ) کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے واضح اور قطعی دلیلوں کے ساتھ بھیجا تھا۔ ان سب حضرات نے اپنی تقریروں میں جو کچھ بھی بیان کیا یا جس امر کی تصریح کی اُسے ایسی مثالوں سے مزین کیا جو انسان کے ذہن سے بالکل قریب تھیں۔ جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے توراۃ کے پہلے پارہ میں حضرت موسیٰؑ کو حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ سُنایا، تو اُس میں یہ بھی فرمایا کہ جب آدمؑ جنت میں تھے تو عربی زبان میں گفتگو کیا کرتے تھے، مگر جب اُن کا ہبوط ہوا تو وہ عربی زبان بھول گئے اور سُریانی زبان بولنے لگے۔ جب اُن کو عربی زبان کے بھول جانے کا صدمہ ہوا تو اللہ نے اُنکے پاس وحی بھیجی کہ "اے آدم اس کا کچھ غم نہ کرو، کیونکہ یہ اہل جنت کی زبان ہے۔ تمھاری اولاد میں سے جو جنت میں داخل ہوں گے وہ یہی زبان بولیں گے، اور وہ لوگ یا تو جنت ہی میں سے ہونگے یا اہل جنت ہوں گے"۔

فصل۔ ایک اور امر جو آنحضرت صلعم کی نبوت کی دلیل ہے وہ توراۃ کے پہلے پارہ میں حضرت آدمؑ کے قصہ کے بعد ہی حضرت نوح علیہ السلام کے قصہ میں درج ہے ــــ کہ جب حضرت نوحؑ اپنی کشتی سے نکلے تو اُنھوں نے اس خوف سے اپنی ازواج سے کنارہ کشی اختیار کرلی کہ بادا اُنکی اولاد ایک اور طوفان میں غرق ہوجائے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے اُن پر وحی نازل کی کہ "اے نوحؑ، جاؤ اپنے اہل وعیال میں رہو، کیونکہ اب میں زمین کو ہلاک نہ کروں گا"۔ پھر اللہ نے اُنکو وہ کمان (قوس قزح؟) دکھائی جو بادلوں میں نمودار تھی، اور کہا کہ "دیکھو یہ میرا عہد ہے کہ اب میں زمین کو طوفان سے ہلاک نہ کروں گا"۔ پھر اللہ عزوجل نے اُن کو وہ تمام انبیاء دکھائے جو بعد میں آنے والے تھے، اور انھیں میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی تھے، اور کہا کہ "میں اِس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر سے کبھی زمین کو طوفان سے ہلاک نہ کروں گا"۔

فصل۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور اُنکی دعوت کے عموم کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ ابراہیم الخلیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قصہ میں پہلے ہی پارہ میں جہاں اُنکے آتش نمرود سے بچنے کا ذکر ہے وہاں کہا گیا ہے کہ تجلی الٰہی کا اُن پر ظہور ہوا، اور اللہ تعالیٰ نے اُن سے عبرانی زبان میں کہا قوم ھشت ھنرخ بادرص کالرکہ دلرحبہ کی لخا اتننا، جسکی تفسیر یہ ہے کہ "اُٹھو اور زمین کے طول وعرض

میں گھومو ۔ ہم تمھاری اولاد کو یہ (زمین) دیں گے"۔ جب حضرت ابراہیمؑ نے اپنا یہ خواب ــــ کیونکہ یہ ایک خواب ہی تھا ــــ حضرت سارہؑ سے بیان کیا، تو حضرت سارہؑ کو یقین ہو گیا کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے: اور اُنھوں نے حضرت ابراہیمؑ سے کہا کہ "ہاجرہؑ اور اُس کے بیٹے کو مجھ سے جدا کر دو"۔ کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت سارہؑ پر احسان کیا، اور اُن دونوں کو سرزمین حجاز کی طرف روانہ کر دیا۔ پھر اللہ جل جلالہ نے حضرت ابراہیمؑ کو مخاطب کر کے عبرانی میں کہا کہ کی بی اسحاق یقارے لخا زراع جسکے معنی یہ ہیں کہ اسحاقؑ سے تو تمھاری نسل چلیگی، مگر اسمٰعیلؑ کو ہم برکت دیں گے، اُس کو کثرت سے اولاد دینگے اور اُسے بہت بڑا آدمی بنا دینگے اور اُسکی اولاد کو ہم آسمان کے تاروں کی طرح بنا دینگے اور اُن ہی میں سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہوں گے۔ یہ آخری آیت عبرانی میں یوں ہے کہ ول یشماعل شمعتیخا هننی بیرختی اث وهفرتی اث وهرباتی اث بمادماد - عبرانی زبان کے علماء نے ان دونوں لفظوں ماذماذ کی تفسیریں کی ہے کہ اُن میں سے بعض تو کہتے ہیں کہ انکا مطلب احمد احمد ہے' بعض کا خیال ہے کہ ان سے مراد جدًّا جدًّا (بہت، بہت) ہے بعض کا قول ہے کہ اِنکے معنی عظیم عظیم کے ہیں۔ اور حق یہ ہے کہ حضرت اسمٰعیل کی اولاد میں سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑا کوئی نہیں پیدا ہوا۔

فصل - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ جب حضرت ہاجرہؑ سرزمین حجاز کو روانہ ہوئیں اور راستہ میں اُن کو پیاس معلوم ہوئی تو اُنھوں نے اپنے بچے کو اپنے کندھے پر سے اُتار کے پھینک دیا ــــ تو اس موقع پر تورات میں لکھا ہے کہ اللہ نے اُنکی مدد کے لیے ملائکہ بھیجے جنھوں نے وہیں ایک چشمہ جاری کر دیا۔ اُنھوں نے اُس چشمہ میں سے خود بھی پانی پیا اور اپنے بچے کو بھی پلایا، اور یہ کہ اللہ جل جلالہ نے اُن (حضرت ہاجرہ) سے خطاب فرمایا اور کہا کہ قومی سیی اث هناعر وهاحزیقی اث یاذیخ بو کی لغی کا ذل اسیمان جسکے معنی یہ ہیں کہ "اے ہاجرہؑ، اُٹھ۔ اس بچے کو حفاظت سے رکھ، کیونکہ اس بچے سے محمدؐ اور اُسکی اولاد آسمان کے تاروں کی طرح پھیلے گی"۔

فصل - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ تورات کے پہلے پارہ میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے قصہ میں لکھا ہے کہ جب اُنکی وفات کا وقت قریب آیا تو اُنھوں نے اپنی اولاد کو جمع کیا اور کہا کہ "میرے پاس آؤ۔ میں تم کو بتاؤں کہ آخر زمان میں کیا ہوگا"۔ جب وہ سب جمع ہو گئے تو اُنھوں نے اُن سے پوچھا کہ "تم میرے بعد کس کی پرستش کرو گے؟" اُنھوں نے

کہا کہ "ہم اُس خدائے واحد کی پرستش کریں گے جو تمھارا اور تمھارے آباء ابراہیم، اسمٰعیل اور اسحٰق کا خدا ہے" (نعبد الٰهك والٰه آبائك ابراهيم و اسمٰعيل و اسحٰق الٰهًا واحدًا)۔
مگر توریت میں اسکا ذکر کہیں نہیں پایا جاتا کہ حضرت یعقوب نے ان لوگوں سے کیا وعدہ کیا اور کیا بتایا۔ صرف اتنا لکھا ہے کہ اُنھوں نے اپنی اولاد کے لیے دعا کی اور وفات پائی۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نام توریت کی اس آیت میں سے نکال ڈالا ہے۔

فصل۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ توریت کے چوتھے پارہ میں بلغام بن باعوراء کے قصہ میں لکھا ہو کہ "دیکھو ستارہ دیکھو جو اسمٰعیل کی اولاد میں سے نمودار ہوا ہے جسکو عرب کی ایک جماعت نے مردودی ہے اور جسکے ظہور سے دنیا و مافیہا اور اسمٰعیل کی تمام نسل سوائے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہل گئی ہے"۔ اور ظاہر ہے کہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کے وقت زمین میں زلزلہ آیا تھا!

فصل۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ توریت کے پانچویں پارہ میں ایک صاف و واضح آیت درج ہے کہ اللہ نے حضرت موسیٰؑ سے کلام فرمایا اور کہا کہ "بنو اسرائیل سے عبرانی زبان میں کہدو کہ نابی اقیم لاهام مقارب احي خاموبني یشماعل جس کی تفسیر یہ ہے کہ ہم عنقریب تمھارے پاس ایک نبی بھیجیں گے جو تمھارا قریبی رشتہ دار ہوگا اور تمھارے بھائی اسمٰعیل کی اولاد میں سے ہوگا، اور میں اپنے قول کو اُسکے منہ سے ادا کراؤں گا۔" عبرانی زبان میں یہ یوں ہے کہ وتھتی دبارای بفیوا ملو یشماعو — میں اُسکے منہ سے اپنا قول ادا کراؤں گا، تم اُسی کی پیروی کرنا"۔

فصل۔ آں حضرتؐ کی نبوت اور اُن کی دعوت عام کے ہونے کی ایک دلیل یہ ہے کہ ایک اور صریح و صاف آیت جس نے توریت پر مُہر کردی ہے یہ ہے کہ مسینای بادمی اهراح مسًاعیو هیفیع ماهار باران و اثاماربيث قدش — جس کی تفسیر یہ ہے کہ اللہ سینا سے آیا، ساعیر سے لبند ہوا، فاران کی پہاڑیوں سے اُس نے اپنے آپ کو ظاہر کیا، اور اپنے قدسیوں کے گروہ میں دکھائی دیا کہ اُس کے داہنے روشنی (نور) اور بائیں آگ (نار) تھی: اُسی کے پاس تمام اُمتیں جمع ہوئیں، اور اُسی کی طرف تمام جماعتیں آئیں۔ اور عبرانی زبان کے علما کا اسپر اتفاق ہے کہ فاران کی پہاڑیوں سے مکہ کی پہاڑیاں مراد ہیں اور "اُس کے قدسیوں کے گروہ" سے اہل خانۂ کعبہ۔ اور ظاہر ہے کہ وہاں سے صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوا!

فصل۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ نے عمالقہ سے جنگ کی اور اس میں بنو اسرائیل کو شکست ہوئی تو حضرت موسیٰؑ نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے زاری کی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت پیش کرتے ہوئے عبرانی زبان میں یوں کہا کہ ترخما لاعبد اخالابراهام وليشماعل —— جسکی تفسیر یہ ہے کہ "(اے اللہ) اپنے اس عہد کو یاد کر جو ابراہیمؑ سے کیا تھا کہ تو اولادِ اسمٰعیل کی مدد کرے گا اور مومنوں کے لشکروں کو فتحمند کرے گا!" تب اللہ نے انکی دعا کو قبول کیا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی برکات سے بنو اسرائیل کو عمالقہ پر فتح دی۔

فصل۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ کے خلیفہ حضرت یوشعؑ نے شام کو فتح کرنیکے بعد عمالقہ سے جنگ کی، مگر چونکہ حضرت یوشعؑ کے لشکریوں نے اپنے عہد میں خیانت کی اور ان میں سے ایک شخص نے عمالقہ کے مال غنیمت میں سے ایک سنہری صلیب چھپالی تھی، اس لیے اُن کے لشکر کو شکست ہوئی —— اور صرف ایک مرتبہ نہیں بلکہ اسی صلیب کی خیانت کی وجہ سے تین مرتبہ شکست ہوئی —— تو حضرت یوشعؑ نے اللہ تعالیٰ کی جناب میں زاری کی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اقتداء کرتے ہوئے، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت پیش کی، تو اللہ نے اُن کی دعا کو قبول کیا اور انھیں فتح دی: پھر اللہ نے حضرت یوشعؑ پر وحی نازل کی کہ "بنو اسرائیل نے مال غنیمت میں خورد برد کرکے میرے عہد کی خیانت کی ہے" کیونکہ مال غنیمت اُن کے لیے حرام تھا۔ اس پر حضرت یوشعؑ نے اپنی فوج کی تلاشی لی تو اُن میں سے ایک شخص کے پاس سنہری صلیب نکلی۔ حضرت یوشعؑ نے اُسے قتل کردیا —— اور عمالقہ پر فتحیاب ہوئے۔

فصل۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی زبور میں لکھا ہے کہ "خوشخبری ہو تمھیں اے بنو اسرائیل، خوشخبری ہو، کہ عنقریب تم میں سے ایک نبی مبعوث ہوگا، جس کا ہاتھ تمام امتوں پر فائق ہوگا، اور سب اُمتیں اُسکے دستِ قدرت کی ماتحت ہونگی"۔ اسی طرح تورات کے پہلے پارہ میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے قصہ میں عبرانی زبان میں لکھا ہے کہ اللہ نے حضرت ابراہیمؑ سے وعدہ کیا کہ اُنکے بیٹے اسمٰعیلؑ کا ہاتھ تمام امتوں پر فائق ہوگا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا قول یہ ہے کہ یاذ بکل ویاذ کال بودعل بناخل اخویشکن —— جسکے معنی یہ ہیں کہ اُسکا ہاتھ سب امتوں پر فائق ہوگا، اور ہر امت اُسکے ہاتھ کے ماتحت ہوگی، اور یہ کہ وہ اپنی برادری کے ہر فرد کے گھر میں رہے گا۔ مگر یہ مشہور بات ہے کہ حضرت اسمٰعیل کو کبھی کوئی بادشاہت نہیں ملی اور نہ اُن کا ہاتھ اپنے بھائی بندوں پر فوقیت رکھتا تھا، اور نہ وہ کبھی شام کو گئے نہ وہاں رہے۔ نیز واقعات سوا

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کسی کو پیش نہیں آئے، اور ان ہی کی امت کے لوگ ہیں کہ جو مصر اور شام میں بنو اسرائیل کے گھروں میں آباد ہیں۔ اور یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایک قطعی دلیل ہے۔

فصل:- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی زبور میں یہ آیت ہے کہ "اے لوگو اللہ کی تعظیم کرو، اور اے زمین کے ساکنو اُس کی توحید کا اقرار کرو کہ عنقریب تمہارے پاس ایک رحمت کا نبی بھیجا جائے گا"۔

فصل۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ حضرت یسعیاہؑ نبی کے صحیفہ میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان عبرانی زبان میں لکھا ہوا ہے کہ شمعو شامایم و ھا ارض۔ اس کی تفسیر یہ ہے کہ "اے آسمانو سنو! اور اے زمین! تو قرار پکڑ اور ساکن ہو جا کیوں کہ بیتی ہے؟ وہ تیرے پاس ایک نبی کو بھیجے گا: اُس کی شفاعت سے تو اُس کے رحم کی التجا کر"۔ خوب سمجھ لو کہ اللہ نے حضرت موسیٰؑ علیہ السلام کے بعد جو بیس انبیاء بھیجے جن میں سب سے پہلے حضرت یوشعؑ تھے اور سب سے آخری زکریاؑ تھے، جن کو ایک آرے سے چیر دیا گیا تھا۔ ان میں سے ہر ایک نبی کو عبرانی زبان میں ایک صحیفہ عطا ہوا تھا جس میں گذشتہ اور آئندہ زمانوں کی خبریں لکھی ہوئی تھیں: اور وہ سب کچھ اللہ عزوجل کی طرف سے تھا۔

فصل:- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ حضرت الیاس علیہ السلام کے صحیفوں میں لکھا ہے کہ جب وہ اپنی سیاحت کو نکلے تو ان کے ہمراہ ستر آدمی تھے۔ جب انھوں نے سرزمین حجاز میں اہل عرب کو دیکھا تو اپنے ہمراہیوں سے کہا کہ "دیکھو یہی وہ لوگ ہیں جو تمہارے قلعوں پر قابض ہو جائیں گے!" انھوں نے کہا "اے اللہ کے نبی، ان لوگوں کا معبود کون ہوگا؟" حضرت الیاس علیہ السلام نے عبرانی زبان میں فرمایا کہ یا سیمو لا دنای کا ین و تحلاث با تیہم یکیہ۔ اس قول کی تفسیر یہ ہے کہ "یہ لوگ ہر منبر پر سے اللہ تبارک و تعالیٰ کی توحید کا ڈنکا بجائیں گے"۔ ان کے تابعین نے پوچھا کہ "اے اللہ کے نبی، ان لوگوں کو یہ تعلیم کون دیگا؟" آپؑ نے عبرانی زبان میں یہ جواب دیا کہ بان نو للذ بعن ایشما س یو شیا ھو فمو، جس کے معنی یہ ہیں کہ اسمٰعیلؑ کی اولاد میں ایک بچہ پیدا ہوگا، جس کا نام اللہ کے نام سے ملا ہوا (مقرون) ہوگا۔ جب اللہ کا نام لیا جائیگا تو اُس کا نام ضرور لیا جائے گا۔ اور سوا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسا کسی کے ساتھ نہیں ہوا۔

فصل۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ثبوت میں ایک یہ واقعہ بھی ہے کہ بنو اسرائیل

کے بادشاہوں میں احاب نام ایک بادشاہ تھا۔ وہ بڑا ظالم تھا اور انبیاء کو قتل کیا کرتا تھا۔ اُس نے حضرت موسیٰؑ کے اللہ سے کفر کیا۔ بُت بنا بنا کے اُنکی پوجا کرتا، اور ایک مذبح بنایا جسپر بتوں کے نام سے قربانیاں چڑھاتا تھا۔ تب اللہ نے میخا نام ایک نبی کو اُسکے پاس بھیجا، جس نے پکار کر کہا کہ "اے مذبح، اے مذبح، اللہ تعالیٰ تیرے لیے ایک نبی کو بھیجے گا یوشیا ھو شمو — یعنی اس کا نام اللہ تعالیٰ کے نام سے مقرون ہے — اُسکے نام کی برکت سے زمین سے کفر کا نام مٹ جائے گا۔ اور میرے اس قول کا ثبوت یہ ہے کہ اے مذبح! تو شق ہو جائیگا! چنانچہ یہی ہوا کہ ابھی میخا نبی کا کلام بمشکل پورا ہونے پایا تھا کہ وہ مذبح شق ہو گیا اور اُس کی ساری راکھ زمین پر بکھر گئی۔ اُس بادشاہ نے نبی کو قتل کرنا چاہا، مگر اُس ظالم کا ہاتھ ہی سوکھ گیا!

فصل - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے بادشاہوں میں منشا نام ایک بادشاہ تھا جو حضرت سیعیاہؑ نبی کا پوتا تھا۔ منشا بعثت کا فر ہو گیا اور بتوں کی پوجا میں لگ گیا۔ ایک مرتبہ وہ کسی بادشاہ سے جنگ کرنے کو باہر نکلا مگر جنگ میں اُس بادشاہ کو اُس پر فتح حاصل ہوئی، اور اُسے منشا کے پاس سے ایک بت ملا جو تانبہ کا بنا ہوا تھا اور اندر سے کھوکھلا تھا اور منشا اُس کو پوجا کرتا تھا۔ اُس بادشاہ نے منشا کو گرفتار کر کے اُس بُت کے پیٹ میں رکھ دیا اور اُسکے نیچے آگ جلا دی۔ تب تو منشا سب بتوں کے نام لے لے کر آہ و زاری کرنے لگا: مگر کوئی بت اُس کی دستگیری نہ کر سکا۔ جب ہوتے ہوتے آگ اُسکے دل تک پہونچی، تو اُس نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے سامنے گڑگڑانا شروع کیا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا شفیع بنایا — جیسا کہ خود اُسکے دادا حضرت شعیاہؑ علیہ السلام نے کیا تھا۔ تب جناب اللہ نے اُسے پناہ دی۔ ملائکہ کو اُسکی مدد کے لیے بھیجا، اُسے بت سے نجات دی، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی برکات سے اُسے اُسکے دشمن پر فتحیاب کیا، اُسکا ملک اُسے واپس عطا فرمایا، اور اُسکی توبہ قبول فرمائی۔

فصل - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ بنو اسرائیل کے انبیا میں سے ایک نبی تھا جسکا نام تھا عوبدیا ھو — یعنی عبداللہ۔ ایک مرتبہ وہ اپنے سفر میں تھے کہ سرزمین حجاز میں اُنکو یہودیوں سے سابقہ ہوا۔ اُن لوگوں نے انکی ضیافت کی۔ اس اثنا میں وہ بہت شدت سے رونے لگے۔ یہودیوں نے سوال کیا کہ "اے اللہ کے نبی! آپ کیوں روتے ہیں؟" انھوں نے جواب دیا کہ "اللہ عرب میں سے ایک نبی بھیجے گا:

ملائکہ اُسکی مدد کریں گے ، وہ تمھارے شہروں کو خراب و برباد کردے گا، تمھاری عورتوں کو گرفتار کرے گا اور تمھارے بچوں کو یتیم کردے گا۔" یہودیوں نے اُسکو قتل کرنا چاہا، مگر وہ وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

معلوم رہے کہ جب حضرت موسٰی علیہ السلام کے لیے سمندر پھٹ گیا اور فرعون مع اپنے لشکر کے غرق ہوگیا اور بنو اسرائیل سمندر کے اُس پار پہونچ گئے، تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے کوہ طور کی ایک جانب سے حضرت موسٰیؑ پر تجلی فرمائی اور فرمایا کہ "اے موسٰی! بنو اسرائیل سے کہدو کہ وہ اپنے کپڑوں کو دھوڈالیں، اپنے جسموں کو پاک وصاف کرلیں اور تین دن کے لیے اپنی عورتوں سے کنارہ کش ہو جائیں، کیونکہ میں اُن پر اپنی تجلی ظاہر کروں گا۔" چنانچہ تیسرے دن صبح کو یہ ہوا کہ اچانک زمین ہلنے لگی اور پہاڑ سرنگوں ہوگئے، اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے تجلی فرمائی اور عبرانی زبان میں فرمایا کہ ان شی اذنای الھاخا اشار ھصیتی خاما ارص مصرایم یعنی یہ کہ: میں اللہ ہوں، میں وہی تیرا معبود ہوں جسنے تجھے مصر سے غلامی دیکر نکالا۔ خبردار ... کسی دوسرے معبود کی عبادت نہ کرنا، میں غیور ہوں! یہ سُن کر سب بنو اسرائیل مرگئے، اور اللہ نے پھر اُن سب کو زندہ کردیا، تب اُنھوں نے کہا کہ "اے موسٰی! اللہ کا کلام سنو، اور ہمیں بتاؤ، کیونکہ ہم اللہ کا کلام نہیں سُن سکتے: ایسا نہ ہو کہ ہم مرجائیں۔" اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اُن سے چھتیس عہدوں کا ایک عہدنامہ کیا، جس میں یہ بھی تھا کہ وہ اپنے دادا ابراہیم علیہ السلام کی سنّت پر کاربند ہوں گے اور بُت یا صلیب یا کوئی مورت نہ بنائیں گے۔ جب بنو اسرائیل نے اس عہدنامہ کو قبول کرلیا، تو زمین ساکن ہوگئی اور پہاڑ پھر سیدھا ہوگیا۔ تب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے حضرت موسٰیؑ کو حکم دیا کہ بنو اسرائیل سے کہدیں کہ وہ اپنے اہل وعیال کی طرف واپس چلے جائیں: پھر حضرت موسٰیؑ کو اور قریب ہونے کا حکم دیا۔ چنانچہ حضرت موسٰیؑ چالیس دن تک پہاڑ میں رہے، اور اللہ نے اُن کو لوحیں عطا فرمائیں۔ پہلی لوح میں لکھا تھا کہ "میں اللہ تیرا رب ہوں" ۔۔۔ اور دوسری میں لکھا تھا کہ "میرے سوا کسی اور معبود کی عبادت نہ کرو۔" اسی طرح باقی لوحوں میں بھی باقی دس کلمے لکھے تھے۔ اور توراۃ میں لکھا ہے کہ یہ لوحیں اللہ کی صنعت ہیں، اور کتاب اللہ کی کتاب ہے۔ غرضکہ جب حضرت موسٰی الواح کو ہاتھ میں لیے ہوئے پہاڑ سے اُترے تو (اپنی قوم میں آکے) دیکھا کہ وہ لوگ ایک سُنہری بچھڑے کی پرستش میں لگے ہوئے ہیں (یہ دیکھ کر) اُنھوں نے اُن الواح کو زمین پر پٹک دیا۔ زمین پھٹ گئی اور

اُن الواح کو نگل لیا۔ پھر حضرت موسیٰؑ نے تمام گوسالہ پرست اسرائیلیوں کو قتل کرا دیا۔

فصل۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ جب حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے بھائی عیص سے جان بچا کے بھاگے پھر رہے تھے، تو اُنھوں نے ایک مرتبہ خواب میں دیکھا کہ جیسے زمین سے آسمان تک ایک زینہ لگا ہوا ہے جس میں پانچ سیڑھیاں ہیں: ایک بہت بڑی قوم اُن سیڑھیوں پر چڑھتی چلی جاتی ہے اور ملائکہ برابر مدد کر رہے ہیں، ہوتے ہوتے آسمان کے دروازے کھلے، اور اللہ تعالیٰ نے تجلی فرمائی اور حضرت یعقوبؑ سے کہا کہ "ڈرو نہیں، میں تمھارے ساتھ ہوں: دیکھتا اور سنتا ہوں۔ کہو کیا چاہتے ہو؟" اُنھوں نے کہا کہ "یا رب! یہ لوگ جو سیڑھیوں پر چڑھ رہے ہیں کون ہیں؟" اللہ نے جواب دیا کہ "یہ اسمٰعیل کی اولاد ہے"۔ پوچھا "یہ تیرے پاس کس طرح پہونچ سکئے؟" اللہ نے کہا "اُن پانچ نمازوں کے ذریعے، جو میں نے ان پر دن رات میں فرض کی تھیں، اُن لوگوں نے اُن کو قبول کیا اور اُن پر عمل کیا"۔ جب حضرت یعقوب جاگے تو اُنھوں نے اپنی اولاد پر پانچ نمازیں فرض قرار دیدیں: حالانکہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے توراۃ میں بنو اسرائیل پر نماز فرض نہیں کی تھی، بلکہ صرف قربانیاں فرض کی تھیں، جو وہ گذرانتے تھے۔ یہ قصہ توراۃ کے پہلے پارے میں حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ و اسحٰقؑ کے قصوں کے بعد درج ہے۔ چنانچہ بنو اسرائیل اور اُنکے علماء اپنے دادا حضرت یعقوب علیہ السلام کی سنت کی پیروی میں برابر پانچ نمازیں ادا کرتے ہیں، اور بنو اسرائیل کے انبیاء علیہم السلام برابر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کی خوشخبری دیتے اور اُن کی حیات کی قسم کھاتے رہے ہیں: اور ہمیشہ اس بات کی تمنا کرتے رہے ہیں کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہوتے اور جب یہ تمام غیب کے امور اُن پر منکشف ہوتے تو وہ آنحضرت کی امت کو فرشتوں کی طرح قطار در قطار دیکھتے! علاوہ اس کے حضرت سموئیل علیہ السلام نے اس بارے میں یہ مثل بیان کی ہے کہ

وفاس اوا ذب ترعاونامار عحد کذی یرباص — یعنی یہ کہ شیر اور بھیڑیا ایک ہی چراگاہ میں جمع ہوتے ہیں اور شیر بکری ایک ہی جگہ میں رہتے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ نماز کی صفوں میں بادشاہ اور فقیر برابر ہو جاتے ہیں۔ بنو اسرائیل کے علماء اور انبیاء نے اُن کی نمازوں کو مرتب کیا ہے، اور اُن میں اللہ تعالیٰ سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے زاری کی ہے اور یہ تمنا ظاہر کی ہے کہ وہ آنحضرتؐ کا زمانہ دیکھتے!

فصل۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ حضرت حزقیل علیہ السلام

کے مصحف میں لکھا ہے کہ اللہ نے انکی زبان سے عبرانی زبان میں یوں کہا ہے کہ ھن عبدی اث
میحت بحیری رضت نفشی علو نتتی روحی بو مشاباط للکییم یوصی ۔ یعنی یہ کہ میرا برگزیدہ
بندہ میرے حبیب کا بیٹا ہے، میں نے اسکو انتخاب کیا ہے اور اسے سچے احکام دیکر اقوام
کی طرف بھیجا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کے قول "میرا بندہ" کے مخاطب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم
ہیں جنکو عبودیت کے ساتھ خطاب کیا گیا ہے۔ اب رہا قول الٰہی "میرا حبیب": تو اللہ سبحانہ نے
توراۃ میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کو "حبیب" فرمایا ہے، اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے
حضرت ابراہیمؑ سے عبرانی زبان میں یوں فرمایا تھا کہ قاح اث بنحا ... یحیدخا اشار اھاب،
جسکی تفسیر یہ ہے کہ اپنے اس اکلوتے بیٹے کو جو میرا حبیب ہے اور اسے میرے لیے قربان کردو۔
اس آیت کی دلالت یہ ہے کہ تورات کی نص سے معلوم ہوتا ہے کہ "ذبیح" حضرت اسمٰعیل علیہ السلام
ہی ہیں، کیونکہ حضرت ابراہیم کے اکلوتے بیٹے اسمٰعیلؑ ہی تھے، اور اس واقعہ کے بعد فرشتوں نے
انکو حضرت اسحٰق علیہ السلام کی ولادت کی خوشخبری دی تھی۔ علاوہ اسکے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام
سوا حضرت اسمٰعیلؑ کے اور کسی سے اتنی محبت نہیں رکھتے تھے۔

فصل - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی ایک اور دلیل اُس وقت ظاہر ہوئی
جب حضرت مسیح ابن مریم علیہ السلام مبعوث ہوئے۔ انکی بعثت دوسرے بیت کے زمانہ میں
ہوئی تھی، کیونکہ پہلا بیت بیت المقدس تھا، جسے حضرت سلیمان بن داود علیہما السلام نے
بنایا تھا۔ مگر اسے بخت نصر نے خراب وتباہ کردیا تھا۔ تو اس طرح بیت اول کی بربادی کے بعد
سے ستر برس تک نبوت کا سلسلہ منقطع رہا۔ اسکے بعد کورش نام کے ایک بادشاہ نے
اسے دوبارہ آباد کیا، اور چار سو اسی (۴۸۰) سال تک آباد رہا۔ یہی زمانہ تھا کہ جس میں
حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ افضل الصلوٰۃ والسلام کا ظہور ہوا۔ وہ حکیموں اور فلسفیوں کا زمانہ
تھا۔ ان دنوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اندھوں اور کوڑھیوں کو اچھا کر دیتے تھے، اللہ کے
حکم سے مُردوں کو زندہ کر دیتے تھے، اور مٹی سے پرندوں کی سی صورتیں بناتے تھے۔ اس پر
بنو اسرائیل کے علماء نے ایک مجلس قائم کی، اور ان میں سے ایک عالم نے جس کا نام
شمعون بلقیش تھا، کھڑے ہوکے کہا کہ "نہ ہم تجھ پر ایمان لاتے ہیں، نہ تیرے دعووں کو تسلیم
کرتے ہیں اور نہ تیری لائی ہوئی (کتاب) کو قبول کرتے ہیں، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ہم کو
اپنی شریعت میں اللہ عزوجل کی جانب سے یہ خبر دی ہے کہ جو نبی آخری زمانہ میں مبعوث ہوگا وہ

اسمٰعیل کی اولاد سے ہوگا، مگر تو اسرائیل کی اولاد میں سے ہے۔ تورات میں اللہ تعالیٰ کا یہ قول کہ
ولا قام نبی عند بنیہ اسرائیل کمثل موسیٰ یعنی لکھا ہے کہ بنو اسرائیل میں موسیٰ کا مثیل پیدا نہ ہوگا" یہ
اُن لوگوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کا فتویٰ دیا اور اپنے اور نصاریٰ کے زعم
میں اُنکو قتل بھی کر دیا، اور اس طرح اُن سے کفر کیا۔ مگر نصاریٰ کا حضرت مسیح سے کفر کرنا یہود کے
کے اُن سے کفر کرنے سے زیادہ سخت ہے، کیونکہ ان لوگوں (نصاریٰ) کا عقیدہ یہ ہے کہ جن
ہاتھوں میں میخیں ٹھونکی گئی ہیں اُن ہی ہاتھوں سے آسمان اور زمین پیدا کیے گئے
ہیں۔ اور اس سے بڑھ کر اور کوئی کفر نہیں ہو سکتا۔ یہی نہیں، بلکہ نصاریٰ اپنے گرجوں
میں حضرت عیسیٰؑ کی ایسی مورتیں بناتے ہیں کہ وہ مصلوب ہیں۔ اُن کے ہاتھوں میں میخیں گڑی ہوئی
ہیں، اور یہودی لٹکے اُن پر تھوک برسا رہے ہیں!

یہ جانے رکھنا چاہیے کہ نصرانی ملت نے کبھی حضرت مسیح علیہ السلام کی سنت یا شریعت
کی پیروی نہیں کی، بلکہ وہ ان کافر اسرائیلی بادشاہوں کی سنتوں پر چلتے رہے جنھوں نے
اللہ کے عہدوں کو توڑا اور اپنے عبادت خانوں میں مورتیں اور تصویریں بنا بنا کر رکھیں — اور
یہی سبب تھا بنی اسرائیل کی حکومت کی تباہی کا: کیونکہ صرف ایک مورت کی وجہ سے جو حضرت سلیمان
بن داؤدؑ کے گھر میں بنائی گئی تھی، گو اُنکو خود اسکا علم نہ تھا، اللہ نے اُن سے اُنکی حکومت چھین
لی تھی۔ اسی طرح صرف ایک صلیب کے سبب سے حضرت موسیٰؑ کے خلیفہ حضرت یوشعؑ کی
فوج کو تین مرتبہ شکست کھانی پڑی تھی۔ لیکن حق یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے ان لوگوں
کو کبھی یہ حکم نہیں دیا تھا کہ مورتیں اور صلیب بنایا کریں، حالانکہ یہ لوگ اپنی اُن انجیلوں میں جو
متی، لوقا، مرقس اور یوحنا سے منسوب ہیں، حضرت مسیحؑ سے یہ نقل کرتے ہیں کہ اُنھوں نے اپنی
قوم کے لیے مُردار، اور خون اور خنزیر کا گوشت حلال کر دیا تھا۔ حاشا کہ حضرت مسیحؑ نے ہرگز ایسا
نہیں کیا، کیونکہ خود اُن ہی کا یہ قول ہے کہ "میں موسیٰؑ کی شریعت کو باطل کرنے کیلیے نہیں آیا بلکہ
اُسکی تکمیل کے لیے آیا ہوں"۔ اور حضرت موسیٰؑ کی شریعت نے مُردار، خون اور خنزیر کا گوشت
حرام کر دیا تھا۔ اسی طرح ان لوگوں نے اپنی انجیلوں میں حضرت مسیحؑ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے
کہ اُنھوں نے اپنی امت کے لیے ختان کو حرام قرار دیدیا تھا — حالانکہ ختان تمام نبیوں
کی سنت ہے، خصوصاً حضرت ابراہیمؑ کی سنت ہے، اور توراۃ میں بنو اسرائیل پر فرض کیگئی
ہے۔ اور یہ اس امر کی دلیل ہے کہ ان لوگوں نے اُس انجیل کو جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام

لائے تھے، بدل ڈالا ہے!

فصل۔ اللہ تمھیں نیک توفیق دے، یہ بھی جانے رکھو کہ میں نے چاروں انجیلوں کا مطالعہ کیا ہے، اور ایک نہیں کئی مرتبہ کیا ہے؛ مگر میں نے اُن میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر بالکل کہیں نہیں پڑھا، جس طرح کہ تورات اور انبیاء کے اور صحیفوں میں اُنکا ذکر ہے۔ اور یہ بھی اسکی ایک دلیل ہے کہ نصاریٰ نے اُس انجیل کو بدل ڈالا ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام لائے تھے!

فصل۔ اور یہ بھی سمجھے رہو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تیہ کے بیابان میں چالیس سال تک اقامت فرمائی تھی۔ اُن کو مصر سے چلے ہوے اُنتالیسواں سال تھا کہ اللہ نے حضرت موسیٰؑ سے کلام فرمایا، اور اُن کو حکم فرمایا کہ وہ بنو اسرائیل کے سرداروں میں سے ستّر آدمیوں کو ہمراہ لیکر پہاڑ پر جائیں۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ نے ایسا ہی کیا: اُنھوں نے بنو اسرائیل کے نقیبوں اور اُنکے قبیلوں کے سرداروں میں سے آدمی جمع کیے، اور سب کو ہمراہ لیکر سینا کے پہاڑ پر تشریف لے گئے۔ وہاں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ پر اپنی تجلی ظاہر فرمائی کہ جو پہلے سے بھی زیادہ زبردست تھی۔ اُس دن ہر طرف زلزلے آئے، بجلیاں کڑکیں، گرج اور کڑک ہوئی، گرہن لگے — غرض کہ ہر جگہ سخت خوف طاری ہوگیا اور تمام دنیا کی قومیں کانپ اُٹھیں۔ اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ سے کلام فرمایا کہ اے موسیٰ بنو اسرائیل سے کہدو کہ ارورھا ایش اشار یعسا پاسل ومَسّی خا — یعنی، لعنت ہے اُس پر جو صلیب یا مورت بنائے۔ لعنت ہے اُس پر جو اُن کی پوجا کرے، اور لعنت ہے اُس پر جو لوگوں کو ایسا کرنے کی اجازت دے! اللہ تبارک وتعالیٰ حضرت موسیٰؑ کو مخاطب فرمارہا تھا، اور تمام بنو اسرائیل سُن سُن کر آمین کہتے جاتے تھے۔ حضرت موسیٰؑ نے اُس پہاڑ پر چالیس دن تک قیام کیا۔ جو لوحیں اُنھوں نے پھینکدی تھیں وہ اُن پر پھر نازل ہوئیں؛ اور اُن میں دس احکام لکھے ہوے تھے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اُن الواح کو اپنے ہاتھوں میں لیے ہوے اُترے تو کسی کو اتنی ہمت نہ ہوتی تھی کہ اُنکو نگاہ بھر کر دیکھے، کیونکہ اللہ نے اُنکو حکم دیا تھا کہ وہ اپنے چہرہ پر نقاب ڈال لیں اور الواح کو تابوت سکینہ میں رکھ دیں۔ انھوں نے الواح کے ساتھ ہی اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا تورات کا ایک نسخہ بھی رکھ دیا؛ کیونکہ اللہ نے اُن کو حکم دیا تھا کہ (اسکے بعد) وہ اپنی وفات کے لیے پہاڑ پر چلے جائیں۔

فصل۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ جب حضرت موسیٰ

علیہ السلام اپنی وفات کے لیے پہاڑ پر گئے تو اُنھوں نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے یہ خواہش ظاہر کی کہ اُن کو قیامت کے دن تک کی تمام اُمتیں دکھادی جائیں۔ چنانچہ جب اُنھوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کی اُمت کو دیکھا تو توراۃ میں یہ آیت نازل ہوئی کہ اذنای مسینای یا دنزاراح مساعیر هفیع میهار بارن واث ما دبث قدش۔ اس کی تفسیر یہ ہے کہ اللہ سینا سے آیا، ساعیر سے چمکا، اور فاران کے پہاڑوں سے بلند ہوا اسطرح کہ اُسکے ہمراہ اُسکے قدسیوں کا گروہ تھا: اُسکے داہنے ہاتھ کی طرف روشنی (نور) تھی اور بائیں ہاتھ کی طرف آگ (نار)، اُمتیں اکٹھی ہوکر اُسکی طرف آتی تھیں اور قبیلے اُسی کی طرف آتے تھے! بنو اسرائیل کے علماء میں سے جن لوگوں نے توراۃ کی شرح کی ہے، اُنھوں نے اس آیت کی شرح اور تفسیر یوں بیان کی ہے کہ آگ (نار) محمدؐ کی قاہر تلوار ہے اور روشنی (نور) اُنکی ہدایت دینے والی شریعت ہے! صلی اللہ علیہ وسلم۔

فصل۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں فرمایا ہے کہ واذ قال موسیٰ لقومہ یا قوم اذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ جعل فیکم انبیاء وجعلکم ملوکا وآتاکم ما لم یؤت احدا من العالمین یا قوم ادخلوا الارض المقدسۃ التی کتب اللہ لکم ولا ترتدوا علی ادبارکم فتنقلبوا خاسرین۔ چنانچہ جب بنو اسرائیل ملک شام میں پہنچے تو اُن کے انبیاء ہی اُنکے بادشاہ ہوتے تھے، (مثلاً) یوشع، داؤد، اور سلیمان۔ مگر سلیمانؑ کے بیٹے کی حکومت کے زمانہ میں بنواسرائیل کی حکومت ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی۔ وہ لوگ کافر ہوگئے، انبیاء کو قتل کیا، اور اللہ کے عہدوں کو توڑ ڈالا۔ ان کے کفر کا سبب اُن کا ایک بادشاہ تھا، جس کا نام یُرُبعام تھا: اور وہ سخت ظالم اور فلسفی بھی تھا۔ ایک دن حضرت خضر علیہ السلام بھی اُسکے دربار میں موجود تھے۔ اُنھوں نے اُسے یہ کہتے سنا کہ حضرت موسیٰؑ نے اپنی شریعت میں یہ کہا ہے کہ "اگر تم اللہ کے عہدوں کو توڑوگے تو آسمان پانی کو برسنے سے روک دیں گے اور مینہ نہ برسے گا اور زمین نباتات کو اُگنے سے روک دیگی اور نباتات پیدا نہ ہوں گے"۔ یہ سُن کر حضرت خضر علیہ السلام اُٹھ کھڑے ہوئے اور کہا کہ حی اذنای امریاش طال وماطار کی ام لفی دباری یعنی یہ کہ "قسم ہے اللہ کی قدرت و طاقت کی کہ شبنم اور بارش نہیں اُتریں گے مگر اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے!" اُس بادشاہ نے ارادہ کیا کہ حضرت خضرؑ کو قتل کرے۔ مگر اللہ نے اُن کو اُس سے چھپا دیا۔ مگر وہی ہوا کہ شبنم اور بارش تین سال تک بالکل بند رہی، اور لوگ اس سبب سے مرنے لگے۔ اسکے بعد (پھر ایک دفعہ) حضرت خضر علیہ السلام اُس بادشاہ کے دربار میں پہنچے، اور اُس سے کہا کہ (اپنے) کاہنوں اور

[illegible] کو بلاؤ۔ چنانچہ چار سو (۴۰۰) آدمی جمع ہو گئے۔ پھر حضرت خضر علیہ السلام نے بادشاہ سے کہا کہ اپنی گاؤں میں سے دو بچھڑے ہم کو دے دو۔ اور جب بچھڑے آ گئے تو کاہنوں سے کہا کہ "تم لوگ ان میں سے ایک بچھڑا لے لو اور اُسے ذبح کر کے آپ دیوتاؤں کو پکارو۔ میں بھی دوسرے بچھڑے کے ساتھ ایسا ہی کروں گا اور اپنے رب کو پکاروں گا، اور تم اپنے دیوتاؤں کو پکارو۔ تو ہم دونوں کے خداؤں میں سے جس کی آگ آ کر بچھڑے کو کھا لے وہی معبود ہو گا، اور ہم سب اُسی کی پرستش کریں گے"۔ چنانچہ اُن سب کاہنوں نے اپنا بچھڑا ذبح کیا، اور اُس پر ایندھن لگا کے اپنے دیوتاؤں کو پکارا، مگر اُن دیوتاؤں نے اُنکی مدد نہیں کی۔ تب تو حضرت خضر علیہ السلام نے اُن سے مذاق کرنا شروع کیا کہ "شاید تم اپنے دیوتاؤں کو ہوشیار کر دو: ایسا نہ ہو کہ وہ سو جائیں اور تم کو بھول کے اپنی سیر و سیاحت میں لگ جائیں۔ ہاں ذرا اُنکو زور زور سے پکارو۔ ممکن ہے کہ تمھاری آواز سن لیں!" پھر حضرت خضر علیہ السلام نے اپنا بچھڑا لیا، اُسے ذبح کر کے ایک گڑھے میں رکھ دیا، اور ایندھن کے عوض اُسکے پاس کچھ پانی رکھ کے اپنا ہاتھ پھیلا کر کہا کہ [illegible] یعنی یہ کہ یا اللہ آج میری مدد کر، تاکہ معلوم ہو جائے کہ تو ہی ایک معبود ہے اور تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے! ابھی اُنکی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ آگ اُتری اور اُس نے بچھڑے کو کھا لیا اور پانی پی لیا! یہ دیکھ کر بنو اسرائیل سجدے میں گر پڑے اور کہنے لگے کہ "ہمارا معبود اللہ ہے، اُسکے سوا کوئی اور معبود نہیں ہے"۔ تب حضرت خضرؑ نے اُن سب کاہنوں کو اپنے ہاتھ سے اُس گڑھے کے پاس قتل کر دیا ——— اور مینہ برسنے لگا۔ مگر پھر بھی وہ بادشاہ اپنے کفر سے باز نہ آیا، بلکہ حضرت خضر علیہ السلام کے قتل کے درپے ہو گیا۔ مگر اللہ نے اُنکو اُس سے چھپا دیا!

فصل۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی ایک اور دلیل یعنی کہ بیت المقدس کی تباہی کے [illegible]

جب بادشاہ بخت نصر اپنے ملک کو واپس آیا تو اُس نے خواب میں ایک بُت دیکھا جسکے دونوں پاؤں زمین میں تھے اور سر آسمان میں تھا۔ اُس بت کا سر سونے کا تھا، سینہ اور بازیں چاندی کی، پیٹ تانبے کا، دونوں رانیں لوہے کی اور دونوں پاؤں ٹھیکرے کے تھے۔ پھر اُس نے دیکھا کہ آسمان پھٹا اور اُس میں سے ایک فرشتہ ہاتھ میں تلوار لیے ہوئے نمودار ہوا اور اُس نے اُس بُت کے سنہرے سر کو کاٹ کے پھینک دیا۔ وہ بُت گر کے ٹوٹ گیا، اور اُسکے پاؤں اُسکے سارے بدن سے اونچے ہو گئے۔ جب آنکھ کھلی تو بخت نصر نے اپنے وزیر حضرت دانیال علیہ السلام کو بلایا اور اپنا خواب

اُن سے بیان کیا۔ حضرت دانیال علیہ السلام نے کہا کہ اے بادشاہ وہ سنہرا سر تو آپ ہی ہیں چاندی آپ کی اولاد ہے جو آپ کے بعد بادشاہ ہوں گے۔ تانبا وہ بادشاہ ہیں جو آپ کی اولاد کے بعد حکمراں ہوں گے، جن میں سے کسریٰ اور قیصر وغیرہ نام کے رومی بادشاہ ہوں گے۔ اور ٹھیکرے وہ بادشاہ ہیں جو آخری زمانہ میں ظاہر ہوں گے: وہ لوگ تمام امتوں سے زیادہ قابلِ فخر ہوں گے اور جس طرح یہ (خواب کا) ٹھیکرا سارے بدن پر غالب آگیا ہے اسی طرح وہ بادشاہ بھی سب پر غالب ہوں گے۔ اور یہ فرشتہ جو آسمان سے اُترا ہے اور جس نے وہ سنہرا سر کاٹ کے پھینک دیا ہے وہ وہ نبی ہے جو تمام اُمتوں کے لیے مبعوث ہوگا اور وہ زمین کو بُت پرستی سے پاک کر دے گا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ بادشاہ ہلاک اور معدوم ہو جائے گا! چنانچہ حضرت دانیال نے ابھی اپنا کلام پورا نہ کرنے پائے تھے کہ زمین پھٹی اور بخت نصر کو نگل گئی!

فصل ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور اُن کی شریعت کی سچائی کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفوں میں اللہ تعالیٰ کا یہ قول لکھا ہے کہ اے ابراہیم چار پرندے، چار گائیں اور چار وحشی لو۔ پھر اُنکو حکم فرمایا کہ ان میں سے ہر ایک کے دو دو برابر ٹکڑے کرو، مگر فرمایا کہ چڑیا کے ٹکڑے نہ کریں۔ پھر حکم دیا کہ وہ ان سب کو پکاریں چنانچہ حضرت ابراہیم نے ایسا ہی کیا، اور وہ سب زندہ ہو ہو کر بھاگتے ہوئے اُن کے پاس آگئے اور جیسے تھے ویسے کے ویسے ہی ہو گئے۔ تب اللہ عزوجل نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا کہ میں اسی طرح مُردوں کو زندہ کروں گا اور قبروالوں کو اُٹھا بٹھاؤں گا۔ بنو اسرائیل کے علما نے اس مقام کی شرح کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ (اس آیت میں) حیوانوں کی جو جنسیں بیان ہوئی ہیں وہ اصل میں وہ قومیں ہیں جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور مبارک سے پہلے ہو گذری ہیں، اور یہ کہ چڑیا جس کا اس آیت میں ذکر ہوا ہے اُس سے حضرت اسمٰعیل کی اولاد مراد ہے، کیونکہ وہ لوگ قیامت کے دن تک نہ ہلاک ہوں گے اور نہ آپس میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر الگ الگ ہو رہے۔

فصل ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور اُن کی شریعت کی سچائی کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ حضرت حزقیل علیہ السلام کے صحیفوں میں آیا ہے کہ (ایک مرتبہ) وہ اپنی سیر و سیاحت میں تھے کہ اُنھوں نے ایک بڑا سا مقبرہ دیکھا جس میں پرانی سڑی گلی ہڈیاں تھیں۔ وہ اُنکو دیکھ کر تعجب اور حیرت سے وہیں کھڑے ہو گئے اور اس بھید پر غور کرنے لگے کہ یہ ہڈیاں

کس طرح پھر اُسی حالت پر پہونچ سکتی ہیں جس حالت میں وہ پہلے تھیں۔ اتنے میں اللہ تعالیٰ نے اُن کو مخاطب کرکے فرمایا کہ اے آدم کے بچّے! ان ہڈیوں سے کہہ کہ "اے گلی سڑی ہڈیو اللہ کا کلام سنو۔ وہ تم سے کہتا ہے کہ سب ایک دوسرے سے مل مل کر اکٹھی ہو جاؤ"۔ جب وہ کہہ چکے، تو کیا دیکھتے ہیں کہ مقبرہ ہلا اور ہڈیاں اکٹھی ہونے لگیں، رگ اور پٹھے پھیلنے لگے، نسیں اور رگیں آپس میں ملنے لگیں اور اُن پر کھال لپٹنے لگی۔ پھر اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضرت حزقیلؑ سے فرمایا کہ کہو کہ "اے روح! ان میں داخل ہو جا"۔ چنانچہ حضرت نے ایسا ہی کہا، اور وہ سب جسم اُسی وقت اُٹھ بیٹھے اور سب نے کھڑے ہو ہو کے اپنے چہروں اور سروں کی مٹی جھاڑی اور سب نے گواہی دی کہ اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے، وہ واحد ہے اور کوئی اُسکا شریک نہیں ہے، اور موت حق اور زندگی باطل ہے۔ پھر اُن لوگوں نے اپنے نبی سے پوچھا کہ "ہم لوگ دنیا میں ہیں یا قیامت آگئی ہے؟" آنحضرت علیہ السلام نے کہا کہ "نہیں بلکہ تم لوگ ابھی دنیا ہی میں ہو"۔ پھر اُن میں سے جن لوگوں نے موت چاہی وہ مر گئے اور اُن میں سے کچھ شہر میں داخل ہو گئے۔ یہ واقعہ بادشاہ یاربعام کے زمانہ کا ہے جو کافر ہو گیا تھا۔ گو اُس نے یہ زبردست نشانی دیکھی، مگر پھر بھی اپنے کفر سے باز نہ آیا —— وہ فلسفی تھا!

فصل - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ انکا نام تورات میں مَئذ مَئذ اور انبیا کے صحیفوں میں یومَنّی یا ھو لکھا ہے۔ بنو اسرائیل کے جن علما نے تورات کی تفسیر کی ہے، اُنھوں نے اس کی بھی تفسیر کی ہے۔ چنانچہ ان میں سے بعض یہ کہتے ہیں کہ مَئذ مئذ کے معنی ہیں جِدًّا جدًّا (= بہت بہت)، بعض کہتے ہیں احمد احمد، اور بعض کہتے ہیں عظیم عظیم (بزرگ بزرگ) جن مفسروں نے جدًّا جدًّا معنی بتائے ہیں وہ تو گویا وہی ہیں کہ جو عظیم عظیم کے معنی ہیں: اور حضرت اسمٰعیل کی نسل سے کوئی شخص عظمت میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ نہیں ہوا۔ اسی طرح صحف انبیاء میں انکا نام یومنّی یا ھو ہے: اور یہ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ہے، اور سوا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کسی کے لیے نہیں آیا ہے!

فصل - بنو اسرائیل کی حکومت کا کُل زمانہ آٹھ سو باون (۸۵۲) سال کا ہے۔ اس میں سے سات سو سال تک وہ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے پیرو رہے، اور اُن دنوں وہ اس قدر زبردست تھے کہ جو بادشاہ اُنکے ملک پر حملہ کرتا تھا تباہ ہو جاتا تھا،

جس طرح سنحاریب وغیرہ کئی بادشاہ تباہ ہوگئے۔ پھر اس سات سو سال کے بعد انکے ملک کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے، اور یاربعام بادشاہ ہوا۔ اس نے دمشق کو اپنا پایۂ تخت بنایا۔ اس نے تصویریں اور مورتیں بنائیں، بیت المقدس کے حج کو باطل قرار دیا اور حکم دے دیا کہ جو شخص اس کا حج کرنے جائے اسے قتل کر دیا جائے۔ اس میں اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے بیٹے میں جنگ ہوئی جس میں نو قبیلے اور بنو اسرائیل کا آدھا قبیلہ اس بادشاہ کے ساتھ تھا۔ آخر اس نے ابن سلیمان پر فتح پائی۔ پہلی ہی جنگ میں آٹھ لاکھ اور کچھ زیادہ آدمی کام آئے۔ یہ لڑائی اور فتنہ فساد ان لوگوں کے آپس میں برابر جاری رہا۔ اور ایک سو باون (۱۵۲) سال تک تلوار برابر اپنا کام کرتی رہی۔ اس بادشاہ نے انبیاء کو قتل کیا اور حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شریعت کو جلا ڈالا۔ اسکے بعد اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بختنصر کو بھیجا۔ جس نے بیت المقدس میں آگ لگادی اور حضرت زکریاؑ کے خون سے قطع نظر کرکے، چوراسی ہزار (۸۴۰۰۰) شریعت جانوں کو ہلاک کیا اور ان کو روئے زمین پر بکھیر دیا۔ اس طرح بیت المقدس ستر برس تک خراب غیر آباد پڑا رہا۔ اسی زمانے میں سَمَرہ قوم کا ظہور ہوا، جنھوں نے اپنی ایک نئی شریعت بنائی، اور اپنے آپ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے منسوب کیا۔ وہی زمانہ تھا کہ جب قرّاء لوگ ظاہر ہوئے، جن کا عقیدہ تھا کہ حضرت عزیرؑ اللہ کے بیٹے تھے، اور یہی لوگ تھے جو حجاز میں جاکے آباد ہوئے تھے۔ پھر اس ستر سال کے بعد کورش نام کا ایک بادشاہ ہوا، جس نے دوبارہ بیت المقدس کو آباد کیا اور یہودی لوگ اسکے پاس جمع ہوگئے۔ اسکے بعد بیت المقدس چار سو اسّی (۴۸۰) سال تک آباد رہا، اور اسی زمانہ میں حضرت مسیح عیسیٰؑ ابن مریم علیہ السلام کا ظہور ہوا۔ پہلا بیت المقدس جسے حضرت سلیمان بن داود علیہما السلام نے بنایا تھا، وہ اس وجہ سے تباہ ہوا تھا کہ ان لوگوں نے اللہ کے عہدوں کو توڑ ڈالا اور بُت اور مورتیں بنائیں اور پیغمبروں کو قتل کیا: اور دوسرا بیت المقدس جسے کورش نے آباد کیا تھا اس سبب سے اُجڑا کہ ان لوگوں کے علماء کے آپس میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات، صفات اور اس کے کلام کے بارے میں اختلاف ہوگیا تھا اور انھوں نے حضرت مسیح عیسیٰ بن مریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کفر کیا تھا۔

فصل — حضرت باری سبحانہ وتعالیٰ کے "کلام" کے باب میں (علماء میں) اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس میں حرف اور آواز کچھ بھی نہیں، اور بعض کا قول ہے کہ حرف اور آواز

دونوں ہیں۔ اس (دوسرے قول) کا سبب فلسفیوں کی پیروی اور اُن کے خیالات پر اعتقاد رکھنا ہے، کیونکہ فلسفی لوگ عالَم کی قدامت کے معتقد ہیں ---- اور یہ اُنکی وہ بڑی غلطی ہے جس نے ان کو اسفل السافلین میں پہونچا دیا ہے: کیونکہ ایک تو وہ لوگ موجود، ایجاد اور موجد کو نہیں مانتے، دوسرے یہ کہ وہ نبوت کی حقیقت اور پیغمبروں کے مراتب سے ناواقف ہیں، خدائے صانع اور اُس کی قدرت کے منکر ہیں، اور اُن کی عقلیں فلک تک پہونچ کے ٹھہر جاتی ہیں۔ اور جب اُن کے افلاطون اور ارسطو جیسے بزرگ جسم کی حقیقت کو سمجھنے سے عاجز رہ گئے، تو بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ باری سبحانہ وتعالیٰ کے کلام کی حقیقت کو سمجھ سکیں۔ مگر حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ان پردوں کو پھاڑ کر عالَم ملکوت تک پہونچ گئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے پاس سے خبر لائے ہیں کہ اُس نے عالَم کو عدم سے پیدا کیا ہے اور ایسی قدرت سے پیدا کیا ہے کہ جس میں عجز نہیں ہے، ایسی قوت سے پیدا کیا ہے جس میں ضعف کا نام بھی نہیں ہے۔ اور توراۃ کے شروع ہی میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان موجود ہے کہ برا شیث بارا ---- یعنی یہ کہ اللہ نے اس عالَم کو عدم سے پیدا کیا ہے!

فصل۔ فلسفہ ایک قدیم مذہب (طریق) ہے۔ اسکے پیرو بہت سے فرقوں میں تقسیم ہوگئے ہیں۔ چنانچہ ان میں دہریے ہیں جو صانع کو نہیں مانتے۔ اسی طرح اُن میں حلولی اور اتحادی ہیں، اور وہ لوگ بھی ہیں جو عالَم کی قدامت اور صانع کی قدرت کے محدود ہونے کے معتقد ہیں۔ اُن ہی میں سے صابئی بھی ہیں، جو ستاروں کی پرستش کرتے ہیں۔ تمام فلسفی عالَم کی قدامت کے قائل ہیں ---- نہ اُسے خالی مانتے ہیں نہ بھرا ہوا ---- اور وہ جہان کے خدا کو فلک کے اندر محدود سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ اللہ اور پیغمبروں کے دشمن ہیں۔ یہی لوگ ہیں جنھوں نے بُت پرستی کی بنیاد ڈالی ہے اور تصویریں اور مورتیں بنائی ہیں اور اُنھیں نے مصر کے برابی (مندر) اور اہرام بنائے ہیں۔ ان میں سے جو بڑے بڑے تھے، مثلاً کنعان کا بیٹا نمرود اور فرعون، اُنھوں نے خدائی کا دعوےٰ کیا ہے! جب ایسی باتیں ظاہر اور فاش ہونے لگیں تو باری سبحانہٗ وتعالیٰ کو اپنی ذات کی غیرت ہوئی، اور اُس نے پیغمبروں کو نشانیاں اور دلیلیں اور معجزے، جو ہستی کی طبیعتوں کے لیے مافوق العادت تھے، دے دے کر بھیجا۔ چنانچہ جب اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا، تو اُن سے فرمایا کہ "فرعون ہرگز تجھ پر ایمان نہ لائے گا، کیونکہ میں نے یہ ٹھان لی ہے کہ میں مصر کی سرزمین میں اپنی بہت سی نشانیاں اور

معجزے دکھاوں گا" عبرانی زبان میں یہ آیت یوں ہے کہ لہ ماعن ربوث موفتی بارض مصرائم۔

فصل۔ فلسفیوں کے عقیدہ، یعنی عالم کی قدامت، کے رد میں   خوب سمجھ لو کہ یہ عالم، یعنی فلک اور وہ سب کچھ جس پر وہ حاوی ہے، سب ایک واحد شخص (چیز) ہے۔ اس کا باہر کا گھیر بالکل سادہ (بسیط) ہے، اور جو کچھ اسکے اندر ہے اس کے بہت سے حصے ہیں، اور مادہ اور صورت سے مل کر بنا ہے۔ پھر ان میں سے کچھ تو ایسی چیزیں ہیں جن میں سمجھ ہے، جیسے حیوان؛ اور کچھ ایسی ہیں جن میں سمجھ نہیں ہے، جیسے جمادات۔ اور چونکہ ان سب چیزوں کی ذاتیں کئی طرح کی ہیں، اس لیے یہ امر محال ہے کہ یہ سب کسی طرح ایک ہو جائیں۔ اس لیے یہ لازم آیا کہ کسی اور نے ان سب کو پیدا کیا ہے: اور اس سب کا اس طرح پیدا ہو جانا چار صورتوں سے خالی نہیں ہے۔ پہلی صورت یہ ہے کہ اس (کائنات) کی پیدائش ایک ازلی مادہ اور ازلی صورت سے ہوئی۔ مگر یہ بات عقلی، شرعی، طبعی ہر لحاظ سے محال ہے کہ کوئی ہستی بلا صورت کے مادہ ہو کر یا بلا مادہ کے صورت ہو کر اپنی ہستی قائم رکھے۔ اور اگر وہ لوگ یہ کہیں کہ ہیولیٰ کا بھی وجود تھا، تو (جواب یہ ہے کہ) اسکا وجود ذہنی تھا نہ کہ عیانی: اور ذہنی وجود کسی عیانی وجود کا سبب نہیں ہو سکتا۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ عیانی موجود ذہنی وجود کا سبب ہو۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس، یعنی فلک اور اسکے اندر کی تمام چیزوں کا وجود ایک ایسے مادہ سے ہو جو ہمیشہ سے تھا اور ایسی صورت سے ہو جو پہلے کبھی نہ تھی۔ چنانچہ بعض متکلمین کی یہی رائے تھی۔ وہ کہتے تھے کہ فاعل زندہ، قدرت والا اور ارادہ والا ہے۔ اسکے بعد وہ باقی صفات کو اس کے لیے واجب قرار دیتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ مادہ سے جو کچھ چاہتا ہے کرتا رہتا ہے اور اس میں ایک ایسی صورت بنا دیتا ہے جو پہلے کبھی نہ تھی۔ مگر یہ رائے دو وجہ سے غلط ہے۔ ایک تو یہ کہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ فاعل کے پاس پہلے سے مادہ موجود ہو، جیسے ایک معمار چونہ پتھر وغیرہ مصالحہ سے مکان بناتا ہے جو اس کے پاس پہلے سے ہوتا ہے۔ دوسری یہ کہ اسکے یہ معنی ہونگے کہ مادہ ازل ہی میں فاعل کے ساتھ شریک ہو، اور گو وہ اسکے بغیر کام کرنا چاہے مگر نہ کر سکے۔ حاشا کہ اس سبحانہٗ وتعالیٰ کے ملک میں کوئی شریک ہو: وہ ایسی باتوں سے بلند و برتر ہے! تیسری صورت یہ ہے کہ (کائنات کا) وجود ایسے مادہ سے ہو جو پہلے کبھی نہ تھا اور ایسی صورت

سے ہے جو ہمیشہ سے تھی۔ مگر یہ محال ہے کہ ایک موجود چیز کسی معدوم چیز سے مل کر باقی رہے۔ لہذا قیاس نظری و برہانی کے مطابق لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس عالم، یعنی فلک و ما حویٰ کا وجود ایسے مادہ سے ہے جو کبھی نہ تھا اور ایسی صورت سے ہے جو کبھی نہ تھی: اور یہی ہے وہ "عدم" جس (کے عقیدہ) کو تمام نبی اور رسول لائے ہیں — صلوات اللہ علیہم اجمعین۔

فصل۔ اللہ تعالیٰ تمھیں نیک توفیق دے، جان رکھو کہ گو پیغمبروں کی شانیں اور مرتبے بہت بڑے تھے، تاہم اُن میں طرح طرح کے لوگ تھے۔ چنانچہ اُن میں بعض ایسے تھے جن سے اللہ نے خواب میں کلام فرمایا، بعض ایسے تھے جن کو وحی کے ذریعہ یا پردہ کے پیچھے سے مخاطب فرمایا، اور بعض ایسے بھی تھے جو اُس کی مقدس بارگاہ میں ہر وقت حاضر رہتے تھے۔

فصل۔ واضح ہو کہ حضرت سلیمانؑ بن داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک مثل بیان کی اُس مثل میں اُنھوں نے ایک آدمی کا حال بیان کیا کہ اُس نے سوتے ہوئے ایک مردہ شخص کو خواب میں دیکھا جسے مرے ہوئے کچھ عرصہ ہو چکا تھا۔ اُس مُردہ شخص نے اُس سوتے ہوئے آدمی سے خواب میں کلام کیا، اور اپنے ہونٹ اور زبان اور لفظ اور آواز سے اُسے پوشیدہ چیزوں کی خبر دی حالانکہ (حقیقت میں) نہ وہاں ہونٹ موجود تھے اور نہ زبان تھی نہ لفظ نہ آواز۔ جب وہ سونے والا جاگا، تو اُس نے وہ سب باتیں سنائیں جو اُس مُردہ شخص نے اُسکو اپنے ہونٹ اور زبان اور لفظ اور آواز سے سنائی تھیں۔ (علاوہ اسکے) آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ سچا خواب نبوت کے چھیالیس[46] حصوں میں سے ایک حصہ ہے۔ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اصل میں تو خواب دیکھتے ہیں، مگر سمجھتے ہیں کہ جاگ رہے ہیں۔ لیکن اس میں قیاس کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ نبوت عالم بیداری کے خواب سے بدرجہا بزرگ تر ہے!

فصل۔ اللہ تعالیٰ تم کو اپنی بندگی کی توفیق دے، یہ خوب سمجھ لو کہ میں بنو اسرائیل کے علماء میں سے تھا، مگر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مجھے اسلام کی نعمت عطا کی۔ اس کا سبب یہ ہوا کہ میں کچھ ضعیف ہو گیا تھا اور ایک طبیب میرا علاج کر رہا تھا۔ (یہاں تک ہوا کہ) میرے لیے موت کا کفن بھی تیار کر دیا گیا۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ جیسے کوئی شخص مجھ سے کہہ رہا ہے کہ "سورۂ الحمد پڑھو، موت سے خلاصی پا جاؤ گے"۔ جب میں سو کے اُٹھا تو میں نے اُسی وقت

ایک سچے مسلمان کو بلایا جو میرے پڑوس ہی میں رہتا تھا، اور میں نے اُسکا ہاتھ پکڑ کے کہا اشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ واشھد ان محمداً عبدہٗ ورسولہٗ ارسلہٗ بالھدیٰ ودین الحق لیظھرہٗ علی الدین کلہ۔ پھر میں بار بار یہ کہتا رہا کہ "اے دلوں کو مضبوط کرنے والے! مجھ کو ایمان پر مضبوط کردے!!" پھر جب میں جامع مسجد میں گیا تو دیکھا کہ مسلمان فرشتوں کی قطاروں کی طرح قطاریں باندھے کھڑے ہیں، اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کوئی میرے دل میں کہتا ہے کہ "یہی وہ اُمت ہے جس کے ظہور کی انبیاء علیہم افضل الصلوٰۃ والسلام نے خوشخبری دی ہے!" جب خطیب سیاہ کپڑے پہنے ہوئے برآمد ہوا، تو اُسے دیکھ کر مجھ پر سخت خوف چھا گیا؛ اور جب اُس نے منبر پر اپنی تلوار ماری تو اُس کی چوٹ سے میرے سب اعضاء کانپ اُٹھے۔ اُس زمانہ میں اسکندریہ کی سرحد میں ابن الموفق خطیب تھے۔ جب انھوں نے اپنے خطبہ کے آخر میں کہا کہ ان اللہ یامر بالعدل والاحسان وایتاء ذی القربیٰ وینھیٰ عن الفحشاء والمنکر والبغی یعظکم لعلکم تذکرون، اور جب نماز کے لیے جماعت کھڑی ہوگئی تو مجھ پر ایک عجیب وغریب حالت طاری ہوگئی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ مسلمان فرشتوں کی طرح قطاریں باندھے کھڑے ہیں اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ اُن کے رکوع اور سجود میں اُن پر تجلی فرما رہا ہے اُسوقت مجھے پھر ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کوئی میرے دل میں کہہ رہا ہے کہ "اگر بنو اسرائیل اللہ کے خطاب سے عمر بھر میں دو دفعہ سرفراز ہوئے ہیں تو اس اُمت کو ہر نماز میں اللہ کا خطاب حاصل ہو جاتا ہے"؛ اور مجھے اس کا یقین ہوگیا کہ میں اصل میں مسلمان ہی پیدا ہوا تھا۔ میں نے ۵۹۰ھ کی پہلی شعبان کو اسلام قبول کیا تھا۔ جب میں نے رمضان کے مہینے میں قرآن سُنا تو میں نے اُس میں اس قدر زبردست فصاحت وبلاغت اور ایسا عظیم الشان اعجاز پایا کہ میں نے یہ دیکھا کہ جو قصہ تورات کے کئی صفحوں میں مذکور ہے وہ قرآن میں ایک یا دو آیتوں میں آگیا ہے — اور یہ اتنا بڑا اعجاز ہے کہ کسی بشر کی یہ طاقت نہیں ہے کہ اُس کی سی ایک آیت بھی بنا سکے، مثلاً اللہ تعالیٰ کا یہ قول لو کہ:- واذ قال موسیٰ لقومہ یا قوم اذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ جعل فیکم انبیاء وجعلکم ملوکا واٰتاکم مالم یؤت احداً من العالمین یا قوم ادخلوا الارض المقدسۃ التی کتب اللہ لکم ولا ترتدوا علیٰ ادبارکم فتنقلبوا خاسرین— یہ قصہ تورات میں کئی صفحوں میں لکھا ہے۔ جب اللہ نے اُن لوگوں کو حکم دیا کہ وہ اُس مقدس سرزمین میں داخل ہوں تو اُنھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ ہمیں چند تا مدد دو۔

چنانچہ جب اُن کو قاصد مل گئے، تو اُنھوں نے ہر قبیلہ میں سے ایک ایک نقیب کو انتخاب کر لیا اور ہر ایک کو اُسکا نام دیا۔ اُن ہی میں یوشع اور کالیب بھی تھے: اور یہ وہی دو حضرات ہیں جن کا حال اللہ نے اپنی کتاب عزیز میں بیان کیا ہے۔ تورات میں لکھا ہے کہ یہ لوگ ارض مقدس میں کس طرح داخل ہوئے، اُنھوں نے اُس سرزمین کے پھلوں کے ساتھ کیا کیا، اور عمالقہ کے ساتھ اُن کو کیا واقعات پیش آئے۔ بنو اسرائیل نے حضرت موسیٰ کو سنگسار کرنا چاہا، مگر بادل حضرت موسیٰ کے اور ان لوگوں کے درمیان حائل ہو گئے۔ اسی موقع پر یہ آیت نازل ہوئی تھی کہ فانها محرمة علیهم اربعین سنة۔ ان لوگوں نے حضرت موسیٰ علیہ سلام کی مخالفت کی اور شام کی طرف کوچ کر گئے۔ عمالقہ اُنکے مقابلہ کو نکلے اور بنو اسرائیل کو شکست ہوئی۔ یہی موقعہ تھا کہ جب حضرت موسیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا شفیع بنایا تھا۔

وصل۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے کہ وما نرسل المرسلین الا مبشرین ومنذرین معلوم رہے کہ بنو اسرائیل کی سلطنت کے برباد ہونے سے پہلے ہی تورات نے اور پیغمبروں کے صحیفوں نے ان تمام واقعات کی خبر دیدی تھی۔ اُن حضرات نے اُنکو ڈرادیا تھا اور خبردار کر دیا تھا کہ ہجرت نبوی کے سات سو ہلالی سالوں کے بعد فتنے واقع ہوں گے کیونکہ انلوگوں نے اللہ تعالیٰ کے کلام کے لفظوں اور معنوں کو بدل دیا تھا اور اُن کی جگہ دوسرے لفظ رکھ دیے تھے اور حضرت پیغمبر مصطفےٰ کی نبوت سے انکار کیا تھا، اور حضرت مسیح عیسیٰ ابن مریم سے کفر کیا تھا اور مورتیں بنابنا کر اپنے معبدوں میں رکھی تھیں — اور اسی سبب سے اللہ نے بنو اسرائیل کی سلطنت کو برباد کر دیا تھا۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے بندوں، یعنی پیغمبروں سے وعدہ فرمایا تھا کہ تصویریں اور مورتیں ہیکلوں اور معبدوں سے ہٹا دی جائیں گی، اور جس بادشاہ کے ہاتھ سے ان چیزوں کا ہٹانا مقصود تھا اُس سے وعدہ فرمایا تھا کہ اُس کی سلطنت مضبوطی سے قائم ہو جائے گی، اُسکی عمر طویل اور اُس کا اقتدار دوامی کر دیا جائے گا اور روے زمین کے بادشاہ اُسکے فرماں بردار کر دیے جائیں گے۔ چنانچہ اسکی تشریح اور اسکا ثبوت یہ ہے کہ آسمانی کتابوں کی بتائی ہوئی تاریخوں، یعنی ہجرت نبویہ کے سات سو سال کے ختم ہونے کے بعد اللہ نے بادشاہ غازان[1] کے ہاتھ سے مشرق کے کلیساؤں کو تباہ و برباد کرایا۔ (شروع میں) غازان مسلمانوں کی فوجوں پر

[1] غازان قاآن ایک منگولی بادشاہ تھا جسنے ۶۹۴ھ میں اسلام قبول کیا، اور ہیکلوں اور مندروں کو تباہ کیا۔ چونکہ اسکا اسلام ہجرت نبوی صلعم کے ۶۹۴ سال کے بعد واقع ہوا، اس لیے مصنف کا قول بہت کچھ صحیح ہے۔

غالب آیا۔ لیکن جب مسلمان شکست کھا کر واپس آئے، تو اللہ تعالیٰ کے الہام سے اُنھوں نے کلیساؤں کو بند کر دیا، اور یہ بند کر دینا پاک اور شریف شرع کے اقتضاء کے مطابق تھا۔ اسکے بعد مسلمان پھر اپنے دشمن کے مقابلہ کو نکلے۔ شقحب کے مقام پر جنگ ہوئی، اور اللہ نے مسلمانوں کو فتح دی۔ بنو اسرائیل کے ساتھ برابر یہی ہوتا رہا اور جب تک اُنکی حکومت رہی ہمیشہ یہی ہوا کہ جب کبھی وہ بت اور مورتیں بنانے لگتے تھے تو اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں شکست کھاتے تھے، مگر جب اُن مورتوں کو بگاڑ دیتے تھے تو دشمن پر فتح پاتے تھے اور اُنکی حکومت کو قرار ہو جاتا تھا۔ غرضکہ جب مسلمان اپنے دشمن پر فتح پاکر واپس آئے تو کلیسا کھول دیئے گئے اور وہ سب وعدے ختم ہو گئے۔ جب میں نے یہ حال دیکھا تو مجھے اللہ تعالیٰ سے غیرت آئی اور سات سو شمسی سال کے ختم ہونے پر مجھے مسلمانوں اور اُنکی سلطنت سے خوف ہوا۔ اسلیے میں اُٹھا اور آگے بڑھ کے، اللہ تعالیٰ سے ثواب حاصل کرنے کی نیت سے، میں نے ایک ایسی مجلس قائم کرنے کی درخواست کی جس میں علماے اسلام اور بادشاہِ وقت کے سامنے دس یہودی عالم اور دس عیسائی پادری جمع ہوں اور اُنکے پاس تورات، انجیل، زبور اور دوسرے انبیاء علیہم افضل الصلوٰۃ والسلام کے صحیفے ہوں، تاکہ میں اُن کو کھول کے بتا سکوں کہ ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے کلام میں کہاں کہاں لفظ بدلے ہیں اور کہاں کہاں نئے لفظ رکھے ہیں۔ اور یہ کہ میں حضرت مصطفےٰ یعنی حضرت محمد صلعم بن عبداللہ بن عبدالمطلب کی نبوت کو تورات، انجیل، زبور اور پیغمبروں کے صحیفوں سے بیان اور دلیل سے ثابت کر دوں اور خود اُن ہی کی کتابوں سے اس کا ثبوت پیش کر دوں کہ اب اُن کو اپنے معبدوں میں سے بتوں اور مورتوں کو نکال کے پھینکدینا چاہیے۔ جب یہ بات ظاہر ہوگئی کہ اس بادشاہ الملک الناصر پر ثابت ہو جائے گا کہ اللہ نے اپنے نبیوں اور رسولوں کی زبان سے کیا کیا وعدے کیے ہیں، تو سب مفتیوں نے مل کر فتویٰ دیا کہ "یہ شخص بہترین قربت کے ساتھ اللہ تعالےٰ کی قربت چاہتا ہے، اور اُس کے اس ارادہ میں بادشاہ کو ضرور مدد دینا چاہیے": اور دین کے اماموں نے ایسی مجلس کے قائم کرنے کی اجازت دی: اور سلطنت کے وزیروں نے چھ دفعہ تحریری اجازت دی کہ شام اور مصر میں ایسی مجلسیں قائم کی جائیں۔ مگر (افسوس کہ) وہ مجلس ہی قائم نہ ہوئی! لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم - انا للہ وانا الیہ راجعون!

فصل۔ واضح ہو کہ میں نے اپنی اس مختصر تحریر میں جو کچھ جمع کر دیا ہے وہ سب کچھ تورات

اور صحف انبیاء میں لکھا ہوا ہے۔ مگر میں نے ان سب کو عبرانی اور سریانی زبانوں سے نکال کر جمع کیا ہے اور ترتیب دے کر خالص صاف عربی زبان میں ترجمہ کر دیا ہے ــــــ اُس زبان میں جس میں کہ سید اولین و آخرین کلام فرماتے تھے۔ میں نے اس تحریر کو ناظرین کے لیے تفریح کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ میں اسے اکثر المحیط کہا کرتا ہوں، کیونکہ اس میں یقینی علوم کے قواعد، ایمان کے عہد و پیمان، دینی نصیحتیں، عام مقامات اور خاص سلوک، سب کچھ جمع ہو گیا ہے۔

وصلی اللہ علی سیدنا محمد وآلہ وصحبہ وسلم

یہ کتاب دمشق محروسہ میں جامع بنو اُمیہ میں ۶۲۰ھ کے ماہ ربیع الاول کی بارہویں تاریخ کو تصنیف ہوئی۔

والحمد للہ رب العالمین وصلی اللہ علی سیدنا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ وسلم۔ وحسبنا اللہ ونعم الوکیل ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

تمام شد

محمد نعیم الرحمٰن، ایم اے
معلم الہ آباد یونیورسٹی

بسم اللہ

فہرست مضامین ماہ فروری و مارچ سنہ ۱۹۲۶ء

نمبر ۱۷۶۱ و ۱۷۷۱ جلد ۳۰

مطبوعات جدیدہ

فلسفۂ الہیات ۔ شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد مرحوم کے وہ حکیمانہ جذبات جو عربی، فارسی، سنسکرت سے اخذ کیے اور حالت بیخودی میں الہامی اردو کے انداز میں لکھے گئے ۔ مرتبہ آغا محمد طاہر نبیرۂ حضرت آزاد۔ قیمت عہ

مناقب رزاقیہ حضرت ملا نظام الدین فرنگی محلی نے حضرت شاہ عبد الرزاق بانسوی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات و مقامات فارسی میں تحریر فرمائے تھے، مولوی صبغۃ اللہ صاحب شہید انصاری نے اسکا اردو ترجمہ کر دیا ہے ۔ قیمت ۸

الدر المنظم فی مناقب غوث الاعظم (جلد اول) مولفہ مولانا شاہ علی انور قلندر مرحوم جسمیں تصوف اور صوفیوں کے متعلق معلومات کثیرہ فراہم کی گئی ہے اور حضرت غوث اعظم کے متعلق بزرگان متقدمین کے اخبارات و بشارات درج کیے گئے ہیں اور اُن بزرگوں کے حالات لکھے گئے ہیں جنھوں نے حضرت غوث الاعظم کی تعریف فرمائی ہے یا جنکی تعریف خود آپنے فرمائی ۔ نیز حضرت غوث الاعظم کا حسب نسب بیان کیا گیا ہے ۔ حجم ۳۷ جزو ۔ کتابت طباعت اعلیٰ للعہ

مسئلہ شرقیہ ۔ مصر کے مشہور محب وطن مصطفےٰ کامل پاشا کی لاجواب کتاب المسئلہ الشرقیہ کا ترجمہ ۔ از مولانا نیاز فتحپوری ۔ جسکے مطالعہ سے اسلامی ممالک کی سیاسی پیچیدگیوں اور مدبرین یورپ کی بازیگریوں کی کیفیت معلوم ہو جائیگی قیمت عہ

انقلاب فرانس مولانا عبد الرزاق ملیح آبادی نے ایک عربی ناول کا ترجمہ کیا ہے جس سے اس مشہور تاریخی انقلاب پر روشنی پڑتی ہے جو فرانس کو شخصی حکومت کے پنجہ سے چھڑا کر ایک آزاد جمہوری سلطنت بنانے کا سبب ہوا ہے قیمت عہ

فغان آرزو ۔ لکھنؤ کے سب سے خوشگو شاعر سید انور حسین آرزو (جانشین حضرت جلال مرحوم) کا پہلا دیوان ۔ قابل دید ہے ۔ قیمت عہ

سالومی ۔ مشہور ڈراما نویس آسکر وائلڈ کا ایک ڈرامہ جسکی خوبی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جرمن، انگریزی، اطالوی، ہسپانی، روسی، پولی، ترک، ڈچ، اور یورپ کی دیگر زبانوں میں اسکے ترجمے ہو چکے ہیں اور برلن میں دو سو راتوں تک مسلسل یہی ڈرامہ کھیلا جاتا رہا

ملنے کا پتہ :۔ الناظر بک ایجنسی، لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۱۷۶ و ۱۷۷ جلد ۳۰		فروری و مارچ سنہ ۱۹۲۶ء

جمہوریت افلاطون

(بسلسلۂ گذشتہ)

پولیمارکوس نے شریک مکالمہ ہو کر کہا:-

پ- "نہیں یہ تعریف تو ضرور صحیح ہے' یا کم سے کم سایمانیڈیز[1] (Simonides) کا تو یہ قول ضرور ہے۔

ک- "اب میں بحث کو اس مقام پر چھوڑتا ہوں کیونکہ مجھ کو کچھ نذر وغیرہ دینا ہے۔"

س- "تو اب آپ کی جگہ پولیمارکوس داخل مباحثہ ہوتے ہیں؟"

ک- (مسکرا کر) "ہاں بیشک" [یہ کہہ کے وہ نذر دینے چلے گئے۔ انکے جانے کے بعد میں نے پولیمارکوس سے مخاطب ہو کے پوچھا:- "اب وارث بحث تم ہوئے' لہذا بتاؤ کہ سایمانیڈیز نے عدل کی صحیح تعریف کیا کی ہے؟"]

---

[1] اس نام کے دو شاعر یونان میں گزرے ہیں۔ ایک ساتویں صدی اور دوسرا پانچویں اور چوتھی صدی قبل مسیح کا۔ پہلا غالباً دوسرے کا معاصر ہوا ہے جو کیوس کا رہنے والا بہت مشہور شاعر گذرا ہے۔ یہ تھیمسٹاکلیز اور دیگر اکابر وقت کا دوست اور معاصر تھا۔ اسکی عبارت نہایت رنگین' خیالات بلند اور مضمون عالی ہوتے ہیں۔ پنڈار کی طرح شاعری کی ہر صنف میں ید طولےٰ رکھتا تھا۔ اس زمانہ کے نکتہ رس اُس کا مقابلہ انگریزی شاعر ٹینیسن سے کرتے ہیں۔

پ :- یہ کہ ہر شخص کو اُس کا حق دیا جائے۔ اور میرے نزدیک بھی یہ تعریف صحیح ہے ۔"
س :- اس میں شک نہیں کہ سایا نیڈیز کی تردید کوئی آسان بات نہیں ہے، کیونکہ وہ ایک عقلمند اور ملہم شخص ہے، مگر ان الفاظ سے اُس کا اصلی مفہوم ممکن ہے تم سمجھ سکتے ہو، میری سمجھ میں تو نہیں آتا۔ اس وجہ سے کہ مثال مذکورہ میں اُس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اگر کوئی شخص کوئی چیز کسی دوسرے کے پاس امانتاً رکھوائے تو امین اُسکو صاحب امانت کو واپس کردے گو کہ صاحب امانت مجنون ہو۔ گو پھر بھی وہ امانت صاحب امانت کو ملنا چاہیے۔ کیا ایسا نہیں ہے؟"
پ :- بیشک ایسا ہی ہے ۔"
س :- مگر جبکہ حق مانگنے والا اپنے ہوش و حواس میں نہ ہو تو پھر وہ حق اُسکو کسی طرح نہ ملنا چاہیے۔"
پ :- "کبھی نہ ملنا چاہیے ۔"
س :- تو اس سے معلوم ہوا کہ اس جملہ سے کہ حقوق کی واپسی عدل ہے سایا نیڈیز کا کچھ اور مطلب ہے ۔"
پ :- نہیں۔ سایا نیڈیز کا یہ مطلب تو ضرور ہے۔ کیونکہ اُس کا یہ بھی قول ہے کہ قرض جو ایک دوست دوسرے دوست کو دیتا ہے اُس کی غرض نفع ہوتی ہے نہ کہ نقصان ۔"
س :- یعنے اس سے یہ مطلب ہوا کہ وہ شخص جو روپیہ جمع کرنے والے کو اُس کا روپیہ واپس دیتا ہے اُس کا حق نہیں دیتا، اگر اس قسم کی واپسی ایک فریق کی جانب سے اور لینی دوسرے فریق کی جانب دوسرے کے لیے نقصان رساں ثابت ہو، اگرچہ فریقین باہم دوست بھی ہوں۔ کیا تمھارے خیال کے مطابق سایا نیڈیز کا یہ مطلب نہیں ہے؟"
پ :- بیشک یہی ہے ۔"
س :- تو پھر ہم کو اپنے دشمنوں کو اُن کا حق بھی دینا ضروری ہے؟"
پ :- اس میں کیا شبہہ ہے، ہم کو اُن کا حق دینا چاہیے۔ اور ظاہر ہے کہ دشمن کو دشمن کا حق ادا کرنا اُسکو نقصان پہونچانا ہے کیونکہ نقصان ہی فریقین کی مناسبت سے مناسب بھی ہے ۔"
س :- تو اس سے ثابت ہوا کہ سایا نیڈیز نے مثل دیگر شاعروں کے انصاف کی تعریف مثل ایک چیستاں کے کی ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے اُن کے نزدیک انصاف سے یہ مطلب ہوا کہ ہر شخص کو وہ چیز دی جائے جو حسب موقع ہو۔ اور اسی حسب موقع کو وہ واجبی یا حق سے تعبیر کرتے ہیں۔ "اچھا، تو ایسی صورت میں تم کیا کہوگے کہ اگر کوئی شخص بعد تعریف مذکورہ بالا کے سایا نیڈیز

سے یہ سوال کرے کہ فرض کیجیے فن طب میں واجبی اور مناسب چیز کیا ہے اور اس کا حاصل کرنے والا کون ہے۔ تمہارے نزدیک اُن کا اس صورت میں کیا جواب ہوگا؟"

پ۔ ایسی صورت میں اُن کا یہ جواب ہوگا کہ بدن حاصل کرنے والا ہے اور ادویہ اور ماکولات ومشروبات اشیاے مناسب اور واجبی ہیں۔"

س:۔ اور ایک دوسرے فن مثلاً طباخی میں سوال مذکورہ کا کیا جواب ہوگا؟"

پ:۔ تیار کھانے حاصل کرنے والے ہیں اور مصالحہ وغیرہ اشیاے مناسب وواجبی ہیں۔"

س:۔ بہت ٹھیک ہے۔ پس اسی طرح اُس فن میں جس کو ہم انصاف کہہ سکتے ہیں اشیاے مناسب اور حاصل کرنے والے علی الترتیب کون ہیں؟"

پ:۔ جوابات مذکورہ بالا کی بنا پر نفع اور نقصان اشیاے مناسب ہیں اور دوست اور دشمن ان کے حاصل کرنے والے ہوے۔"

س:۔ تو انصاف سے سائمانیڈیز کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ دوستوں کو نفع اور دشمنوں کو ہم نقصان پہونچائیں۔"

پ:۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔"

س اب بیماری کی صورت میں کون دوست کو نفع اور دشمن کو نقصان پہونچا سکتا ہے۔ جہاں تک کہ صحت اور مرض کا تعلق ہے۔"

پ:۔ طبیب۔"

س:۔ اور ایک سفر بحری میں کون دوستوں کو نفع اور دشمنوں کو نقصان پہونچا سکتا ہے، جہاں تک کہ بحری خطرات کا تعلق ہے۔"

پ:۔ ناخدا۔"

س:۔ اچھا تو کس معاملہ میں اور کس غرض سے ایک منصف آدمی اپنے دوستوں کو نفع اور دشمنوں کو نقصان بہتر طریقے سے پہونچا سکتا ہے؟"

پ:۔ میرے نزدیک مثلاً لڑائی کے معاملات میں بحیثیت دوستوں کے معاون اور دشمنوں کے مخالف کے۔"

س بہت درست۔ تو اب اے میرے عزیز پولیمارکوس! تم کو اسکے تسلیم کرنے میں تو کوئی عذر

پ: بیشک۔"
س: اسی طرح جہازراں خشکی کے رہنے والوں کے واسطے"
پ: جی اور کیا!"
س: تو پھر منصف آدمی بھی اُن لوگوں کے واسطے بیکار ٹھہرا جو برسرِ جنگ ہوں"
پ: اس کا تو میں قائل نہیں ہوں"
س: تو پھر انصاف بحالت امن بھی کارآمد ہوا؟"
پ: بیشک!"
س: یہی حالت فن زراعت کی بھی ہے"
پ: اس میں کیا شبہہ ہے"
س: یعنی وہ ایک ذریعہ محاصل زمین کے حاصل کرنے کا ہے"
پ: جی ہاں"
س: اسی طرح جوتے بنانے والے کا کام بھی مفید ہے؟"
پ: جی ہاں بیشک ہے"
س: یعنی وہ ایک ذریعہ جوتے حاصل کرنے کا ہے"
پ: کیا شک ہے"
س: پس تو اب تمہارے خیال کے مطابق انصاف بحالت امن کس چیز کے استعمال یا اکتساب کا معاون ہے"
پ: معاہدوں کا"
س: اور معاہدوں سے تمہاری مراد شراکت ہے یا کچھ اور؟"
پ: البتہ شراکت ہے"
س: تو اس صورت میں فرض کرو ڈرافٹ[1] (draughts) کے کھیل میں ایک منصف آدمی یا ایک اچھا ڈرافٹ کا کھلاڑی ڈرافٹ کے کھیل کے لیے زیادہ موزوں شریک ہو سکتا ہے؟"
پ: ڈرافٹ کا کھلاڑی"
س: اسی طرح معماری اور سنگ تراشی کے کاموں میں کیا ایک منصف آدمی ایک معمار یا سنگتراش

---

[1] غالباً اس سے وہی ڈرافٹ مراد ہے جو اس زمانہ میں رائج ہے۔ بہرطور انگریزی ترجمہ میں یہی لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم اصل میں کونسا کھیل ہے۔

سے بہتر شریک ہو سکتا ہے؟"

پ "ہرگز نہیں"

س "تو بتاؤ کہ پھر کس کام میں ایک منصف آدمی کو ہم ایک بین کار پر ترجیح دے سکتے ہیں جس طرح کہ بین نوازی میں بین کار کو منصف پر ترجیح دیتے ہیں؟"

پ "میرا خیال ہے کہ شراکتِ زر میں"

س "سوائے اسکے جبکہ شراکت کی غرض یہ ہو کہ روپیہ لگایا جائے۔ مثلاً چند شرکاء جب کوئی چیز فرض کیجیے گھوڑا مول لینا یا بیچنا چاہیں تو اس صورت میں میرے خیال میں ایک تاجر اسپ بہتر شریک ہو سکتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے؟"

پ "جی ہاں ایسا ہی ہے"

س "پھر فرض کرو کہ ایک جہاز بیچا یا خریدا جائے تو اس صورت میں جہاز بنانے والا یا جہاز راں بہتر شریک ہوگا"

پ "ایسا ہی تو معلوم ہوتا ہے"

س "جب اتنا معلوم ہو گیا، تو اب یہ بتاؤ کہ وہ موقع کب آئے گا جب سونے چاندی کے استعمال کی غرض سے ایک منصف شخص اور دوسرے آدمیوں سے زیادہ مفید شریک ثابت ہوگا؟"

پ - "جب آپ اپنے روپے کو زیرِ امانت یعنی محفوظ رکھنا چاہتے ہیں"

س "یا یوں کہو جبکہ وہ غیر مصرف کر دیا جائے نہ کہ اُس سے کوئی مصرف لیا جائے"

پ "جی ہاں اور کیا"

س "تو اسکے یہ معنی ہوئے کہ انصاف کا تعلق از راہ مفید ہونے کے روپیہ کے ساتھ اُسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ روپیہ بیکار اور غیر مصرف کر دیا جائے"

پ "جی ہاں۔ بظاہر تو یہی نتیجہ نکلتا ہے"

س "پس اسی طرح جب تم ایک باغبانی قینچی اپنے پاس صرف رکھنا چاہتے ہو تو انصاف ایک مفید چیز ہے۔ عام اس سے کہ تم کسی کی شراکت کرو یا نہ کرو۔ مگر جب تم اُس قینچی کو استعمال میں لانا چاہو اُس وقت انصاف کی جگہ فنِ باغبانی لے لیتا ہے"

پ "ظاہر ہے"

س "پھر یہ بھی ٹھیک ہوگا کہ جب تم ایک ڈھال یا ایک بین کو استعمال کیے رکھنا چاہتے ہو،

تب البتہ انصاف ایک مفید چیز ہے مگر جبکہ تم اُن دونوں چیزوں کے استعمال کے خواہشمند ہو تو تم کو سپاہی یا بین نواز کے فن کی ضرورت ہوگی"

پ۔ "بیشک ہوگی"

س۔ "اسی طرح اور چیزوں کا بھی حال ہوگا جس سے نتیجہ یہ نکلا کہ انصاف بیکار ہے جبکہ کسی چیز سے کام لیا جائے اور کارآمد ہے جبکہ کسی چیز سے کام نہ لیا جائے"

پ۔ "ایسا ہی معلوم ہوتا ہے"

س۔ "تب تو میرے عزیز دوست! انصاف کوئی قیمتی چیز نہ ہوا۔ جبکہ اُس کا استعمال صرف اشیاء کی بیکاری کی صورت میں ہو سکتا ہے۔ اچھا آؤ اب ہم اس بحث کا ایک دوسرا رخ اختیار کریں،

—— فرض کرو ایک گھونسہ باز جو گھونسا مارنے میں کامل ہے، کیا گھونسوں سے بچنے میں کامل مہارت نہ رکھتا ہوگا؟"

پ۔ "ضرور رکھتا ہوگا"

س۔ "اور جو شخص کسی بیماری کے روکنے اور اُسکے حملوں کے دفع کرنے میں مہارت رکھتا ہو، کیا وہ دوسروں میں اُسی بیماری کو پیدا نہ کرسکے گا؟"

پ۔ "میرے نزدیک ضرور کرسکے گا"

س۔ "بس اسی طرح کوئی شخص جو فوج کی حفاظت کرنا خوب جانتا ہو وہ یقیناً دشمن کی تدابیر جنگ اور دیگر رازوں کو بخوبی چرا بھی سکتا ہے"

پ۔ "بیشک"

س۔ "یعنی جس چیز کی حفاظت میں اُسکو مہارت ہے اُسکے چرانے میں بھی اُسکو مہارت ہے"

پ۔ "ایسا ہی تو معلوم ہوتا ہے"

س۔ "اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ اگر کوئی منصف شخص روپیہ کی حفاظت خوب کرسکتا ہے تو وہ اُسکو چرا بھی خوب سکتا ہے"

پ۔ "منطقی نتیجہ تو یہی نکلتا ہے"

س۔ "بس تو اب معلوم ہوتا ہے کہ منصف شخص ایک قسم کا چور ہے۔ اور یہ ایک مسئلہ ہے جس کو تم نے یقیناً ہومر[1] (Homer) سے سیکھا ہے۔ کیونکہ ہومر کے نزدیک

---

[1] سب سے پہلا اور سب سے بڑا مشہور [illegible] گزرا ہے۔ [illegible]

آٹولیکوس[1] (Autolycus) جو اوڈیسیوس[2] (Odysseus) کا نانا تھا بہت اچھا شخص ہے صرف اس وجہ سے کہ وہ اور لوگوں سے زیادہ چوری اور دغا بازی کے فن میں مشاق تھا۔ پس تمھارے اور ہومر اور سائمونیڈیز کے خیال کے مطابق انصاف ایک قسم کی چوری کا فن ہے جس کی غرض یہ ہے کہ دوستوں کی مدد کی جائے اور دشمنوں کو نقصان پہونچایا جائے۔ کیا یہ تمھارا مطلب نہیں تھا؟"

پیما "نہیں۔ یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ مگر اتنے عرصہ کے سلسلۂ کلام کے بعد مجھ کو اپنے ابتدائی الفاظ یاد نہیں۔ بہرطور یہ میری رائے اب بھی ہے کہ دوستوں کی امداد اور دشمنوں کو نقصان پہونچانا انصاف ہے۔"

س "اچھا اب یہ بتاؤ کہ کسی شخص کے دوستوں سے کیا وہ لوگ مراد لیے جائیں جو بظاہر اُسکو نیک معلوم ہوتے ہوں، یا وہ جو دراصل نیک ہوں گو بظاہر نہ معلوم ہوتے ہوں۔ اور دشمنوں کی بھی کیا اسی اصول پر تعریف کی جائے؟"

پیما "میں یہ ضرور کہوں گا کہ آدمی کو چاہیے کہ جس کسی کو نیک سمجھے اُس سے محبت کرے اور جس کسی کو بد سمجھے اُس سے نفرت کرے۔"

س "کیا لوگ اس معاملہ میں غلطی نہیں کرتے اور نیکوں کو بد اور بدوں کو نیک اکثر ایسی غلطی

... برس پیشتر تھا۔ یونانی شاعری بلکہ تمام متمدن دنیا کی شاعری کا باپ مانا جاتا ہے اور اسی قدامت کی وجہ سے مختلف ممالک کے قدیم مشہور شاعروں کو اُس سے مناسبت دیتے ہیں۔ مثلاً فردوسی ایران کا ہومر، چاسر انگلستان کا ہومر، والمیک ہندوستان کا ہومر کہلاتا ہے۔ اسکی مشہور تصانیف الیڈ (Iliad) اور اوڈیسی (Odyssey) ہیں۔

[1] یہ شخص قدیم الایام کا ایک ہیرو گذرا ہے۔ یہ اپنی چالاکی اور بہت جھوٹے واسطے مشہور ہے۔ قصوں میں لکھا ہے کہ یہ چوری خوب کرتا تھا اور جادو کے زور سے وہ اخفیا اور خود بھی نظر سے غائب ہو جاتا تھا۔

[2] یہ بھی قدیم الایام کا ایک مشہور ہیرو ہے جس نے جنگ ٹرائے (Troy) میں بہت بڑا حصہ لیا تھا۔ اس کا نام یولیسیس (Eulysuss) بھی ہے۔ جنگ مذکور میں اس کے کارنامے رستم کی لڑائی کی طرح مشہور ہیں۔ بعد فراغت جنگ یہ دس برس تک گھومتا رہا اور عجیب عجیب مافوق العادت حرکات اس سے سرزد ہوئیں۔ جس کو ہومر نے اپنی مشہور کتاب اوڈیسی میں قلمبند کیا ہے۔

سے تصور نہیں کرتے ؟"

پ:- "ضرور کرتے ہیں"

س:- "تو ایسے لوگوں کے نزدیک نیک اُنکے دشمن اور بد اُنکے دوست ٹھہرے ؟"

پ:- "بیشک ایسا ہی ہوا"

س:- "اور ظاہر ہے کہ ایسے اشخاص کو ایسے مواقع پر بدوں کی اعانت اور نیکوں کی نقصان رسانی عین انصاف ہے"

پ:- "بظاہر تو ہے"

س:- "مگر اس میں بھی کوئی کلام نہیں کہ نیک لوگ منصف ہوتے ہیں اور بے انصافی انکی فطرت سے دُور ہے"

پ:- "بیشک"

س:- "تو اب تمہارے مسئلہ کے مطابق کوئی شخص جو بے انصافی نہ کرے اُسکو نقصان پہونچانا عین انصاف ہے"

پ:- "نہیں معاذ اللہ! استغفر اللہ! یہ آپ کیا کہتے ہیں۔ یہ تو بہت بُرا مسئلہ ہے"

س:- "سچ ہے۔ تب اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ غیر منصف کو نقصان پہونچانا اور منصف کی اعانت عین انصاف ہے"

پ:- "البتہ یہ مسئلہ پہلے مسئلہ سے بہتر معلوم ہوتا ہے"

س:- "تو پالیمارکوس اس صورت میں نتیجہ یہ ہوگا کہ اُن معاملات میں جن میں لوگوں نے اپنے دوستوں اور دشمنوں کے انتخاب میں غلطی کی ہے اُن لوگوں کو جن کے حق میں غلطی کی گئی ہے اپنے دوستوں کو نقصان پہونچانا انصاف ہوگا کیونکہ اُنکے نزدیک وہ بد ہیں۔ اور اسی طرح اپنے دشمنوں کی اعانت کرنا بھی انصاف ہوگا کیونکہ اُنکے نزدیک وہ نیک ہیں۔ اور اب ہمارا استدلال اُس چیز سے بالکل مغائر ہوگا جسکو ہم سایا نیدیز کی طرف منسوب کرتے ہیں"

پ:- "نتیجہ تو یہ ضرور نکلتا ہے مگر اب مجھکو اجازت دیجیے کہ دوست اور دشمن کی تعریف میں کچھ تغیر و تبدل کروں کیونکہ وہ غلط معلوم ہوتی ہے"

س:- "بشوق سے کرو مگر یہ بتاؤ کہ تمہاری ابتدائی تعریف کیا تھی؟"

پ:- "یہ کہ دوست وہ ہے جو بظاہر نیک معلوم ہو"

س:- "اور اب دوست کی تعریف کیا کروگے؟"

پ - " یہ کہ دوست وہ ہے جو نہ صرف بظاہر نیک ہو بلکہ دراصل بھی نیک ہو۔ اور وہ لوگ جو بظاہر نیک معلوم ہوتے ہیں مگر اصل میں نہیں ہیں وہ دراصل دوست نہیں ہیں بلکہ ظاہری سمجھے جا سکتے ہیں۔ علیٰ ہذا دشمن کی تعریف بھی اسی اصول پر ہوگی "۔

س - " تو اس تعریف سے نیک آدمی یقیناً دوست ٹھہرا اور بد آدمی دشمن "۔

پ - " جی ہاں "۔

س - " اس جدید تعریف سے یہ بات لازم آئے گی کہ انصاف کی تصویر میں ایک اضافہ کرنا ہوگا جو پیشتر ضروری نہ تھا۔ یعنی تعریف اول کے بموجب انصاف ہم دوستوں کے ساتھ نیکی اور دشمنوں کے ساتھ برائی کو سمجھتے تھے۔ اور اب اس نئی تعریف کی رو سے تمہارے خیال کے بموجب یوں کہنا ہوگا " انصاف سے مطلب ہے دوستوں کے ساتھ نیکی کرنا اگر وہ نیک ہوں اور دشمنوں سے برائی کرنا اگر وہ بد ہوں "۔

پ - " جی ہاں۔ جی ہاں۔ یہی میرا مطلب ہے جسکو آپ نے نہایت صحیح الفاظ میں بیان کر دیا "۔

س - " اب میں تم سے یہ پوچھتا ہوں کہ کسی کو نقصان پہونچانا منصف آدمی کا کام ہو یا نہیں ؟ "

پ - " بے شک ہے۔ یعنی جو لوگ بد ہیں اور دشمن بھی ہیں اُن کو نقصان پہونچانا منصف کا فرض ہے "۔

س - " اب یہ بتاؤ کہ گھوڑے نقصان کی وجہ سے بہتر ہوتے ہیں یا بدتر ؟ "

پ - " بدتر "۔

س - " یعنی کتوں یا خود اپنی صفت گھوڑوں کی عمدگی کے مقابلہ میں ؟ "

پ - " گھوڑوں کے مقابلہ میں "۔

س - " اسی طرح کتے نقصان اٹھا کر بمقابلہ عمدہ کتوں کے بدتر ہو جائیں گے نا ؟ "

پ - " اس میں کیا شک ہے "۔

س - " اسی اصول کو مدنظر رکھ کر کیا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ آدمی بھی نقصان اُٹھا کر انسانی فضیلت کی ترازو میں ہلکا پڑ جاتا ہے "۔

پ - " بیشک ہم کہہ سکتے ہیں "۔

س - " کیا انصاف ایک انسانی فضیلت نہیں ہے "۔

پ - " ضرور ہے "۔

س۔ "تو اس سے میرے دوست یہ نتیجہ نکلا کہ نقصان رسیدہ لوگ فضلیت انصاف میں ادنیٰ تر ہو جاتے ہیں۔"

پ۔ "نتیجہ تو یہی نکلتا ہے۔"

س۔ "کیا یہ ممکن ہے کہ ایک موسیقی داں اپنی موسیقی کے زور سے لوگوں کو بے سُرا کر دے؟"

پ۔ "جی نہیں۔"

س۔ "اسی طرح گھوڑے کی سواری سکھلانے والے اپنے فن کے ذریعہ سے لوگوں کو بُرا سوار نہیں بنا سکتے۔"

پ۔ "جی نہیں۔"

س۔ "اگر ایسا ہے تو کیا ایک منصف اپنے انصاف کے ذریعہ سے لوگوں کو غیر منصف بنا سکتا ہے۔ یا بالفاظ دیگر کیا ایک نیک شخص اپنی نیکی کے ذریعہ سے لوگوں کو بد بنا سکتا ہے؟"

پ۔ "جی نہیں۔ یہ بالکل ناممکن ہے۔"

س۔ "تم سچ کہتے ہو۔ اس وجہ سے کہ ٹھنڈا کرنا برودت کی خاصیت ہے نہ کہ بالعکس حرارت کی۔"

پ۔ "جی ہاں اور کیا۔"

س۔ "اسی طرح مرطوب کرنا رطوبت کی خاصیت ہے نہ کہ بالعکس یبوست کی۔"

پ۔ "بیشک۔"

س۔ "تو نقصان پہونچانا بھی بدی کی خاصیت ہے نہ کہ بالعکس نیکی کی۔"

پ۔ "اس میں کیا کلام ہے۔"

س۔ "اچھا اب یہ بتاؤ کہ منصف نیک ہوتا ہے نہ؟"

پ۔ "جی ہاں ضرور۔"

س۔ "تو دوست کیا کسی مخلوق کو نقصان پہونچانا منصف کی نہیں بلکہ اُسکے عکس غیر منصف کی خاصیت ہوئی۔"

پ۔ "آپ بالکل صحیح کہتے ہیں۔"

س۔ "ہماری اس پوری بحث کا یہ نتیجہ نکلا کہ اگر کوئی یہ کہے کہ ہر شخص کو اُسکا حق دینا انصاف ہے۔ اور انصاف سے اُس کا یہ مطلب ہو کہ دوستوں کو فائدہ اور دشمنوں کو نقصان پہونچایا جائے تو یہ دعویٰ غلط ہے۔ کیونکہ ہم ابھی دیکھ چکے کہ کسی کو بھی نقصان پہونچانا انصاف نہیں ہے۔"

پ - "میں تسلیم کرتا ہوں، کہ آپ کا استدلال بالکل صحیح ہے"
س - "تو اب مجھ کو اور تم کو بالاتفاق اُس شخص کی مخالفت کرنا ضروری ہے جو مسئلہ مذکورۂ بالا کو سایمانیڈیز یا بیاس[۱] یا پٹاکوس[۲] یا کسی دوسرے فلسفی کی طرف منسوب کرے"
پ - "بہت ٹھیک - میں مخالفت کے لیے تیار ہوں"
س - "پولیمارکوس! تم کو معلوم ہے کہ اس مسئلہ کا کہ "دوستوں کو فائدہ اور دشمنوں کو نقصان پہونچانا انصاف ہے" اصلی موجد میرے نزدیک کوئی شخص ہے؟"
پ "جی نہیں - ارشاد فرمائیے"
س "میرے خیال میں اس کا اصلی موجد پیری اینڈر[۳] یا پرڈیکاس[۴] یا زرکسیز[۵] یا اسمینیاس[۶] باشندۂ ایتھنز یا کوئی اور دولتمند شخص ہے جو اپنے تئیں بڑا صاحب اقتدار سمجھتا تھا"
پ - "آپ کا خیال بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے"
س "اچھا تو چونکہ اب تک ہم انصاف کی صحیح تعریف تک نہیں پہونچے لہذا ہم کو دیکھنا چاہیے کہ کوئی دوسری تعریف کیا ہو سکتی ہے"

جب ہم دونوں آدمی بحث میں مشغول تھے ہم برابر یہ دیکھ رہے تھے کہ تھریسیماکوس[۷] بار بار مباحثہ میں مزاحم ہوتا اور کوئی اعتراض کرنا چاہتا ہے مگر ہر دفعہ وہ لوگ جو قریب بیٹھے تھے اور بحث کو آخر تک سننا چاہتے تھے اُس کو روک دیتے تھے - جوں ہی میں نے مذکورہ بالا آخری جملہ

---

۱ دیکھو نوٹ صفحہ ا
۲ سات عقلائے یونان میں ہے - زمانہ تقریباً ۵۰۰ قبل مسیح -
۳ یہ بھی سات عقلائے یونان میں ہے - قدیم شہر متیلین کا باشندہ اور شاعر سیفو کا ہمعصر تھا - بالآخر یہ متیلین کا با اختیار حاکم ہو گیا تھا - زمانہ تقریباً ۶۰۰ قبل مسیح -
۴ کارنتھ کا با اختیار بادشاہ تھا - زمانہ تقریباً ۶۰۰ ق م
۵ - اس نام کے دو بڑے اور زبردست یونانی بادشاہ گذرے ہیں - زمانہ پانچویں اور چوتھی صدی ق م
۶ ایران کا زبردست اور مشہور تاجدار تھا - قدیم فارسی مورخ اسکو اسفندیار کہتے ہیں - یونانیوں کا سخت دشمن تھا - اس کا یونان کا حملہ مشہور ہے - بحری جنگ سلامس میں اس نے اپنی فوج اور جہازوں کی تباہی اپنی آنکھ سے دیکھی زمانہ ۴۸۵ لغایت ۴۶۵ ق م
۷ نا معلوم
۸ کلسیڈان کا ایک فلسفی تھا - زمانہ تقریباً ۵۰۰ ق م - افلاطون نے اُسکو اس مکالمہ میں اس مسئلہ کا حامی قرار دیا ہے کہ "قوت اصل حق ہے" جیسا کہ آگے ظاہر ہوگا -

ختم کیا اور تھوڑی دیر کے لیے جلسہ میں ایک خاموشی سی ہوگئی۔ تھراسیماکوس سے ضبط نہ ہوسکا۔ اور اب وہ ہم پر مثل ایک وحشی جانور کے جھپٹ پڑا۔ گویا وہ ہم کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے رکھ دیگا۔ میں اور پولیمارکوس دونوں متعجب اور خوفزدہ ہوگئے اور تھراسیماکوس نے سخت غصہ کے لہجہ میں ہم دونوں کو مخاطب کرکے کہا۔ "سقراط تم کو اور پولیمارکوس تم کو کیا خبط سوار ہوگیا ہے۔ اور کیا حماقت تمھاری اس استمالت سے مترشح ہے جو اثنائے بحث میں تم نے برتی۔ اگر تم کو فی الحقیقت انصاف کی ماہیت سمجھنا ہے تو سوالات ہی پر اپنی بحث کو محدود نہ کرو اور اپنے جواب اور جواب الجواب میں محض لفظی الٹ پھیر سے ایک قسم کی علمی پھبتی کا ہم لوگوں کو تماشہ نہ دکھاؤ۔ یاد رکھو کہ سوال کرنا جواب دینے سے زیادہ آسان ہے۔ جس طرح تم سے سوال پوچھتے ہو ہم کو جواب بھی دو اور ہم کو بتاؤ کہ خود تمھارے نزدیک انصاف کیا چیز ہے۔ مگر ایک بات کا ضرور خیال رکھو کہ انصاف کی اس قسم کی تعریف نہ ہونا چاہیے کہ وہ ایک فرض ہے یا وہ فائدہ بخش یا نفع رساں ہے یا وہ حصول زر کے لیے مفید ہے یا وہ کسی مصلحت پر مبنی ہے۔ اور جو کچھ اسکی تعریف تم پیش کرو نہایت صاف اور ٹھیک ٹھیک الفاظ میں کرو۔ کیونکہ میں تمھارے کسی جواب کو ہرگز قبول نہ کروں گا اگر اُس میں اس قسم کی لغویت ہوگی جو ہم ابھی سن چکے ہیں۔"

جب ہم لوگ اس تقریر کو سن چکے تو میں سخت متحیر ہوا اور خوف زدہ ہوکر مقرر کو دیکھنے لگا اور اگر میری آنکھ اُس پر پہلے نہ پڑ جاتی تو شاید خوف کے مارے میری گھگی بندھ جاتی۔ اور میرے منہ سے کچھ نہ نکل سکتا۔[۱] مگر جسوقت وہ غصہ سے سخت مشتعل ہو رہا تھا، میں نے اُسکے چہرہ کو پہلے دیکھ لیا قبل اس کے کہ وہ مجھ کو دیکھے اور خوف سے تھرتھرائی ہوئی آواز میں میں نے جواب دیا۔ "اے تھراسیماکوس! اس قدر غصہ اور درشتی ہم پر نہ کرو۔ اگر مجھ سے اور پولیمارکوس سے بحث کے اثنا میں مسئلہ کے بیان کرنے میں غلطیاں ہوگئی ہیں تو یقین مانو کہ وہ غلطیاں بالارادہ نہ تھیں۔ اگر ہم ایک گم شدہ اشرفی کو ڈھونڈھنے نکلیں تو تلاش کے اثنا میں ہم ایک دوسرے کی ایسی استمالت ہرگز نہیں کر سکتے کہ نفس معاملہ میں ہم سے کسی قسم کی پہلوتہی ہوجائے اور گم ہو کر یعنی وہ اشرفی ہمارے ہاتھ سے جاتی رہے۔ پھر انصاف ایسی بیش بہا چیز جو ایک سونے کے ٹکڑے سے کہیں زیادہ قیمتی ہے اُس کی جستجو میں ہم کیونکر ایسی کمزوری دکھلا سکتے ہیں جسکا الزام تم ہم پر عائد

---

[۱] یونانیوں کا اعتقاد تھا کہ بھیڑیے کی آنکھ میں ایک قسم کا مقناطیسی اثر ہوتا ہے۔ اگر وہ کسی آدمی کو پہلے دیکھ لے اور آدمی بعد کو اُسکو دیکھے تو آدمی گونگا ہوجاتا ہے۔ سقراط کا اشارہ اسی کی جانب ہے اور ورجل شاعر نے بھی اسکا ایک نظم میں ذکر کیا ہے۔

کرتے ہو۔ میرے عزیز دوست۔ تم کو اختیار ہے جو چاہو میری نسبت خیال کرو مگر میں تم سے صاف کہدوں، میرے نزدیک اس مسئلہ کا حل ہماری قوت سے باہر ہے۔ لہٰذا تم ایسے لائق شخص کو چاہیے تھا کہ ہماری اس بے استطاعتی پر رحم کرتے نہ کہ غصہ"

تھراسیماکوس نے میری تقریر سن کر زور سے قہقہہ مارا اور کہنے لگا

ت۔ "او ہرکیولیز! یہ سقراط کی بناوٹی عاجزی کی ایک مثال ہے۔ میں جانتا تھا کہ یہی پیش آئے گا اور لوگوں سے کہدیا تھا کہ تم خود کسی دوسرے کے سوال کا جواب دینے سے قطعاً انکار کروگے، اپنی لاعلمی ظاہر کروگے، غرضکہ مختلف حیلوں سے اُسکے جواب سے بچوگے۔"

س۔ "تھراسیماکوس۔ تمہاری عقل و ذہانت میں کسی کو کلام نہیں۔ مگر تم اگر کسی سے پوچھو کہ نمبر ۱۲ کے اجزا کیا ہیں۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہدو کہ خبردار جواب میں ہرگز یہ نہ کہنا کہ نمبر ۱۲ نمبر ۶ کا دوگنا یا ۴ کا تگنا یا ۳ کا چوگنا یا ۲ کا چھ گنا ہے۔ اور اگر یہ مہمل جواب کوئی دیگا تو میں ہرگز قبول نہ کروں گا۔ تو تم بخوبی جان سکتے ہو کہ ایسے سوال کا جواب دینے کی کوئی بھی جرأت نہ کرے گا۔ مگر فرض کرو کہ مجیب تم سے یہ کہے کہ اپنا مطلب آپ براہ مہربانی صاف الفاظ میں بیان فرمائیے کیا یہ جوابات جو آپ نے خود رد کردیے ہیں اگر ان میں سے کسی کے دینے کی مجھکو اجازت نہیں ہے تو جناب پھر میں کیا کہوں۔ ان میں سے کوئی جواب اگر صحیح بھی ہے اور اُس کو پیش کرنے کی آپ مجھ کو اجازت نہیں دیتے تو کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میرا جواب صحت سے دُور جا پڑے یا اس کے سوا آپ کا کچھ اور مطلب ہے؟ تو بتاؤ تم اس کا کیا جواب دوگے؟"

ت۔ "کیا خوب! کیا یہ دونوں صورتیں تمہارے نزدیک برابر ہیں؟"

س۔ "میرے نزدیک تو کوئی فرق نہیں ہے۔ بالفرض اگر کوئی فرق ہو بھی تب بھی ان جوابوں میں سے کوئی جواب اگر مجیب کے نزدیک صحیح ہو تو کیا کسی کی ممانعت یا عدم ممانعت سے اُسکے اس فیصلۂ ذہنی پر اثر پڑے گا کہ فلاں جواب صحیح ہے لہٰذا میں اُسکو ضرور دوں گا؟"

ت۔ "کیا اس گفتگو سے تمہارا یہ مطلب ہے کہ تم بھی ایسا کرنے والے ہو۔ اور کیا تم بھی

ؔ ہرکیولیز قدیم الایام کا ایک بہت مشہور ہیرو گذرا ہے۔ یونانیوں کے نزدیک اس سے بڑھ کر کوئی شہزور اور بہادر نہیں تھا۔ اسکے بارہ معرکے یا کارنامے ہیں جو انگریزی میں "لیبر" کہلاتے ہیں۔ اسکی شہرت یونانیوں میں ایسی ہی تھی جیسی ایرانیوں میں رستم کی "او ہرکیولیز" بطور قسم کے استعمال ہوا ہے جیسے "واللہ"۔

اُن جوابوں میں سے جنکو میں نے رد کر دیا ہے کوئی ایک جواب دوگے؟"

س "کوئی تعجب کی بات نہیں اگر میں ایسا کروں، اور بعد کامل غور و فکر کے مجھکو ایسا کرنا واجبی معلوم ہو"

ت "تب بتاؤ مسئلۂ انصاف کے متعلق اگر میں ایک ایسا جواب پیش کروں جو اُن سب سے علٰحدہ اور اُن سب سے بہتر ہو جن کو میں نے رد کر دیا ہے تو تمہارے واسطے کونسی سزا تجویز کیجائے؟"

س "وہی سزا جسکا میرے نزدیک ایک جاہل مستحق ہے یعنی حصول معرفت بذریعہ ایک عالم کے۔ بس اسی سزا کا میں بھی جاہلوں کے ساتھ سزاوار ہوں"

ت "سقراط! تم بھی کس قدر باِمذاق آدمی ہو۔ مگر علاوہ حصول معرفت کے تم کو کچھ دنیا بھی ہوگا"

س "میں ضرور دونگا مگر جب میرے پاس روپیہ ہوگا"

گ "تمھارے پاس روپیہ ہے۔ تھراسیماکوس جہاں تک روپیہ کا تعلق ہے تم بحث کیے جاؤ۔ ہم سب سقراط کی طرف سے دینے کو تیار رہیں"

ت "کیا خوب! تاکہ سقراط اپنی پرانی چال جواب سے بچنے اور دوسروں کی تقریر کاٹنے یا اُسپر اعتراض جمانے کی نہایت کامیابی سے جاری رکھیں"

س "میرے عزیز دوست! یہ بتاؤ کہ کوئی شخص ایسی صورت میں کیونکر جواب دے سکتا ہے جب وہ اولاً صحیح جواب دنیا نہ جانتا ہو اور اقبال بھی کرتا ہو کہ میں نہیں جانتا۔ اور ثانیاً اگر وہ کچھ جانتا بھی ہو اور کچھ کہنے کی جرأت بھی کرے تو تم ایسا قابل شخص اُس پر قدغن کردے۔ پس ایسی صورت میں مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ مقرر تم ہی ہو۔ کیونکہ نفس مسئلہ سے واقفیت کا تم کو دعویٰ ہے اور تقریر کے خواہشمند بھی تم ہو۔ لہٰذا میری اس گذارش کو منظور نہ کرو اور ہم سب کی معلومات اور معرفت میں اضافہ کرو"

(باقی)

مرزا محمد عسکری بی اے

سکرٹری انجمن اردو لکھنؤ

موجودہ طریقۂ تعلیم میں ترمیم کی ضرورت

"ڈالٹن پلین کیا چیز ہے اور اُس کے مطابق کس طرح تعلیم دی جا سکتی ہے؟"

مغربی ممالک کے مدارس کے ترقی خواہ مدرسین اور بہی خواہانِ تعلیم کچھ عرصہ سے موجودہ طرزِ تعلیم سے اُکتا گئے ہیں جس میں طلباء کی جماعتیں بنا کر اوقاتِ تعلیم کو مضامین کے اعتبار سے تقسیم کیا جاتا ہے، اور پھر انضباطِ اوقات پر مذہبی رسوم کی طرح سختی سے عمل کیا جاتا ہے۔ بہی خواہانِ تعلیم نے محسوس کیا ہے کہ گویا وہ ذہین طلباء کو غبی الذہن طلباء کے ساتھ جوتے میں جوتنا اول الذکر کے حق میں مضر ثابت ہوتا ہے اور موخر الذکر کو بھی ذہین طلباء کے ساتھ ہمقدم ہونے کے لیے طاقت سے بڑھ کر محنت شاقہ برداشت کرنی پڑتی ہے۔ مدارس میں گھنٹے مقرر ہیں جنکے بجتے ہی بجلی کی سی سرعت کے ساتھ ایک مضمون سے عین اُس وقت جبکہ طبیعت اس کی طرف بخوبی راغب ہوتی ہے توجہ ہٹا کر دوسرے مضمون میں ذہن لگانا پڑتا ہے جو خلافِ فطرت اور کسل آمیز ورزش ہے۔ پس بہی خواہانِ تعلیم عرصہ سے تغیر و انقلاب کے خواہاں تھے۔ چنانچہ جب امریکہ کی ماہرۂ تعلیم مس ہیلین پارک ہرسٹ نے "ڈالٹن لیبوریٹری پلین" کے عنوان سے اپنی کتاب شائع کی تو امریکہ اور انگلستان کے اساتذہ و معلمین نے اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور نہایت گرمجوشی سے تجربۃً اپنے اپنے مدارس میں جاری کیا۔

اس تجویز کا اصولِ اولیں آزادی ہے۔ طالب علم کو انفرادی طور پر اپنی آزادی استعمال کرنے کی اجازت ہے۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق خاص حدود میں جب جیسے جہاں اور جو کام چاہے کرتا ہے۔ یہ قید نہیں ہے کہ فلاں مضمون کو اتنے منٹ یا گھنٹے پڑھے۔ وہ اپنی مشکلات حسبِ ضرورت دُور کرتا ہے۔ وہ ضابطہ کے جکڑ بندوں میں جکڑا ہوا نہیں ہے، بلکہ ضابطۂ نفس کا پابند ہے۔ اس سے اس تجویز کا دوسرا اصول پیدا ہوتا ہے، یعنی تعاون و تعاضد۔ یا یوں کہو کہ وہ ایک مختصر سی دنیا میں دوسروں کے ساتھ مل کر کام کرتا ہے اور افادہ و استفادہ کرتا ہے اور اس طرح مجلسی روح کو ترقی دیتا ہے۔ اسے ایک کمرہ سے دوسرے کمرہ میں جانے، ایک مضمون چھوڑ کر دوسرے کو اختیار کرنے اور حسب خواہش پہلے مضمون کی طرف عود کرنے کی آزادی ہے۔ اگر وہ پابند ہے تو غیر مرئی قانون کا، جو فقط اسکا اور اسکی جمہوری سلطنت کے دیگر اراکین کا وضع کیا ہوا ہے۔ اگر کسی رکن کی حرکات غیر مرئی قواعدِ مجلس

کے موافق ہیں تو وہ سب کے سامنے جوابدہ ہے۔ اور اُسے کسی افسر اعلیٰ کا ڈر نہیں۔

اس تجویز میں طالب علم کے سال کا کام مقرر کر دیا جاتا ہے۔ اور وہ اپنے سامنے ایک منزل مقصود اور ایک نصب العین رکھتا ہے جسے اسکو حاصل کرنا ہے۔ وہ اپنے کام کو اپنی مرضی کے مطابق ترتیب .... دیتا ہے۔ اور اپنی ذہنی قابلیت اور اپنی اہلیت سے اسے کرتا ہے۔ اُسکے ہمسر بھی چونکہ اس منزل کی طرف جا رہے ہیں اس لیے وہ اپنے ہم سفروں سے تعاون کرتا ہے۔ گو اسکی آخری کامیابی اور کامرانی اُس کی ذات پر منحصر ہے اور جو کچھ وہ حاصل کرتا ہے حقیقی معنوں میں اسکی "شخصی" ہے۔ ذہنی قوائے داخلیہ کو نمو دے کر بیرونی دنیا میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور اس اعتبار سے وہ مدرسہ میں قید نہیں بلکہ وہ فضائے آزادی میں سانس لیتا ہے۔ مگر اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ ڈالٹن کی تجویز منضبط قواعد و ضوابط کا مجموعہ ہے، جن سے طالب علم آگے پیچھے نہیں جا سکتا۔ بخلاف اسکے وہ صرف ایک قسم کی رہنمائی ہے جسے سالک اپنے مسلک کے مطابق اور طالب علم اپنے مقصد کے لحاظ سے کام میں لا سکتا ہے۔ مدرسہ اور اُس کے کارکنان اپنی حاجت کے مطابق اس میں ترمیم کرنے کے مجاز ہیں۔ یہ ایک اصول ہے جسے موقع کے مطابق استعمال کرنا چاہیے۔

اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سب سے پہلے تو مدرسہ کے نظام الاوقات کا خاتمہ کر دیا جائے۔ گھڑیال بجنے بند کر دیے جائیں اب کوئی پابندی نہیں ہے کہ فلاں وقت فلاں مضمون اور اتنے بجکر اتنے منٹ پر اتنے وقت کیلیے فلاں مضمون مطالعہ کرنا ہے۔ طلباء مدرسہ میں پڑھنے آئیں اور وہ ایک مضمون کو جتنی دیر چاہیں پڑھیں۔ یا جس قدر جس مضمون میں کمزور ہوں اُسی قدر اُس مضمون پر وقت صرف کریں اور کوشاں ہوں۔ اور جب ایک سے جی اُکتا جائے تو دوسرے مضمون کو شروع کریں۔

نصاب تعلیم اور جماعت بندی پرانے دستور کے مطابق رہیں مگر زبانی تعلیم کا دستور کم کر دیا جائے۔ ایک سال کے کام کا خاکہ مرتب کرنے کے بعد اُسے چند حصوں میں تقسیم کر دیا جائے تو زیادہ سہولت ہو گی تاکہ ذہین ترین۔ ذہین اور غبی طلبا کے درمیان بلحاظ اہلیت تقسیم ہو سکے اور طالب علم خود انتخاب کرے کہ وہ کونسا حصہ اختیار کرے گا۔ اوسط کے لحاظ سے ہر حصہ یکساں ہوگا فرق صرف مشکل اور آسان کتب یا تحریری مشقوں کا ہوگا۔ مس پارک ہرسٹ نے اپنے مدرسہ میں یہ دستور رائج کیا ہے کہ مڈل تک طلبا اپنے اپنے حصہ کو پورا کرنے کا ٹھیکہ لیتے ہیں اور ایک ایک فارم پر کر کے اُستاد کو دیتے ہیں جو اُن کے اجارہ کے پایۂ تکمیل کو پہونچ جانے پر اُنھیں واپس دیدیا جاتا ہے جسکا مطلب مروجہ معنوں میں یہ ہے کہ "وہ پاس ہوگئے ہیں"۔

سہولیت کے خیال سے نصاب کو "مضامین ضروری" "مضامین معمولی" میں تقسیم کیا جائے۔ تقسیم اس اعتبار سے نہیں ہو کہ فلاں مضمون ضروری ہے اور فلاں غیر ضروری، بلکہ اس لحاظ سے کہ کسے ترقی دینے کا معیار ہے اور کسکو زیادہ وقت دینے کی ضرورت ہے۔ طالب علم کو اس کا اجارہ نامہ اُس وقت واپس دیا جائے جب وہ سارے مضامین کو کما حقہٗ پورا کرے اور اگر وہ ۶، ۷ ماہ ہی میں اپنے سارے فارم لے لے تو اسے اوپر کی جماعت کا نصاب شروع کرا دیا جائے۔

مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ تقریری کاموں کو بالکل ہی خیرباد کہہ دیا جائے گا کم از کم ابتداء میں ان سے ضرور کام لینا پڑے گا اور مدارس چاہیں تو صبح کا وقت اس کام کے لیے وقف کر دیں اور اکیلے اکیلے مضامین پر سبق دیں اور شام کو اجتماعی اسباق ہوا کریں نیز اجتماعی حالت میں "اہم مضامین" میں اگر کوئی ایسی مشکل بات ہو جو سب طالبعلموں کے لیے مفید خیال کی جائے تو استاد چند منٹ کے لیے سب طلباء جماعت کو اکٹھا کر سکتا ہے اسے سبق لینے کے بجائے "جلسۂ مشاورت" کہنا بجا ہے۔ طلباء اس قسم کے جلسوں میں نہایت شوق اور سرگرمی ظاہر کریں گے بعض مضامین میں تقریری اسباق اشد ضروری ہیں۔ مثلاً غیر زبان جس میں تلفظ وغیرہ کی مشکلات کے باعث طلباء کا انفرادی کام مشکل ہے۔ لیکن ریاضی میں انفرادی کام زیادہ مفید ہے۔ خصوصاً چھوٹی جماعتوں میں جہاں طلباء کی لیاقتیں مختلف اور واقفیت کم ہوتی ہے اور جماعت کے ساتھ کام کرنے کے بجائے خالی بیٹھے وقت گذاری کرتے ہیں انکو اپنی عمر و حالت کے موافق علیحدہ علیحدہ مشق کی ضرورت ہے۔

طلباء کی ترقی کا اندازہ لگانے کے لیے مس پارک ہرسٹ نے تین قسم کے گراف وضع کیے ہیں ایک گراف میں اُستاد اپنے ہر طالب علم کی اپنے اپنے مضامین میں ترقی کا اندازہ لگاتا ہے دوسرے گراف میں طالب علم اپنے تمام مضامین میں ترقی کا اندازہ لگاتا ہے اور تیسرے گراف میں جماعت کی مجموعی ترقی کا انفرادی اندازہ لگتا ہے۔

ابتداء میں اگر ہر ماہ کے کام کو ہفتہ وار تقسیم کر لیا جائے تو بہت مفید ہوگا گر ہفتہ بھر کا کام بھی طالب علم ایک نشست میں نہ کرے گا اس لیے اس سے بھی کم وقت کو معیار مقرر کرنا چاہیے مثلاً ایک غیر زبان کا ایک ہفتہ کا کام اس طرح تقسیم ہو سکتا ہے کہ قواعد صرف و نحو کے لیے دو دن۔ ترجمہ اور زبانی پڑھائی دو دن۔ ڈالٹن پلین کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس سے طالب علم کے سامنے میدان عمل کھل جاتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ اُسے کس قدر کام کرنا ہے اور اسکو کام کا شوق پیدا ہوتا ہے [illegible] کام کی تقسیم کی جائے۔

اس تجویز سے جو فائدہ مترتب ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اُستادوں کے ساتھ مغز خوری کرنے کے بجائے طلباء کام کا زیادہ تر حصہ خود کرتے ہیں - جو طالب علم تقریری اسباق میں اپنا وقت اِدھر اُدھر دیکھ یا پھر کر ضایع کردیا کرتا تھا اب اُسے سنجیدگی سے کام کرنا پڑتا ہے ورنہ اُسے خوف ہے کہ اپنے ہمسروں میں خفت برداشت کرنی پڑیگی - اور چونکہ وہ شوق سے کام شروع کرتا ہے اس لیے وہ کامیاب بھی ہوجاتا ہے - شرمیلے طلباء جو جماعت میں اُستاد سے کوئی بات پوچھنے سے جھجکتے تھے اب بلا تامل تنہا اُستاد کے پاس جاکر اپنی شکایات رفع کر لیتے ہیں - اس سے اُستاد اور طلباء کے تعلقات گہرے ہو جاتے ہیں - طلباء کتب کے باقاعدہ استعمال، ضمیموں اور اشاروں کی تلاش میں کوئی دقت محسوس نہیں کرتے - اس طرز تعلیم کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ جماعت کو ترقی دینے میں جو مشکلات پیش آتی ہیں وہ خود بخود رفع ہو جاتی ہیں - ہر طالب علم خود بخود ترقی کرتا ہے جب اسکا ایک سال کا کام بخوبی ختم ہو جاتا ہے تو وہ دوسرے سال کا کام شروع کر دیتا ہے - جو طالب علم بیماری یا کسی اور وجہ سے رخصت پر چلے جاتے ہیں وہ اپنا کام وہیں سے شروع کر دیتے ہیں جہاں سے چھوڑ کر گئے تھے - گھر کا کام (ہوم ورک) قریب قریب طلباء کی مرضی پر چھوڑ دیا جاتا ہے، کوئی کام مقرر نہیں کیا جاتا مگر جو طالب علم پیچھے رہ جاتے ہیں وہ پیش قدمی کرنے کے لیے گھر پر بھی کام کرتے ہیں جو طالب علم ایک مضمون میں ہمیشہ پیچھے رہتا ہو اور باقی مضامین میں خاصا ہو اُستاد اپنے فہم کے مطابق اس خاص مضمون میں سہل کام لیتے ہیں تاکہ اُسکی ترقی میں ناجائز رخنہ اندازی نہ ہو -

جن اصولوں پر اس پلین کا مدار ہے وہ ہر عقلمند کے نزدیک مسلمہ ہیں - کیونکہ کون شخص اس حقیقت نفس الامری سے انکار کر سکتا ہے کہ تعلیم کا یہ مقصد نہیں ہے کہ انسان میں جو قوی غیر ترقی یافتہ ہیں انکو ترقی دے اور اسکے لیے بہترین راستے بتائے اور اعتماد نفس اور ضبط نفس کا سبق دے - جو طرز تعلیم اس مقصد کے حصول میں ہمارے موجودہ طرز تعلیم کی نسبت ہم کو زیادہ امداد دیگا وہ ہندوستان کے معاشرتی اور سیاسی مسائل کا زیادہ خوبی سے حل کر سکے گا - ہندوستان کے شہریوں میں انہی صفات حسنہ کا فقدان ہے -

اس "پلین" پر عمل پیرا ہونے سے پیشتر اسکے اخراجات و صعوبات کا اندازہ لگا لینا چاہیے ہم اس پلین کے اصولوں پر خواہ کتنی ہی وفاداری اور ہوشیاری سے کاربند ہوں نشیب و فراز راہ میں ضرور حائل ہوں گے - سب سے اول تو ہمیں اساتذہ کی مشکلات کا سامنا ہوگا جس سے مخالفین کو جرح و قدح کرنے اور آوازے کسنے کا موقع ملے گا - یہی وجہ ہے کہ ان مشکلات کا مقابلہ کرنے کے

لیے فہم سلیم اور عقل کی ضرورت ہے۔ وہی فروعات کا فیصلہ کرسکتی ہے کہ کس بات کو اختیار کیا جائے اور کس کو ترک کیا جائے۔

اب فرض کرو کہ عزم فہیم اور عقل سلیم دونوں حائل ہیں تو ہندوستان کے خاص حالات اس کی راہ میں حائل ہوں گے۔ سب سے پہلے عملۂ اساتذہ ان اعلیٰ درجہ کی قابلیت کی ضرورت ہے محض ایم اے۔ بی ٹی۔ ایل ٹی۔ پاس کر لینا کافی نہیں جو استادصاحبان شب و روز کتب کی جستجو اور مطالعہ میں مشغول رہتے ہیں نہایت غور و خوض کے ساتھ تعلیمی معاملات میں دلچسپی لیتے ہیں اور سالہاسال کا تجربہ اور دیرینہ ملازمت رکھتے ہیں ظاہرداری، تصنع اور بناوٹ کی باتوں سے نفرت کرتے ہیں اُن کا دَم غنیمت ہے۔ ہیڈماسٹر کو نہایت توجہ سے کام کرنے کے باوجود اسکا انتظام کرنے اور آہستہ آہستہ سامنے آنے والی مشکلات کو دور کرنے میں وقت لگے گا اور استاد کو یہ دقت ہوگی کہ اُسے متغیر حالات کے ساتھ نباہنا پڑے گا اُن عادتوں کو بھلانا پڑے گا جن پر وہ اب تک فطرت ثانیہ کی طرح کاربند رہا ہے جدید نظام کے ماتحت اس کا واسطہ ہر طالب علم سے ہے ایک جماعت کو پڑھانے کے بجائے اس کا کام ہوگا کہ

۱۔ کمرہ میں خاموش انفرادی یا اجتماعی مطالعہ کا انتظام کرے۔
۲۔ ہر سائل کو بتائے کہ اُسکے کام کا کس قدر حصہ ہے اور نصاب تعلیم کی تقسیم کس طرح ہے۔
۳۔ طلباء کو مشورہ دینا اور بوقت ضرورت طلباء کو مدد دینا جبکہ کوئی خاص اور مشکل مسئلہ درپیش ہو۔
۴۔ جو سامانِ تعلیم اور کتب حوالہ موجود ہوں اُن کے متعلق اطلاع دینا۔
۵۔ ہر ایک طالب علم کی ترقی کا باقاعدہ اندازہ لگاتے رہنا۔
۶۔ جماعت کے کام کی تقسیم یا نظام نامہ تعلیم کی مفصل تشریح جو ہر طالب علم کی قابلیت کے مطابق ہو اُس میں عملہ کے دیگر اساتذۂ معلمین سے مشورہ کرنا۔

روایات کہنہ کو یکلخت ترک کرکے اس "بدعت حسنہ" پر کاربند ہونا ذرا مشکل ہے۔ اسکے لیے ایسے مدرسین کو رکھنا جو ایک دو سال میں مدرسہ کو خیرباد کہدینے والے ہوں مفید نہ ہوگا۔ ڈگریدار استاد بجائے طلبا اور مدرسہ کی ترقی کے اپنا رُخ دیکھتے ہیں اور گورنمنٹ و بورڈ کے مدرسین مدرسہ کے ساتھ گہرا تعلق رکھنے کے بجائے سلسلۂ ملازمت سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ اور اُنکی یہ خواہش کہ ترقی ملے اور گھر کے نزدیک ہوتے جائیں تبدل و انتقال کو بسرعت عمل میں لاتی ہے۔

اس پلین کو جاری کرنے کے لیے ایک اعلیٰ پیمانے کا قومی اسکول ہونا چاہیے جو کسی مشہور جگہ

واقع ہو اور اُس میں اساتذہ اسکے دیرینہ ملازم، تجربہ کار اور اسی درسگاہ کے پُرانے طالبعلم (اولڈ بوائے) ہوں جن میں قدرۃً درسگاہ سے محبت اور اُسکے طلباء سے بھائی چارہ ہوتا ہے۔ ہمارے مسلم یونیورسٹی اسکول علیگڈھ سے بہتر اس پلین پر تجربہ کرنے کے لیے دوسری درسگاہ نہیں اس اسکول کو بھی اس پلین پر عمل کرنے کی سخت ضرورت ہے یہاں اکثر مختلف لیاقتوں، عادتوں اور زبانوں کے طلباء دور دراز مقامات سے آتے ہیں جو سرکاری نصاب کے مطابق تعلیم پاتے اور موجودہ طرز تعلیم سے فائدہ اُٹھانے سے قاصر رہتے ہیں۔ بعض مضامین میں اپنا وقت بیکار کھوتے ہیں اور تعلیم سے بیدل ہوکر ناکامیاب واپس جاتے ہیں یا کامیاب ہونے کی خاطر برداشت سے زیادہ محنت اور خرچ کرتے ہیں۔ اس پلین کا تقاضا یہ ہے کہ اُستاد کتب حوالہ کے مضمون سے کماحقہٗ واقف ہو اور جب کوئی طالب علم پوچھے تو وہ جھٹ اُسے راہ راست پر لگا سکے اور اُسے ہر اُس نئی کتاب کا خیال رہے جو اُس کے متعلمین کے لیے کسی مضمون میں مفید ہوسکتی ہے اور نئی کتب کا اپنی مضمون کے کتب خانہ میں اضافہ کرتا رہے۔ ان حالات میں یہ ممکن ہے کہ وہ اُستاد جو کئی مضامین میں مہارت حاصل کرنی چاہے کسی ایک میں بھی کماحقہٗ کامیاب نہ ہو۔ اُستاد میں زیادہ صبر و استقلال، زیادہ فہم و ذکا، اور اپنے مضمون کے متعلق زیادہ وسیع معلومات کی ضرورت ہے۔

اُستاد کے بعد کمرہ اور کتب نصاب کی ضرورت ہے۔ کمرہ بحیثیت کمرۂ جماعت آئندہ نہ ہوگا اسکی جگہ کمرۂ مضمون لیگا۔ ہر ایک مضمون کے کمرہ میں ہر جماعت کے طالب علم اپنے اپنے وقت پر آکر تشنگی علم سیرابی حاصل کریں گے کم تعداد طلباء کی جماعت والے مدارس عمدہ کام کرتے ہیں ہر مضمون کے لیے ایک خاص کمرہ اور خاص اُستاد ہونا چاہیے جسکا سامان جدا ہو۔ بدقسمتی سے ہمارے اسکولوں میں جہاں سامان کی کمی ہے وہاں ایک بڑا نقص یہ بھی ہے کہ اگر ایک مضمون کے لیے کوئی خاص اُستاد ہے تو اُسکے لیے کوئی خاص کمرہ اور سامان نہیں اور کسی مضمون کا کوئی خاص کمرہ اور کچھ سامان ہے تو اسکے لیے خاص اُستاد نہیں۔ ایک کمرہ پر زیادہ مدرسین کو حق دینا اُنکے کام میں خرابی پیدا کرتا ہے اور ایک خاص مضمون میں مدرسین کی شرکت تعلیم میں سدِراہ ہوتی ہے۔ اس طرزِ تعلیم میں کمرے بڑے بڑے ہونے چاہییں جن میں ایک مضمون کے لیے کئی جماعتوں کے طلباء آسکیں۔ کمروں کی کمی کے لیے ڈبل شفٹ سسٹم جاری کرنا چاہیے ہر کمرہ میں اُس مضمون کے متعلق کتب حوالہ جات کا ایک ذخیرہ سامان و نقشہ جات وغیرہ ہونے چاہییں ہر کمرہ میں ایک اُستاد مقرر ہو جو اس مضمون کا ماہر ہو۔ اُسکا کام ہر جماعت میں رعب و داب کے ساتھ ضبط قائم رکھنا ہی نہیں ہے بلکہ مشکلات رفع کرنا۔ کتب منتخب کرنا، تحریری کام درست کرنا اور جو طالب علم اُس سے مدد طلب کرے اُسکی مدد کرنا ہے۔ فرض کرو کہ ایک گھنٹہ کے کام کے بعد ایک طالب علم کا جی ریاضی سے

الگ کیا ہے اور وہ ڈرائنگ کرنا چاہتا ہے تو وہ ڈرائنگ کے کمرہ میں چلا جائے اُسکے بعد اسکا جی چاہے وہ جغرافیہ کے کمرہ میں چلا جائے یا تاریخ، جغرافیہ، انگریزی یا عربی یا فارسی کے کمرہ میں جا بیٹھے یا فرض کرو کہ ایک طالب العلم کا ایک مضمون باقی ہے اور وہ اُسکے کمرہ میں جانا چاہتا ہے - مگر وہاں جگہ نہیں ہے - تو وہ اسکا ذکر اُستاد سے کرے اور اُستاد علامت سے مخاطب کرکے کہے کہ ان میں سے کوئی طالب علم دوسرے کام میں لگ جائے اور ایک نشست خالی کر دے یا اپنے پاس بٹھالے اور مل کر کام کرے ایک دوسرے کو مدد دے - عادت پڑ جانے پر اُستاد کو مخاطب کرنے کی ضرورت نہ ہوگی - طلبا خود اشاروں پر کام کرنے لگیں گے

اب ہیڈ ماسٹر کے کام اور اساتذہ کی تیاری پر غور کرتے ہوئے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ہیڈ ماسٹر کو ضرورت ہے کہ ڈالٹن پلین کے موضوع پر جس قدر کتب دستیاب ہوسکیں اُن کا عمیق نظر سے مطالعہ کرے جو اساتذہ اس پلین پر کاربند ہوں انکو خالی بیٹھا ہوا خیال نہ کرے - اس پلین میں اجتماعی تعلیم سوائے زباندانی کے کم اور انفرادی تعلیم زیادہ ہے - پہلے ایک دو سال تک سہ ماہی کام کی نہایت احتیاط سے فروعات و تفصیلات میں نگرانی کرنی پڑیگی - قلتِ مدرسین کی حالت میں قریب ترین مشابہت کے دو مضمون ایک مدرس کو دیئے جاسکتے ہیں - مثلاً تاریخ و جغرافیہ، جغرافیہ و سائنس، تاریخ و انگریزی، ڈرائنگ اور دستکاری مگر نیچر اسٹڈی اور ریاضی کا جوڑ نہیں، اسی طرح ریاضی اور زباندانی کا جوڑ نہیں - جہاں اسکا خیال نہیں وہاں کے مدرس ہمیشہ پریشان و بدنام اور ناکامیاب رہتے ہیں - اور یہ نتیجہ تمام طلباء کی عمر بربادی کا پیغام ہے -

ڈالٹن پلین کے موضوع پر حسب ذیل کتب کا مطالعہ نہایت مفید ہے :-

١- ڈالٹن پلین اسائنمنٹس مصنفہ آربسٹ جلد اول و دوئم
٢- ڈالٹن لیبوریٹری پلین مصنفہ مس ایچ پارک ہرسٹ
٣- اخبار ٹائمز کے تعلیمی ضمیمہ کے مضامین -

سید نواب علی رضوی - سی ٹی - ایف سی آئی - ایم بی ٹی
مسلم یونیورسٹی اسکول علیگڈھ

مشیرِ قانونی

تہذیب یافتہ دنیا کی مایحتاجِ حیات میں، ہوا اور روشنی کے بعد سب سے اونچا مرتبہ قانون کا ہے؛ اُس کی خوراک و پوشاک ہو، یا نشست و برخاست، رفتار و گفتار ہو۔ یا۔ داد و ستد، وہ، قانونِ اخلاق و معاشرت سے قانون تعزیر و تسخیر تک، سوتے جاگتے کسی نہ کسی قانون کی پابندی پر عامل ہے۔ اس ہیجانِ قانون پسندی میں وہ اس درجہ دیوانہ وار بڑھتی ہے کہ اپنے حدودِ اختیارات سے باہر ہونے والے انقلاباتِ فلکی کو بھی اپنے خودساختہ قانونِ فطرت کی زنجیروں میں جکڑ دینا چاہتی ہے اور ایسا خودمختار و قادرِ مطلق خدا جو اس قانونِ فطرت کو کبھی بلا کسی مشورہ و اطلاع کے توڑ سکتا ہو، اُسکے لیے محالِ عقلی قرار پاتا ہے۔

ایسے گرد و پیش میں یہ معلوم کرنا کہ تہذیب کا وجود پہلے ہوا یا قانون کا، اسی قدر محال ہے جس قدر یہ بتانا کہ پہلے انڈا وجود میں آیا۔ یا۔ مرغی؟ اور تو اور، آپ شاید یقین کے ساتھ یہ بھی نہ کہہ سکیں کہ تہذیب یافتہ دنیا کو مرغی سمجھا جائے۔ یا۔ قانون کو ہے یا بہ الفاظِ دیگر۔ انڈے کا اطلاق ان دونوں میں سے کس پر ہو سکتا ہے؟ فنِ مرغبازی و فلسفۂ مرغ خوری کے پیچیدہ مسائل سے قطع نظر کر لیجئے پر، شاید آپ رفعِ حجت کے خاطر اس قدر مان لیں کہ انڈا اور مرغی۔ یا۔ تہذیب و قانون، ساتھ ہی ساتھ وجود میں آئے لیکن اس انڈے اور مرغی کا گوناگوں ارتقاء پھر بھی پہیلی کی طرح حل نہیں ہوتا؛ بقیۂ تہذیب کے آئے دن کھٹکتے رہنے سے ایسی چیت کبری حشرات قانونی وجود میں آتی ہے، کہ اس کی چیاؤں چیاؤں سے دن کے بارہ گھنٹوں میں، ایک لمحہ بھی دماغِ انسانی کو آرام کے لئے، میسر نہیں آتا۔ اس پر بھی بعض دماغ "شاید کہ ہما بیضہ برآرد پر و بال" کا خواب ہنوز دیکھتے رہتے ہیں۔

دنیائے قدیم نے انسان کی تعریف حیوانِ ناطق کی تھی مگر دنیائے جدید نے اُس کو "حیوانِ قانونی" میں بدل دیا ہے۔ ہر تہذیب یافتہ انسان کے "حیوانِ قانونی" قرار دیے جانے پر بھی ایک مخصوص طبقہ کا قانون پیشہ بن جانا اسی قدر لازمی تھا جس قدر تمام آدمیوں کے دانت اور کان رکھنے پر بھی، مخصوص افراد کا دندان ساز۔ یا۔ کان بیں یا ہو جانا۔

قانون پیشہ طبقہ، بزعم خود، تہذیب دنیا کی ہر کشتیِ معاشرت کا حکیمِ حاذق ہونے کا

مدّعی ہے ۔ وہ اپنے وجود کو توازنِ معاشرت کے لیے ایسا ہی ضروری تصور کرتا ہے جیسا ڈاکٹر جسم انسانی کے لیے ۔ ممکن ہے کہ بعض اوقات طول پکڑ جانے والے قضیوں میں وہ پیمانۂ نفرت کا اندازہ کرنے میں تھرمامیٹر کا کام انجام دے سکتا ہو؛ لیکن واقعہ یہ ہے کہ نہ تھرمامیٹر بذاتِ خود بخار کو دفع کرسکتا ہے اور نہ مشیرِ قانونی نفرتِ باہمی کا ازالہ کرسکتا ہے ۔ فرق اگر ہے تو صرف اس قدر کہ تھرمامیٹر خاموشی کے ساتھ حرارت کی تیزی یا کمی کو صحیح صحیح بتا دیتا ہے اور مشیرِ قانونی اپنی لسانی کے ساتھ حدتِ نفرت کو اکثر وبیشتر نارمل سے کئی ڈگری بڑھا دیتا ہے!

یہ مخلوقِ قانونی عموماً تین اقسام کی نظر آتی ہے :- مختار، وکیل اور بیرسٹر۔ چوتھی قسم ریونیو ایجنٹ بھی سمجھی جاسکتی تھی مگر اب وہ ناموافقتِ آب و ہوا کے بدولت اس قدر کمیاب ہوتی جاتی ہے کہ شاید مستقبل قریب میں اس کا ایک آدھ صحیح النسل جوڑا، محض یادگار کے طور پر لکھنؤ کے نو زائیدہ عجائب خانہ ۔ یا ۔ زو میں رکھا جائے ۔

مذکورۂ بالا تینوں اقسام میں، مختار کی خود رو نسل صوبۂ متحدہ کے طول و عرض میں، اسی قدر تیزی کے ساتھ بڑھنے والی اور سرعت کے ساتھ پھیلنے والی ہے جس قدر تالاب میں جل کُنڈی، کھیتوں میں ترئی ۔ یا ۔ ایک مخصوص کوٹھے پر چوہائی ۔ اس نسل کی تخم ریزی ہر سال کاتک کے لگ بھگ، عین ہیجانِ نمو میں، پریاگ کی مقدس سرزمین پر عمل میں آتی ہے اور ایک ایک جھول میں کئی کئی درجن افراد کے اضافہ کا باعث ہوتی ہے ۔ معلوماتِ قانونی کے لیے اس نسل کے اکثر وبیشتر افراد دورانِ پیشہ میں، مرہونِ کتب ہونا اپنی کسرِ شان سمجھتے ہیں ۔ غالباً انکا تبحرِ قانونی نسلاً بعد نسلٍ، علمِ سینہ کے مخفی اصولوں پر ایک سے دوسرے پر بذریعہ توریث و انتقال، حسبِ حاجت منتقل ہوتا رہتا ہے ۔ محققین کی رائے ہے کہ "ہر نسل کا ایک بنیادی خصوصیات میں کاٹنا اور بھونکنا ضروری پایا جاتا ہے ۔ ممکن ہے کہ بعض کاٹنے پر زیادہ مائل پائی جائیں اور بعض محض جا و بیجا بھونکنے پر" محققینِ موصوف نے نسلِ مختار کو اپنے اس دعوے کی مستثنیات میں نہیں دکھایا لہذا ممکن ہے کہ اس دعوائے عام کا اطلاق نسلِ زیرِ بحث پر بھی ہوسکے! مختار کی دلچسپی شاعری سے لیکر سیاسی میدان تک ہر معاملہ میں ہوتی ہے یا ہوسکتی ہے ۔ تاہم اُسکی سیاسی دوڑ دھوپ میونسپل بورڈ اور ڈسٹرکٹ بورڈ سے اکثر وبیشتر متجاوز نہیں ہوتی؛ وہ اپنے سیاسی مقلدین میں کسی طرح بوجھ بجھکڑ سے کم نہیں سمجھا جاتا دورانِ مقدمات میں اُس کی ذاتِ ہمہ داں گواہِ مخالف کے دل و دماغ کے ساتھ ایک طرف اور عدالت کی قوتِ صبر و تحمل کے ساتھ دوسری طرف، یکساں طور پر وہی عمل کرتی ہے جو جنرل ڈائر نے

جلیان والہ باغ کے ساتھ کیا تھا یا ہندو مہاسبھا اتحادِ ہند کے ساتھ کر رہی ہے۔ وہ جا و بیجا بحث کرنے میں ہمیشہ اس خیال کو مدِ نظر رکھتا ہے کہ عدالت متاثر ہو یا نہ ہو مگر اُس کا دہقانی موکل ضرور کہہ اُٹھے کہ "ہمارو وکھتا رکھوب تیز الیو بجتو"! لباس کے اعتبار سے وہ تمدن قدیم و معاشرت جدید کی آمیزش سے وجود میں آتا ہے۔ اُس کا کوٹ کالر کے اعتبار سے انگریزی اور نیچے دامنوں کے لحاظ سے انگرکھا سمجھا جا سکتا ہے: اُس کا پتلون کمر بند نہ ہونے کی وجہ سے مغربی اور غرارہ دار ہونے کے باعث مشرقی نظر آتا ہے۔ وہ کالر لگاتا ہے تو ٹائی نہیں باندھتا اور بوٹ پہنتا ہے تو جراب استعمال نہیں کرتا: وہ ڈاڑھی رکھتا ہے تو کنگھا کرنے کی زحمت نہیں اُٹھا سکتا اور اس محکمۂ جنگلات کے مختصر نمونہ کو ننھی ننھی خودرو جانوں کا گھونسلا بننے دیتا ہے۔ اور نہیں رکھتا تو ہفتہ میں ایک مرتبہ سے زیادہ منڈوانے میں تضیع اوقات نہیں کرتا اور اکثر و بیشتر اپنے چہرہ کو سیاہ و سفید چیونٹیوں کا مرقع۔ یا۔ میرٹھ کا کسیرو بنائے رہتا ہے۔ یوں تو جج صاحب کی عدالتِ عالیہ سے لیکر آنریری مجسٹریٹ کے ہائیکورٹ تک ہر کمرہ اُس کی چہل قدمی کی سرزمین ہے لیکن مال کی عدالتوں کو اُسکی سرپرستی کا افتخار بدرجۂ اولیٰ حاصل ہے۔ اور اس خصوصیت کی تہ میں بعض اوقات یہ حقیقت بھی نظر آتی ہے کہ اُس کے شجرۂ خاندانی کی شاخیں کسی پٹواری کی ذاتِ والا صفات تک پھیلی ہوئی پائی جاتی ہیں۔ جو کچھ بھی ہو، اس میں کلام نہیں کہ مختار کی "کم خرچ وسیارگو" شخصیت مقدمہ بازی کی سرزمین پر ایک مجسم مغالطۂ قانونی "ثابت ہوتی ہے، اور فنِ آمد کے تحت میں "بہ ناداں ہمچناں روزی رساند + کہ دانا اندراں حیراں بماند" کی زندہ دلیل سمجھی جاتی ہے!

قانون پیشہ دنیا کی دوسری قسم، وکیل ہے، جو مختار سے، تیزی کے ساتھ بڑھنے میں کم ہو مگر عالمگیر ہونے کے لحاظ سے کہیں زیادہ ہے؛ یہ قسم کسی خاص صوبہ کی مخصوص پیداوار نہیں ہے۔ بلکہ ہندوستان کے ہر نشیب و فراز میں یکساں طور پر بہ آسانی پائی جاتی ہے۔ اس کی فراوانی کے ثبوت میں گذشتہ اشیاء شماری کی رپورٹ بلا خوفِ تردید پیش کی جا سکتی ہے اور یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کے ہر بڑے شہر کے سائن بورڈ۔ جن میں "حمامِ گرم" سے لیکر شربت کی دوکانوں تک ہر قسم کے سائن بورڈ شامل ہیں۔ اگر بلحاظِ پیشہ تقسیم کیے جائیں تو وکلا کے سائن بورڈ، مجموعی تعداد کا کم و بیش ۷۵ ، دواں حصہ ثابت ہوں گے۔ یہ طبقہ معاشرتِ موجودہ کے تمول کی قطع و برید کرنے میں، طبقۂ حسن فروش کے بعد کسی سے پیچھے نہیں رہا۔ جس طرح ایک سرجن اپنے مریض

بالکل اُسی طرح ایک وکیلِ طرار اپنے شکار کے دماغ سے مادۂ انتقام دور کرنے کی غرض سے، عمل قانونی کے زیر سایہ، اُس کی ایک ایک جیب کاٹ لیتا ہے: دونوں کا فعل یکساں طور پر معقول اور ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وکیل کے لیے مقدمہ باز طبقہ کے ساتھ خوش معاملہ ہونا ایسا ہی لازمی ہے جیسا کہ لوکارنو پیکیٹ کا ٹرکی کے ساتھ۔یا۔ انڈیا آفس کا ہندوستانیوں کے ساتھ۔

اب یہ کہ بعض اوقات اُس کی زرخیز و اغماز لبریز روش عموماً پسندیدہ نہ سمجھی جائے، ایک ایسی بات ہے جس سے محض ایسا سمجھنے والے کی تنگ نظری و کم فہمی کا پتہ چلتا ہے؛ وہ اگر کسی مقدمہ کے پچھوڑکے زمانہ میں، عین پیشی کے وقت، اپنے سراسیمہ موکل کے ساتھ "نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز" کے اصول پر بتین طور پر نازِ معشوقانہ کا اظہار کرتا ہے تو اس سے بدمعاملگی کا نتیجہ نکالنا عین جہالت ہوگا۔ اُس کے ایسے قدر و قیمت بڑھانے والے اچانک عمل سے مقدمہ باز کی محض جیب تلاشی ہی مقصود نہیں ہوتی بلکہ اعتماد راسخ کا جائزہ بھی منظور ہوتا ہے۔ اعتقادِ راسخ کے جائزوں میں پورا اُترنے پر موکل کو اُس کی زبان۔ اور بعض اوقات ایمان تک۔مول لے لینے کا گمان پیدا ہو جانا جائز نظر آتا ہے۔ پھر وہ "مزدورِ خوشدل" کے مانند، عدالت کے کمرہ میں خود عدالت کو نئے نئے رنگ سے چکمہ دینے کی، اور عدالت کے باہر۔ سمائی علم کو عینی شہادت کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے۔ ایک ایک گواہ کی تعلیم و تلقین کی، خدمات ایسی تن دہی کے ساتھ بجا لاتا ہے کہ محکمۂ پولیس ایک طرف اور معلم الملکوت دوسری طرف، اپنے اپنے کان پکڑ لیتے ہیں!

اس پیشہ کی آخری سیڑھی۔یا۔ چوٹی کی صورت بیرسٹر ہے۔ تعداد کے لحاظ سے، مختار و وکیل کے مقابلہ میں، اس کی وہی نسبت ہو جو ہندوستانی آبادی میں یسوع مسیح کی اُمت کی؛ لیکن سات سمندر پار سے مل سکنے والی اسناد کے اعتبار سے، بیرسٹری کا اعزاز بقیہ اسنادِ بیرونی کے مقابلہ میں کم خرچ و سہل الحصول مانا جاتا ہے۔ بعض صورتوں میں ایک غبی دماغ، ہندوستانی ڈگری پر متعدد ناکام حملے کر چکنے کے بعد، باہر جاکر تبدیل آب و ہوا کے زیر سایہ۔یا۔ بیش قیمت ومرغن ڈنر کے بدولت، بہ آسانی بیرسٹری کا گون سلوا لاتا ہے اور چشم زدن میں، ذہین، طباع، لایق، اور خدا جانے کیا کیا سمجھے جانے کا قانوناً حقدار قرار پاتا ہے۔ مغربی معاشرت، مغربی تعلیم، مغربی زندگی، غرض مغربی زمین و آسمان تک کے لیے اُس کی ذات ایک زندہ انسائیکلوپیڈیا۔یا۔ متحرک لائبریری مانی جاتی ہے۔ اُس کے ارشادات مغربی مسائل کے لیے فیصلۂ مختتم کا حکم رکھتے ہیں جن کا اپیل تو درکنار نظر ثانی بھی ممکن نہیں۔ وہ جورِس پروڈنس کے زعم پر نفسیات سے لے کر سیاسیات تک،

اور شاعری سے لیکر خرافات تک، تمام علوم و فنون میں ٹانگ لڑانے کا مدعی ہوتا ہے؛ اسی جوشِ معلومات میں اکثر اوقات اُسکو ہمہ دانی کا تخمہ ہوتا رہتا ہے اور غالباً اس وجہ سے ہوتا رہتا ہے کہ کمیوٹ بندوبست سے لیکر دیوانِ داغ تک، ہر چھوٹی موٹی کتاب پر اُسکو پورا پورا عبور ہوتا ہے۔ اُس کی تمام صفاتِ داخلی و خارجی، تازہ ولایت ہونے کے زمانہ میں اپنی انتہائے کمال پر ہوتی ہیں: البتہ ناکارہ ہندوستان کی نابکار آب و ہوا کے برداشت دس پانچ سال کی مدت میں اُسکا رنگ ایک جھلکا کالا، اور اس کا دماغ ایک ڈگری ٹھنڈا ہو جاتا ہے؛ تاہم اُس میں اور وکیل و مختار میں وہی نسبت ہمیشہ باقی رہتی ہے جو نیم کی سواک میں اور پراف لیک ٹاک (prophylactic) ٹوتھ پوڈر میں۔ بیرسٹر کی ادنیٰ خوبی یہ بیان کی جا سکتی ہے کہ ایک عطائی (اتائی؟) گاتے گاتے کلاونت بن سکتا ہو مگر ایک وکیل بکواس کرتے کرتے کبھی بیرسٹر میں مسخ نہیں ہو سکتا!

ان تینوں اقسام کے خدوخال بعض خصوصیات کی بناء پر جداگانہ نقش کے محتاج ہوں، مگر اکثر اعتبارات سے اُن کی نمایاں صفات ہر قسم میں یکساں طور پر قابلِ توجہ نظر آتی ہیں۔ یہ مشترک صفات پیشۂ قانونی کے آغاز میں کسبِ معاش اور طلبِ شہرت کے حدود سے متجاوز نہیں ہوتیں اور میانی زمانہ میں طمعِ زر اور خود نمائی میں مبدل ہو جاتی ہیں، اور انجام میں ہوسِ قوم رانی اور جنونِ خود بینی تک پہونچ جاتی ہیں۔ کوششِ کسبِ معاش، کامیابی کی صورت میں، طمعِ زر کا جنم لے لیتی ہے اور اس لحاظ سے ایک قانون پیشہ ذات کے لیے بندۂ زر، ناآشنا اور ابن الوقت ہونا لازمی نظر آتا ہے؛ اسی طرح طلبِ شہرت، زبانِ زدِ خلائق ہو جانے کے بعد خود نمائی و خود بینی کا رنگ اختیار کر لیتی ہے اور اس جدوجہد میں کم خرچ گرگے اور سستے پھو "پیراں نمی پرند و مریداں می پرانند" کے اصول پر زبانی منادیِ صفات کے لیے دست و بازو قرار پاتے ہیں۔ قانون پیشہ افراد پیشی مقدمات کے حساب سے — یعنی روزانہ معاوضہ پر — بھی میسر آسکتے ہیں اور "تا تصفیۂ مقدمہ" بھی! اس اعتبار سے یہ افراد اُن تمام پیشہ ور ہستیوں سے نمایاں مشابہت رکھتے ہیں جو روزانہ - یا - شبانہ معاوضہ پر بھی مل سکتی ہوں، اور رہا ہوا پر بھی بظاہر ایسے تمام پیشوں کے اصول معاوضہ میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ البتہ لے دے کر اس قدر امتیاز ضرور پایا ہے کہ بعض پیشہ کے آغاز کا زمانہ زرخیز ہوتا ہے اور بعض پیشہ والے انجام کا: گویا بعض دہلنے والے پھول ہوتے ہیں اور بعض پرانے چاول!! اس پیشۂ شریف کی ایک دوسری خوبی

"شرافتِ نسبی" بھی دیکھنے میں آتی ہے؛ مثلاً ایک افلاس زدہ عرائض نویس کی اولادِ فاقہ کش کا کوئی خوش قسمت فرد اس پیشہ کے اختیار کرنے میں کامیاب ہو جائے تو وہ محض اس اتفاق کے بل پر بلند مرتبت ہی نہیں بلکہ "انجب" ہونے کا بھی مدعی بن جائے گا۔ یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ مشیرِ قانونی کے لیے بدمعاملہ یا بے ایمان ہونا اُسی قدر محالِ عقلی ہے جس قدر یورپ کے لیے مبتلائے ہوسِ مُلک گیری ہونا ۔ یا ۔ کرشن جی کے لیے حُسن پرست ہونا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کے نقطۂ نگاہ سے، پچھتر فی صدی حکّام راشی اور پچیس فی صدی عدالتیں نالائق یا ۔ بُدھو نظر آتی ہیں! اس میں بھی شک نہیں کہ مشیرِ قانونی کے موکل اکثر اعتبارات سے عملِ دستِ غیب کے موکل ثابت ہوتے ہیں جو بڑی ریاضت کے بعد اُس کے قابو میں آتے ہیں! جو کچھ بھی ہو، عملِ دستِ غیب کے تحت میں اکثر اوقات "فرقہ بندی کا بیج" محض اپنے ذاتی مفاد کے خاطر، اسکو عین دانشمندی کے ساتھ بونا پڑتا ہے اور اس تخم ریزیِ نفرت و نفاق کی پیداوار ہر سال اُس کے خرمنِ تمول کو مالا مال کرتی رہتی ہے!!

مختاریاری اور بار ایسوسی ایشن، تہذیب۔ قانون اور زر طلبی سے بننے والے مثلث متساوی الساقین کی دو مضبوط ٹانگیں سمجھی جا سکتی ہیں جن کے بل پر بعض اوقات چند قانونی پیشہ افراد کو جج سے لیکر چیف جسٹس تک ہر عدالت پر الزامات لگانے اور اعتراضات وارد کرنے کی جرأت "بہ ریش بابا ہم بازی" کے اصول پر پیدا ہو جاتی ہے اور دیکھنے والوں کو برائے چندے ایک عجیب بازیچۂ اطفال کا لطف حاصل ہو جاتا ہے!

مختصراً اس پیشۂ شریف کے جائز و ناجائز استعمال کے دَم قدم سے، مقدمہ بازی، دروغ بافی، افترا پردازی، تنفر، فرقہ بندی، خود غرضی، بوالہوسی، اور دستِ غیب کی تعلیم و تکمیل آئے دن ہوتی رہتی ہے ۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ان تمام اوصاف کے پیدا ہو جانے پر تہذیبِ رائج کے لیے باقی ہی کیا رہتا ہے جس کی تمنا کی جائے!!

"رفیل"

شامِ اَودھ

صبح بنارس و شامِ اَودھ مشہور ہیں۔ ہماری اتنی باریک قوتِ مشاہدہ نہیں، نہ تمیز اس قدر ہے کہ رنگوں کی لطافت سمجھ سکیں۔ اخبار اسٹیٹس مین (Statesman) میں ایک صاحب حسبِ ذیل لکھتے ہیں :—

"ہندوستان کے آسمان کے رنگ سال کے اس موسم میں عجیب ہیں۔ یعنی موسم برشگال میں عجیب کیفیت دکھلاتے ہیں۔ طلوعِ آفتاب و غروبِ آفتاب دونوں موقعوں پر بادلوں کی گوناگونی اور نیرنگی دنیابھر میں کہیں ایسی نگاہ میں نہیں آتی جیسی ہندوستان میں دکھائی پڑتی ہے۔ مانا کہ متواتر کئی دنوں تک یہاں کے آسمان کا رنگ غلیظ مثل یورپ کے آسمان کے رہتا ہے اور طبیعت پر اُداسی سی رہتی ہے مگر اسکا معاوضہ اُن زرق برق رنگوں سے جو بعد میں اپنا جلوہ دکھاتے ہیں پوری طرح ہو جاتا ہے تعجب کی بات ہے کہ جو رنگ بنگال میں نظر آتے ہیں یوپی اور پنجاب کے رنگ سے مختلف ہوتے ہیں۔ بنگال میں نیلگوں رنگ تو ہوتا ہے وہ نہ معلوم کس طرح بادلوں میں پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن آسمان نیلوفری نہیں ہوتا۔

پنجاب اور یوپی میں رنگ زردی مائل ہوتا ہے اسکا تعلق طلوع یا غروب یا غیوب آفتاب کی گردون سے نہیں ہے بلکہ کوئی خاص وجہ ہے جو عجیب ہے۔ لکھنؤ میں اس زرد رنگ کو رنگ شکری کہتے ہیں۔ یعنی ایسا رنگ گویا قند مصری کے درمیان سے شعاع نکلتی ہے۔ خواہ اسکو کیسے ہی الفاظ میں بیان کیا جائے۔ یہ زردی مائل رنگ نہایت ہی خوبصورت ہوتا ہے۔ اس کی شعاع سڑکوں، مناروں، گیہوں اور مکئی کے کھیتوں پر پڑتی ہے اور یہ سب چیزیں رنگ آمیز ہو جاتی ہیں"

اسٹیٹسمین۔ مورخہ ۲۶۔ جولائی ۱۹۲۵ء

مضمون بالا سے اب سمجھ میں آیا کہ کیوں "شام اَودھ" مشہور ہے۔ صبح بنارس کا معاملہ ہنوز حل طلب ہی رہا۔

شمیم (لاہور)

زبان بن رہی ہے یا بگڑ رہی ہی؟

دنیائے حیوانات میں یہ شرف صرف انسان ہی کو حاصل ہے کہ وہ اپنا مطلب اپنی آواز کے ذریعے سے دوسروں کو سمجھا سکتا ہے۔ حنجرہ سے پیدا ہو کر زبان، تالو، دانتوں اور ہونٹوں کی مدد سے ہماری آواز میں بہت سے تغیرات پیدا ہو جاتے ہیں، اور اس طرح جو مختلف قسم کی آوازیں ہمارے منہ سے نکلتی ہیں اُنھیں ہم حروف کہا کرتے ہیں۔ ان حروف کے مجموعہ کا نام لفظ ہے۔ اور الفاظ کا پورا ذخیرہ جو کسی ایک جماعت یا قوم کے مشترکہ استعمال میں ہو اُس جماعت یا قوم کی زبان کہلاتا ہے۔ دنیا کی کوئی زبان ایک روز میں نہیں بنی تھی۔ اپنے گرد و پیش کی چیزوں کے متعلق جس قدر ہمارا علم بڑھتا گیا اُسی قدر نئے نئے الفاظ بھی ہماری زبان کے ذخیرہ میں داخل ہوتے گئے۔ دنیا بھر میں ایک زبان بھی ایسی نہیں ہے جو صرف اُنھیں چند الفاظ اور محاورات پر محدود ہو جو ابتدا میں اُسکے لیے وضع کیے گئے تھے۔ اور اسی طرح کوئی پرانی سے پرانی اور مکمل ترین زبان بھی ایسی نہیں ہے جو نئے الفاظ اور محاورات سے مستغنی ہو۔ تقریباً ہر پچاس سال کے اندر ہر ترقی یافتہ قوم کی زبان میں بہت کچھ تبدیلیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ بہت سے الفاظ جو پہلے بکثرت استعمال میں آتے تھے اب متروک الاستعمال ہو جاتے ہیں، اور بہت سے نئے نئے الفاظ اور محاورات اُس میں ایسے شامل ہو جاتے ہیں جنھیں پچاس سال پیشتر کوئی سمجھ بھی نہ سکتا تھا، اور اگر اُسوقت یہ الفاظ بولے یا لکھے جاتے تو بولنے یا لکھنے والے کو پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا۔

آج ہمیں "ٹک" "کبھو" "جیوڑا" "کروں ہوں" "میں کہا" وغیرہ بُرے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن کیا میر و سودا کے زمانے میں بھی ان الفاظ کے ساتھ یہی سلوک ہوتا تھا؟ کیا ایران کی زبان آج وہی ہے جو ہم گلستان، بوستاں، بہار دانش، اور انوار سُہیلی کے ذریعے سے سیکھا کرتے ہیں؟ کیا مصر و عرب میں اب بھی وہی عربی بولی جاتی ہے جو خلفائے عباسیہ یا بنو اُمیہ کے زمانہ میں رائج تھی؟ کیا شکسپیر اور نپولین کسی طرح پھر زندہ ہو جائیں تو آج لندن اور پیرس کی زبان اُنکی سمجھ میں آ سکیگی؟

یہ بالکل ناممکن ہے کہ کسی ایسی قوم کی زبان جو اپنے علم اور خیالات میں ترقی کر رہی ہو بدلا تغیر پذیر نہ ہوتی رہے اور اُس کے ذخیرہ میں نئے الفاظ کا اضافہ نہ ہوتا رہے۔ اُردو ایک بہت ہی

کم مایہ زبان ہے۔ ابھی تک اس میں اظہار خیالات کے لیے مناسب الفاظ کا کافی ذخیرہ نہیں ہے۔ پھر اُس پر طرہ یہ کہ وہ ہے بھی فقیر کی جھولی، جس میں مختلف گھروں کے ٹکڑے جمع ہیں۔ اُردو بولنے والوں کا علم اور خیالات اگر روبہ ترقی ہیں تو کوئی وجہ ایسی نہیں معلوم ہوتی کہ اس میں نئے الفاظ اور نئے محاورات داخل نہ کیے جائیں، اور ہر اُس لفظ یا محاورہ کو جو پیشتر سے اس میں موجود نہ تھا شجر ممنوع خیال کر لیا جائے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ہر نیا لفظ اور ہر نیا محاورہ شروع شروع میں اجنبی، نامانوس، اور ٹکسال باہر کا معلوم ہوگا، اور اگر اسکی اجنبیت ہمیں اُس کی قبولیت سے باز رکھے گی تو پھر اس زبان کا ترقی کرنا معلوم۔ جب کبھی غیر مانوس الفاظ نئی ترکیبیں اور اجنبی محاورے اس میں داخل کیے جائیں گے تو اُردو کے قدر دانان قدیم اس کوشش کو زبان کے بگاڑنے سے تعبیر کریں گے۔ لیکن کیا فی الحقیقت اس کا نام زبان کا بگاڑنا ہے؟ اور اگر بگاڑنا یہی ہے تو پھر زبان کا بنانا کسے کہتے ہیں؟ کیا انھیں چند بوسیدہ الفاظ، پرانی ترکیبوں، اور دقیانوسی محاورات پر قناعت کیے بیٹھے رہنے کا نام زبان کا بنانا کہلائے گا؟

میرے خیال میں تو نئے الفاظ کی شمولیت سے زبان بگڑا نہیں کرتی بلکہ بنا کرتی ہے، اور نقادان فن اگر صرف اتنا خیال رکھیں کہ کوئی ایسا لفظ جو سامعہ کے لیے کرخت ہو، اور کوئی ایسا محاورہ جو سنجیدہ اور شستہ مذاق کے لیے بار ہو زبان میں داخل نہ ہونے پائے تو یہ کافی ہے۔ اچھے الفاظ، خوبصورت ترکیبیں، اور خوشگوار محاورات جو عوام کی زبانوں پر چڑھ کر زبان میں داخل ہو جائیں انکے قبول کرنے کے لیے اہل زبان اور اہل قلم اصحاب کو ہمیشہ تیار رہنا چاہیے۔ زبان کا یہ تغیر قدرتی ہے، اور کسی کے روکے نہیں رُک سکتا۔ جو اصحاب اسکی مخالفت پر آمادہ ہوں گے، انھیں آج نہیں تو کل مجبور ہو کر ان نئے الفاظ کو قبول کرنا پڑے گا۔ عوام کا مقابلہ دو چار قدامت پسند بزرگ کسی طرح نہیں کر سکتے، اور اگر زبان اُردو سے انھیں محبت ہے تو ایسی معنرت رساں کوشش کرنا بھی نہ چاہیے۔

مُلک کے مشہور و معروف ادیب نواب حیدر یار جنگ سید علی حیدر صاحب طباطبائی نے "ادب الکاتب" کے عنوان سے ایک مضمون رسالہ زمانہ میں شائع کرایا ہے جس میں آپ نے زمانۂ حال کے کالجوں کے تعلیم یافتہ نوجوانوں پر اعتراض کیا ہے کہ "اُن کے پاس مضامین بے نہایت ہیں لیکن زبان سے بیگانہ ہیں۔ اُنھوں نے انگریزی کا تحت اللفظ ترجمہ کر کے اُردو کی صورت کو بگاڑ دیا" اسکے بعد کچھ آگے چل کر سید صاحب نے دو جملے پیش کیے ہیں ایک "جان توڑ کوشش"

اور دوسرا "ان تھک محنت"۔ سید صاحب کا خیال ہے کہ یہ دونوں قابل اعتراض الفاظ یعنی "جان توڑ" اور "ان تھک" کالج کے تعلیم یافتوں کی ایجاد ہیں۔ ان دونوں لفظوں پر آپ کا اعتراض یہ ہے کہ یہ الفاظ تو ہندی بنائے گئے ہیں مگر بنانے کی ترکیب فارسی ہے۔ اس میں تو ذرا بھی شک نہیں کہ "جان توڑ" فارسی ترکیب کے مطابق بنایا گیا ہے۔ کیونکہ یہ فارسی ہی کا قاعدہ ہے کہ کسی فعل کے صیغۂ امر کے شروع میں ایک دوسرا لفظ شامل کر کے اسم فاعل سماعی بنا لیا کرتے ہیں۔ جیسے دل دوز، جگر سوز، جہاں آرا، جاں گسل، وغیرہ۔ لیکن سید صاحب کا یہ خیال کہ یہ کالج کے تعلیم یافتوں کی اختراع ہے میرے خیال میں کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ "جان توڑ" کے طرز کے ہندی اسم فاعل اور بھی بہت سے ہیں جن میں سے اکثر کے متعلق سید صاحب کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ اُس وقت کے بنے ہوئے ہیں کہ جب کالج کے تعلیم یافتہ تو درکنار، خود کالجوں ہی کا ہندوستان میں وجود نہ تھا۔ "بھوجن سدھار" "کفن چور" "چڑی مار" "کھال اُتار" "گھٹ کٹ" جو دراصل باگ ٹوٹ کی بگڑی ہوئی شکل ہے اور عوام بازاری لوگوں کی گالیاں جنکا جزو اول بہن یا بیٹی ہوتا ہے اور جزو ثانی ایک ناگفتنی صیغۂ امر، تمام اسی قسم کے اسم فاعل سماعی ہیں اور کون نہیں جانتا کہ انکی ایجاد و اختراع کا فخر کالج کے تعلیم یافتوں کو حاصل نہیں ہے۔ یہ تمام لفظ مدتہا مدت سے زبان میں شامل ہیں۔ اور آج اُن میں سے کسی ایک پر اعتراض کرنا کہ یہ غلط ہے کہاں تک درست ہو سکتا ہے۔ اسی طرح "ان تھک" بھی یقیناً فارسی ترکیب کے مطابق بنایا گیا ہے، لیکن یہ بھی آج کا بنا ہوا نہیں ہے۔ اس قسم کے لفظ بھی اُردو اور ہندی میں مدتوں سے بکثرت رائج ہیں۔ "ان پڑھ" "ان جان" "ان مل" "ان مٹ" سب اسی ترکیب سے بنے ہوئے ہیں اور سید صاحب کو انھیں کالجوں کی پیداوار ثابت کرنے میں وہی دقتیں پیش آئیں گی جو کسی جھوٹے مقدمہ کی پیروی میں ایک وکیل کو پیش آتی ہیں۔ اندازے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود بھاشا میں یہ فارسی ترکیبیں داخل ہو گئی تھیں اور اُردو میں یہ بھاشا کے ذریعہ سے آئی ہیں۔ آج اس قدر مدت دراز گذر چکنے کے بعد یہ اعتراض کہ فارسی ترکیب کے مطابق ہندی الفاظ بنانا مذموم ہے ایک "مشت بعد از جنگ" سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ اول تو یہ رسم ہی کسی طرح قابلِ اعتراض نہیں ہے کہ کوئی زبان کسی دوسری زبان کی نحوی ترکیب اپنے لیے قبول کرلے، اور بفرضِ محال اگر یہ طریقہ ناپسندیدہ ہی ہے تب بھی یہ غلطی اب غلط العام کے درجے کو پہونچ چکی ہے اور اس طریقہ سے اگر آیندہ اور لفظ بھی بنائے جائیں تو اُن سے بھی زبان بنیگی، بگڑیگی نہیں بشرطیکہ الفاظ سامعہ فگار نہ ہوں۔

سید صاحب کو "ناقابلِ برداشت" بھی ناگوارِ خاطر ہے اور آپ کی خواہش یہ ہے کہ "ناگوارا" سے وہ کام لیا جائے جو ناقابلِ برداشت سے لیا جاتا ہے۔ افسوس کے ساتھ مجھے اس معاملہ میں بھی سید صاحب سے اختلاف کرنا پڑتا ہے۔ ناگوارا سے ہرگز وہ مفہوم ادا نہیں ہو سکتا جو ناقابلِ برداشت سے ادا ہوتا ہے۔ بالکل معمولی تکالیف بھی ناگوارا ہو سکتی ہیں، لیکن ناقابلِ برداشت صرف وہی تکلیف ہو گی جو برداشت کی حد سے باہر ہو۔ اُردو میں اسی نہج کے اور بھی بہت سے لفظ رائج ہیں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ صرف اسی ایک پر کیوں سید صاحب کی نگاہ پڑی۔ ناقابلِ معافی، ناقابلِ ذکر، ناقابلِ تلافی، ناقابلِ تشریح، ناقابلِ اظہار وغیرہ آخر کیوں اعتراض سے بچ گئے؟ یہ سب کے سب جملے نہایت خوبصورت اور خوشنما معلوم ہوتے ہیں اور زبان پر ظلم ہو گا اگر انھیں ترک کر دیا گیا۔

سید صاحب کو انگریزی کے لفظ "مدرٹنگ" کا ترجمہ "مادری زبان" بھی پسند نہ آیا۔ فرماتے ہیں کہ "جن بزرگ نے انگریزی سے اس کا ترجمہ کیا اُنھیں یہ خیال نہ آیا کہ "مدرٹنگ" میں لفظ "مدر" اور ہی معنی رکھتا ہے۔ جیسے (مدرکنٹری) (مدرچرچ) میں مدر کے معنی ہیں ویسے مدرٹنگ میں بھی ہیں۔ آپ نے مادری زبان ترجمہ کر دیا یہ نہ دیکھا کہ اسکے کیا معنی ہوئے آخر باپ دادا کی تمام بزرگوں کی تمام خاندان کی وہی زبان ہے تو پھر مادری زبان کہنا کیا معنی؟"

اپنی کم علمی اور کوتاہ فہمی کا سچے دل سے اعتراف کرنے کے بعد بھی میں یہ عرض کرنے پر مجبور ہوں کہ "مدرٹنگ" میں "مدر" کے معنی وہ تو ضرور ہیں جو "مدرکنٹری" میں ہیں، لیکن وہ معنی ہرگز نہیں ہیں جو "مدرچرچ" میں ہیں۔ مدرٹنگ، اور مدرکنٹری دونوں میں مدر کے معنی صرف ماں کے ہیں اور اس لیے اس کا ترجمہ مادری بالکل صحیح ہے۔ اب رہا یہ اعتراض کہ زبان تو باپ دادا کی بلکہ تمام خاندان کی ہے اسے صرف مادری کہنا کیا معنی، بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص باغ کے متعلق یہ اعتراض کرے کہ جبکہ باغ میں پھولوں کے علاوہ خار بھی ہیں، اور بلبلیں بھی، پھر اُسے صرف گلستاں کہنا کیا معنی، کیوں نہ اُسے خارستاں یا بلبلستاں کے نام سے پکارا جائے؟ سید صاحب نے یہ تحریر نہ فرمایا کہ مادری زبان کی بجائے وہ کونسا لفظ پسند کریں گے۔ کیا پدری زبان، جدی زبان، برادری زبان میں سے کوئی پسند آ جائے گا؟

"اُس نے نفی میں جواب دیا" سید صاحب کو ایک طفلِ مکتب کی شوخی معلوم ہوتی ہے۔ حقیقتاً ہے بھی ایسا ہی۔ کالج کے نوجوان سید صاحب کے سامنے طفلِ مکتب نہیں تو اور کیا ہیں؟ مگر

گلستاں کے پرانے ایڈیشن میں ایک شعر تھا۔ اب نئے ایڈیشن میں خدا جانے ہو یا نہ ہو کہ

نگاہ باشد کہ کودکے ناداں　　زغلط بر ہدف زند تیرے

(اسکے بعد کا شعر میں نہیں لکھنا چاہتا) اس فقرہ میں کیا سوائے اسکے اور بھی کوئی خرابی ہے کہ یہ انگریزی طرز بیان ہے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ اُردو جیسی بے مایہ زبان کے لیے یہ ضروری ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے اس میں نئے نئے الفاظ اور نئے نئے محاورے داخل کیے جائیں۔ بہی خواہانِ اُردو کا فرض صرف اس قدر ہے کہ وہ اس بات پر نگاہ رکھیں کہ کوئی خراب لفظ یا بعید از محاورہ زباں زدِ عوام نہ ہو جائے۔ اگر اس محاورہ میں کوئی خرابی نہیں ہے تو پھر خواہ مخواہ کیوں لائے مسترد کیا جائے بالخصوص اب جبکہ وہ عوام کی زبانوں پر چڑھ چکا۔

اسی طرح یہ جملے بھی کہ "علمی دلچسپی لی" "علمی جامہ پہنایا" "ملکی بے چینی" "مالی امداد" "جنگ میں حصہ لیا" "کافی بدنام ہوا" اور "حیات و موت کا سوال" بجز اسکے اور کسی وجہ سے قابل رد نہیں معلوم ہوتے کہ ابھی نئے ہیں۔ لیکن صرف نیا ہونا کوئی عیب نہیں ہے۔ اگر ہمیں اپنی زبان کی ترقی منظور ہے تو ایک ایک بات کو دس دس طریقوں سے ادا کرنے کے لیے محاورات وضع کرنے کی ضرورت پڑیگی۔ اعتراض ہر نئی چیز پر نہ ہونا چاہیے بلکہ ہر بُری چیز پر ہونا چاہیے۔ یہ چند جملے تو سید صاحب کو ناگوار گذرے مگر انگریزی کے وہ صدہا الفاظ جو اُردو میں شامل ہو کر اردو بن چکے ہیں سید صاحب کو بُرے نہیں معلوم ہوتے۔ "حیات و موت کا سوال" کے بجائے سید صاحب نے "جان جوکھوں کا معاملہ" پیش کیا ہے، لیکن میں نہایت ادب کے ساتھ گذارش کروں گا کہ جان جوکھوں کا معاملہ اور چیز ہے اور حیات و موت کا سوال اور چیز۔ جان جوکھوں کا معاملہ وہ معاملہ ہے کہ جس میں جان کا خطرہ ہو۔ حیات و موت کا سوال وہ مسئلہ ہے کہ جس میں حیات اور موت دونوں کا امکان برابر ہو۔ جان جوکھوں میں صرف ایک پہلو ہے یعنی بُرائی کا، اور حیات و موت کا سوال میں بُرائی اور بھلائی دونوں کے پہلو برابر ہیں۔

علمی اصطلاحات میں انگریزی الفاظ کو رواج دینا جبکہ اُنکے مرادف الفاظ عربی، فارسی یا ہندی میں مل سکیں یقیناً قابل اعتراض ہو سکتا ہے، لیکن اگر سید صاحب مجھے معاف فرمائیں تو میں عرض کروں کہ اس قصور کے لیے بھی غریب کالج کے تعلیم یافتہ ذمہ دار نہیں ہیں بلکہ وہ اہل علم بھی ملزم قرار پائیں گے جنھوں نے خود تو سب کچھ پڑھ لیا مگر دوسروں کے لیے کسی قسم کا سامان مہیا نہ کیں۔ سید صاحب کا یہ فرمانا بالکل صحیح ہے کہ صدہا سال سے ہم ان عربی اصطلاحات کو

پڑھتے چلے آتے ہیں۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ صدہا سال سے پڑھتے چلے آنے کے باوجود بھی آپ نے کیوں انھیں اردو میں رائج کرنے کی کوشش نہ کی۔ ایک لڑکا اپنی عمر عزیز کے کم ازکم دس بارہ سال ضائع کرکے ایک غیرملکی زبان سیکھتا ہے، اور اب آپ اُس سے یہ توقع کرتے ہیں کہ اپنے خیالات کے اظہار سے پیشتر وہ پندرہ سال اور عربی سیکھنے میں ضائع کرے تاکہ آپ کی اصطلاحات سے آشنا ہو۔ اگر ان بزرگوں نے جو صدہا سال سے علوم و فنون پڑھتے چلے آتے ہیں تھوڑی سی تکلیف برداشت کرکے ان علوم و فنون کا اُردو میں ترجمہ کردیا ہوتا تو آج کالج کے نوجوانوں کو اپنی عمر کا ایک اچھا خاصا بڑا حصہ صرف انگریزی سیکھنے پر ضائع نہ کرنا پڑتا۔ اُردو کی بے مائگی انگریزی سیکھنے پر مجبور کرتی ہے، اور ظاہر ہے کہ جس زبان میں کسی نوجوان نے کوئی علم پڑھا ہے اُسی کی اصطلاحات لکھنے اور بولنے پر وہ مجبور ہے۔ کسی کا مقولہ ہے کہ "خود کام کرنے کی بہ نسبت دوسروں کے کام میں عیب نکالنا آسان ہے"۔ مجھے تو اس مقولہ کی صداقت پر پورا پورا یقین ہے مگر معلوم نہیں کہ سید صاحب بھی اسے صحیح خیال فرماتے ہیں یا نہیں۔

ختم مضمون پر سید صاحب فرماتے ہیں کہ "لیکن اس ہیچ میرز کی پیشین گوئی اس باب میں ضرور پوری ہونے والی ہے کہ یہ سب زحمت ہباءً منثورا ہونے والی ہے"۔ یہ سب زحمت ہباءً منثورا بنے یا لآلی منظوم، لیکن اس ہیچ میرز کی یہ پیشین گوئی بھی ضرور پوری ہونے والی ہے کہ اگر "ہباءً منثورا" جیسی عربی کی سلیں لڑھکائی گئیں تو غریب اُردو کا کہیں نام ونشان نہ رہے گا۔ اور حصول تبرک کے لیے اگر کسی کو کسی اُردو داں کی زیارت کی ضرورت پیش آہی گئی تو اُسے مصر و عرب کی بادیہ پیمائی کرنی پڑے گی۔ کیا تماشہ ہے کہ ایک طرف تو ہماری یہ خواہش ہے کہ اُردو تمام ہندوستان کی مشترکہ زبان بن جائے، اور دوسری طرف ہم اس میں ایسے ایسے عربی اور فارسی کے لغات شامل کرتے چلے جارہے ہیں کہ جن کی وجہ سے ہندو تو الگ رہے اچھے خاصے تعلیمیافتہ مسلمان بھی سمجھنے سے قاصر ہوگئے ہیں۔ اس امر کا فیصلہ کہ اُردو کے لیے "ان تھک" اور "ناقابل برداشت" زیادہ خطرناک الفاظ ہیں یا "ہباءً منثورا" میں سید صاحب ہی کے انصاف پر چھوڑتا ہوں۔

سعید احمد ۔ سعید بریلوی

شعر الہند

از مولانا عبد السلام ندوی

کتاب شعر الہند اُردو شاعری کی ابتدا اور اُسکی تدریجی نشوونما کی ایک مختصر لیکن پُر مغز تاریخ ہے جس میں قابل مصنف نے زمانۂ قدیم کے شعرا سے شروع کرکے زمانۂ حال تک کے مشہور اُردو شعرا میں سے ہر ایک کے کلام کا نمونہ پیش کیا ہے اور اسکے کلام اور طرز شاعری پر تنقیدی طریقہ سے بحث کی ہے - یہ کتاب مولانا محمد حسین آزاد کی کتاب آبِ حیات کی طرح مختلف ادوار میں منقسم ہے - اور جیسا کہ خود مصنف نے دیباچہ میں لکھا ہے اس میں شاعری کے چار دَور قرار دیے گئے ہیں یعنی بہ ترتیب ذیل :

۱ - پہلا دور - اس میں قدما کی شاعری کے تاریخی انقلابات و تغیرات کو نمایاں کیا ہے اُردو شاعری کے آغاز پر بحث کی ہے اور اس قول کی مختلف حوالوں اور سندوں سے تردید کی ہے کہ اُردو شاعری کا موجد ولی دکنی تھا - بلکہ صفیر بلگرامی نے سعدی دکنی کے متعلق جو رائے قائم کی ہے کہ وہ تمام شعرائے دکن کا پیشرو تھا، اس کی بھی مخالفت کی ہے - مصنف کے خیال میں اُردو شاعری کی ابتدا دکن میں قطب شاہی عہد حکومت میں ہوئی اور پہلی شکل جو اس نوخیز شاعری نے اختیار کی وہ غزل کی نہ تھی - بلکہ نعت، منقبت، اور مرثیہ کی - اگرچہ وہ یہ تسلیم کرنے کو تیار ہیں کہ سعدی غالباً پہلا شاعر تھا جس نے اُردو غزل کہی - اس دَور میں مصنف نے دکھایا ہے کہ کس طرح بتدریج بھاشا اور اس کے بعد دکن کی غیر فصیح زبان نے اس فصیح اور بلیغ زبان کا رنگ اختیار کیا جسے اب ہم اُردو کے نام سے موسوم کرتے ہیں -

۲ - دوسرا دَور متوسطین کا ہے جس میں لکھنؤ کی شاعری کا آغاز ہوا اور دلی اور لکھنؤ کے دو الگ الگ اسکول قائم ہوئے اس دور کی اصلاحات و تغیرات کی تاریخ کے ساتھ دلی اور لکھنؤ کے امتیازی خصوصیات اور اس دور کے مختلف اساتذہ مثلاً مومن، ذوق، شاہ نصیر، غالب، ناسخ، آتش، اور اُن کے تلامذہ کی شاعری پر مفصل بحث کی ہے -

۳ - تیسرے دور میں متاخرین کا بیان ہے - لکھنؤ کی شاعری میں اس دور میں جو انقلاب پیدا ہوا اسکی تفصیل کی ہے -

۴۔ چوتھے اور آخری دور میں شعرائے حال کے کارناموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور اُردو شاعری کے تمام انواع یعنی قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ وغیرہ پر تاریخی اور ادبی حیثیت سے تنقید کی ہے۔ (اسکے متعلق خاتمۂ ریویو ملاحظہ ہو)

مضمونِ کتاب کے اس مختصر خاکہ سے ناظرین کتاب کی ترتیب اور موضوع کا اندازہ کرسکتے ہیں اور بآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کتاب اُردو ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ مصنف نے کم و بیش ان سب تذکروں کو جو اُردو شاعری کے متعلق دستیاب ہو سکتے ہیں پیش نظر رکھ کر اور انکا مقابلہ کرکے یہ کتاب فراہم کی ہے اور اُن کی محنت اور توجہ قابل تحسین ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اُردو شاعری کے متعلق اس قدر تذکرے پہلے سے موجود ہیں (چنانچہ مصنف نے دیباچۂ کتاب میں ایک طویل فہرست ایسے تذکروں کی درج کی ہے) تو وہ کیا بات تھی جس نے مصنف کو اس نئے تذکرہ کی تصنیف پر آمادہ کیا۔ اس کا جواب ہمیں مصنف کے دیباچہ سے ملتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"لیکن افسوس ہے کہ اس تمام سرمایہ میں ہمارے کام کی باتیں کم نکلتی ہیں"

اور اسکے بعد ڈی تاسی کی رائے نقل کرتے ہیں کہ:

"وہ تمام تذکرے جن کی فہرست اوپر گذر چکی ہے بالکل ناکمل ہیں اور عموماً ان میں صرف شاعر کا نام اور اُسکے کلام کا انتخاب پایا جاتا ہے۔ بعض موقعوں پر جہاں حالات و واقعات کو ذرا وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے وہاں بھی شاعر کی پرائیوٹ زندگی یا سال ولادت و وفات کے متعلق ایک حرف بھی بمشکل نظر آتا ہے اور نہ تو اس کے القاب (؟) کے متعلق کچھ لکھا ہوتا ہے اور نہ اس کی تالیفات و تصنیفات کا کچھ مذکور ہوتا ہے اور اکثر تو اسکے صاحب دیوان ہونے کا بھی ذکر نہیں ہوتا"

اور اس پر یوں اضافہ کرتے ہیں کہ:

"جن تذکروں کی یہ حالت ہے ان میں اُردو شاعری کے ہر دور کی خصوصیات عہد بہ عہد ترقیوں کے حالات اور اُن کے علل و اسباب کی تلاش ایک بے سود کوشش ہے"

اب قدرتی طور پر دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا واقعی یہ کتاب ان نقائص کی جو ڈی تاسی اور مصنف کے خیال میں کم و بیش سب تذکروں میں پائے جاتے ہیں اصلاح کرتی ہے یا نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ قابل مصنف کی یہ کتاب ان تذکروں پر فلسفیانہ اور تنقیدی نقطۂ نظر سے بہت فوقیت رکھتی ہے۔ لیکن ایک کمی اور نقص جسکا ڈی تاسی نے خاص طور پر سندرجۂ بالا عبارت میں ذکر کیا ہے یعنی تذکروں کا شاعر کے حالات زندگی اور سوانح حیات سے عاری ہونا۔ وہ میرے خیال میں اس تذکرہ میں اور تذکروں سے زیادہ نہیں تو برابر ضرور ہے۔ مصنف نے جن شاعروں کے کلام پر بحث کی ہے اُنکے حالات زندگی، اُنکے معاشرتی، اخلاقی اور ملکی احوال کو تقریباً بالکل نظر انداز کر دیا ہے اور صرف انکے کلام کی خصوصیتوں پر بحث کی ہے۔

میری رائے میں کسی زبان کی تاریخ لکھنے کا یہ طریقہ ہرگز درست نہیں کہ اس زبان کے ماہرین فن کے کلام سے نمونے پیش کیے جائیں اور تنقیدی پہلو سے اُن پر بحث کر دی جائے۔ شعر اور شاعر، کلام اور متکلم کا تعلق ایسا گہرا اور غیر منقطع ہے کہ کسی شاعر کے کلام کو ہم حقیقت میں اسوقت تک نہیں سمجھ سکتے جب تک کہ ہمیں یہ معلوم نہ ہو کہ وہ شاعر کس زمانہ میں تھا، کتنے برس زندہ رہا، اُس نے اپنی زندگی کے دن کس طرح گذارے، اسکا مزاج کیسا اور طبیعت کس طرح کی تھی۔ انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ تصویر کو دیکھ کر مصور کو دیکھنے کا شوق پیدا ہوتا ہے، تحریر کو پڑھ کر تصویر کاتب کی شکل وشباہت کا جویاں ہوتا ہے، اور کلام کو سُن کر متکلم کی وضع قطع معلوم کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ یہی خاصہ ہے جو ایک بھرے مجمع میں ایک تماشائی کو مجبور کرتا ہے کہ وہ جس طرح بھی ممکن ہو مقرر کی نہ صرف تقریر سننے کی کوشش کرے بلکہ ایسی جگہ موجود ہو جہاں سے اُسے دیکھ بھی سکے۔

یہی وہ تقاضائے فطرت ہے جس کی وجہ سے ہم معمولی گفتگو میں بھی جب تک متکلم کے چہرہ کی طرف نہ دیکھیں، اُس کی بات کو بخوبی نہیں سمجھ سکتے۔ دانشوران مغرب اس انسانی جذبہ کو، اس فطرتی اشتیاق کو خوب جانتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب وہ کسی ماہر فن کے متعلق کچھ لکھتے ہیں تو اُس کی زندگی اور سوانح حیات کے متعلق جو کچھ بھی تاریخی مسالہ دستیاب ہو سکے ضرور استعمال کرتے ہیں بلکہ اگر ممکن ہو تو بسا اوقات اُس کی تصویر بھی شامل کتاب کرتے ہیں۔

علاوہ اس فطرتی اشتیاق کے مطمئن کرنے کے ایک دوسرے نقطۂ نظر سے بھی یہ ضروری ہے کہ کسی شاعر کے کلام کو پڑھتے وقت ہمیں اُس کی ذات سے کچھ نہ کچھ واقفیت ہو۔ شاعری کیا ہے؟ جذبات واحساسات کا اظہار موزوں الفاظ میں۔ خواہ یہ جذبات اور احساسات نفس وعشق سے پیدا ہوں یا مشاہدۂ قدرت سے۔ مطالعۂ تاریخ سے برانگیختہ ہوں یا زندگی کے سرد وگرم، تلخ وشیریں تجربات سے۔ میرے خیال میں یہ شاعری کی ایک بہت جامع تعریف ہے اور جب

اقسام شاعری اس تعریف کی ذیل میں آسکتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم اُن اسباب و علل، اُن واقعات اور حالات کو جن سے کسی شاعر کا قلب متاثر ہوتا ہے نظر انداز کرکے اس شاعر کے کلام کو کما حقہٗ سمجھ سکتے ہیں اس کی حقیقی قدر و منزلت کو پہچان سکتے ہیں یا نہیں؟ یہ صحیح ہے کہ اگر ہم میں شعر سے بہرہ اندوز ہونے کا مادّہ ہے تو ہم اسکے اشعار کا لطف کسی حد تک اس کی ذات سے بالکل ناآشنا رہ کر بھی اُٹھا سکتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم کسی شاعر کے الفاظ، بندش اور اسلوب تحریر پر نکتہ چینی کر سکیں حالانکہ ہمیں اس کی اصل قدر و منزلت اسکے جذبات کے عمق و طاقت سے کچھ بھی شناسائی نہ ہو۔ بلکہ اگر ہم میں ذوق سلیم ہو تو یہ بھی ممکن ہے کہ ہم پاکیزہ اور سقیم، بلند اور مبتذل خیالات میں امتیاز کر سکیں۔ لیکن اس شاعری کی ماہیت اور صحیح مرتبہ کا اندازہ اسکے حریفوں اور ہمعصروں سے اس کا مقابلہ اور اس کے کلام کی بنیاد اور ارتقاء کے فلسفہ کا سمجھنا اسوقت تک ممکن نہیں جب تک کہ ہمیں شاعر کی ذات اور حالات زندگی سے کچھ واقفیت نہ ہو۔ ہم بائرن (Byron) کی طوفانی زندگی، اسکی بوالہوسی اور حسن پرستی کو نظر انداز کرکے کس طرح اس کی نظموں سے پورا حظ اُٹھا سکتے ہیں؟ اس کی عاشقانہ اور رندانہ شاعری کی کس طرح توجیہ و توضیح کر سکتے ہیں؟ لیک کنٹری (Lake Country) کے خوبصورت مناظر سے آنکھیں بند کرکے ہم مصور قدرت ورڈزورتھ کی شاعری کی کیا خاک قدر کر سکتے ہیں؟ سیف الدولہ ہمدانی کے مجاہدانہ اور سرفروشانہ حملوں کو جانتے ہوئے متنبّی کے قصائد کی عظمت اور شکوہ کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے۔ خلفائے بنی عباس کے دربار کی شان و شوکت، بغداد کی زندگی کے تعیش و تنعم سے بےخبر رہ کر ابونواس کی غزل گوئی کی کیا تشریح ہو سکتی ہے۔ غدر کے حالات اور خاندان مغلیہ کی تباہی کو پس پشت ڈال کر کوئی اُس سوز اُس رقت و درد سے جو غالب کی شاعری میں موجود ہے کیا بہرہ اندوز ہو سکتا ہے؟ یا اُس عقیدت اہل بیت اُس محبت و تعظیم آل اطہار کی نوعیت سے بیگانہ ہو کر جو میر انیس کو وراثۃً حاصل تھی کیسے ان کے مراثی سے سینہ سوز ہو سکتا ہے۔ مصنف نے غالباً اسی ضرورت کو محسوس کرکے بعض جگہ اشارۃً ایک آدھ شاعر کے واقعات زندگی کا تذکرہ کیا ہے۔ مثلاً میر تقی اور سودا کے موازنہ میں بہار بے خزاں کے حوالہ سے میر صاحب کے ایک زخم عشق کی تشریح کی ہے یا آتش و ناسخ کے بیان میں خواجہ صاحب کی فقیرانہ اور آزادانہ زندگی کا ذکر کیا ہے۔ لیکن یہ اشارات اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے جو اوپر بیان کی گئی بہت ناکافی ہیں۔ ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ اردو شعرا کے متعلق اس قسم کی واقفیت ہم پہونچانا ناممکن یا دشوار رہے۔

لیکن اگر زیادہ نہیں تو کم از کم ہر ایک شاعر کے سن وفات اور مختصر حال کا ذکر ہونا ضروری ہے۔ اس لحاظ سے تو میرے خیال میں مولانا آزاد کی کتاب آبِ حیات زیادہ صحیح اصول پر ترتیب دی گئی ہے۔ اور یہی باعث اس کتاب کی ہر دلعزیزی اور قبول عام کا ہوا۔ یہ ضرور ہے کہ آزاد نے تاریخی چھان بین سے زیادہ کام نہیں لیا۔ لطایف و ظرائف کو تحقیق کی خورد بین سے دیکھے بغیر بے کم و کاست نقل کر دیا ہے اور اس طرح کتاب کی تاریخی قدر و قیمت کو بہت گرا دیا ہے لیکن بہتر یہ ہوتا کہ اب ایک کتاب اسی طرز کی لیکن اس سے زیادہ صحیح اور مستند لکھی جاتی۔ نقشہ وہی ہوتا لیکن عمارت کو زیادہ مستحکم بنا پر قائم کیا جاتا، خاکہ وہی رہتا لیکن اس میں رنگ زیادہ احتیاط اور سچائی اور حقیقت کا زیادہ لحاظ رکھ کر بھرے جاتے۔ اور اگر مولانا عبد السلام اس حقیقت کو پہچان لیتے تو اُن کی کتاب اس سے بہت زیادہ مقبول و مرغوب، مفید و کار آمد ہوتی جتنا کہ وہ بحالت موجودہ ہو سکتی ہے۔

اس تنقید سے مراد صرف اظہار رائے ہے۔ کتاب کی وقعت کو گھٹانا کسی طرح سے مقصود نہیں اور اپنی رائے کو میں ناقابل تردید بھی نہیں سمجھتا۔ لیکن ایک اہم اعتراض جو میرے ذہن میں اس کتاب کو دیکھتے ہی پیدا ہوا وہ اُسکے نام "شعر الہند" کے متعلق ہے جو غالباً شعر العجم کے تتبع میں رکھا گیا ہے۔ زیادہ تحقیق اور احتیاط سے کام لیں تو شعر العجم بھی فارسی شاعری کے لیے چنداں موزوں نام نہیں ہے۔ اس لیے کہ عجم سے مراد صرف ایران نہیں، بلکہ عرب اپنے علاوہ سب قوموں کو عجمی کہتے تھے۔ اور اس طرح ترکی، فارسی، ہندی، نبطی، ارمنی وغیرہ سب عجمی زبانیں کہلائی جا سکتی ہیں۔ لیکن عجم کا لفظ چونکہ استعمال عام و قدیم سے ایران کا مترادف ہو گیا ہے، اس لیے کسی قدر موزونیت اس نام میں ضرور ہے۔ لیکن اُردو شاعری کو شعر الہند کا نام دینا ایک ناجائز تصرف اور ایک غیر ضروری حق تلفی ہے۔ ہندوستان ایک ملک نہیں، بلکہ برِّ اعظم ہے۔ اس میں بیشمار قومیں اور بیشمار زبانیں ہیں۔ اگر کنڑی، تلوگو، تامل، گجراتی، مرہٹی، ملتانی، پشتو سے قطع نظر بھی کر لیں اور یہ سمجھ لیں کہ ان زبانوں میں کوئی قابل بیان شاعری موجود ہی نہیں، تو بھی بنگالی، ہندی، اور کسی حد تک پنجابی سے کیسے آنکھیں بند کر سکتے ہیں۔ بنگالیوں کا تو یہ دعوےٰ ہے کہ آج دنیا میں نہیں تو ایشیا میں رابندر ناتھ ٹیگور کی ٹکر کا کوئی شاعر نہیں۔ پنجابی ہیر رانجھا پر ایسے ہی نازاں ہیں جیسے انگریز شکسپیر کے ڈرامہ پر۔ اور جو کہیں ہندی کے اپدیشک اور پرچارک اس کی بھنک بھی پا جائیں کہ اُردو شاعری کو شعر الہند بتایا جاتا ہے تو کچھ عجب نہیں

... اس کی ... کبیر کے دوہے اور ہزاروں گیتوں کا بیش بہا ذخیرہ موجود ہوں کہ

من نیز حاضر می شوم تصویر جاناں در بغل

اس صورت میں سمجھ میں نہیں آتا کہ مصنف نے کس معنی میں اور کس بنا پر اردو شاعری کو شعرالہند کا لقب دیا۔

ایک اور بات جو کتاب کے سرورق پر نظر ڈالنے سے خیال میں خارش پیدا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ "شعرالہند" کے نیچے بہت صاف اور نمایاں طور سے "حصۂ اول" لکھا نظر آتا ہے۔ لیکن دیباچہ سے یا کتاب کی ترتیب سے یہ کہیں ظاہر نہیں ہوتا کہ مصنف کا ارادہ اور حصے لکھنے کا ہے بلکہ یہ بات سمجھ میں آنا مشکل ہے کہ اور حصوں میں، اگر وہ لکھے گئے، کیا ہوگا؟ اس لیے کہ بظاہر ... مضمون کتاب کو اسی جلد میں پورا کر چکے ہیں۔ کیونکہ قدما کے دور سے لیکر دور جدید تک سب شعرا اس میں مذکور ہیں۔ قیاس سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاید مصنف کا ارادہ پہلے ہی ہو کہ کتاب کو زیادہ مفصل پیرایہ میں لکھا جائے۔ اور کئی حصوں میں تقسیم کیا جائے لیکن بعد میں خاص وجوہات کی بنا پر یہ خیال ترک کر دیا ہو۔ اگر یہ قیاس صحیح ہے تو تاسف کا مقام ہے۔ کیونکہ کتاب کو کئی حصوں میں لکھنے سے جو جامعیت و استغراق پیدا ہو سکتا تھا وہ اس کی قیمت کو دوبالا کر دیتا۔ یا ممکن ہے کہ یہ ارادہ ہو کہ آیندہ حصوں میں زیادہ تفصیل اور تحقیق کے ساتھ مختلف ادوار کا الگ الگ بیان ہو۔ یا تیسری صورت یوں ہو سکتی ہے کہ بعد کے حصوں میں ترتیب تو یہی رکھی جائے یعنی ابتدائے شاعری سے زمانۂ حال تک سب ادوار کو لیا جائے۔ لیکن بعض ایسے شعراء کے متعلق جن کا بیان اس حصہ میں نہیں ہوا، یا اگر ہوا تو بہت سرسری طور پر، زیادہ تفصیل سے لکھا جائے۔ بہرحال یہ سب قیاس ہیں۔ اور جب تک قابل مصنف خود ہی اس معمے کی عقدہ کشائی نہ کریں اس پر زیادہ لکھنا بے سود ہے۔

کتاب کے نفس مضمون کے متعلق ہر شخص تعریف اور تحسین کرے گا۔ جس محنت اور تدقیق سے مصنف نے کتاب تالیف کی ہے وہ ان تذکروں کی طویل فہرست سے ظاہر ہے جن کا انھوں نے مطالعہ کیا۔ مصنف کی سلیم طبع اور ذوق صحیح کا بدیہی ثبوت وہ اقتباسات ہیں جو انھوں نے ہر شاعر کے کلام سے اس کے کلام کی خصوصیات کے اظہار و تمثیل کے لیے پیش کیے ہیں۔ انکی منصف مزاجی اور بے لاگ شاعرانہ اور سخن شناسی ان غیر متعصبانہ تنقیدات و تعریفات سے ... جو انھوں نے دلی اور لکھنؤ کے شعراء کے مقابلہ و موازنہ میں کی تھیں۔ جس خوبی سے

انھوں نے اُردو شاعری کے تدریجی ارتقا کو قدم بقدم بیان کیا ہے وہ انکی عالمانہ بصارت اور فاضلانہ نکتہ سنجی کی شاہد ہے۔ دورِ جدید میں قومی، مذہبی، تمدنی، ملکی اور خارجی قوتوں کا جو اثر اُردو شاعری پر ہوا، اُسکو اچھی طرح بیان کیا گیا ہے۔ حالی کے طرزِ قدیم کے خلاف بغاوت، اور انکے علمِ بغاوت کے نیچے مختلف حیثیتوں سے زمانۂ جدید کے کم و بیش سب ممتاز شاعروں مثلاً چکبست، اکبر، اقبال، عزیز، حسرت، جوہر وغیرہم کا اجتماع ایک موثر اور دلکش پیرایہ میں دکھایا گیا ہے۔

لیکن یہاں بھی میں اتنا ضرور عرض کروں گا کہ دیباچہ میں مصنف نے لکھا ہے کہ خاتمۂ کتاب اُردو شاعری کے تمام اصناف پر بحث کے ساتھ ہوتا ہے۔ اُردو غزل کے متعلق تو بیشک بہت کچھ لکھا ہے، لیکن بعض اور اقسامِ شاعری یا تو بالکل مذکور نہیں یا اگر ہیں تو بہت ہی سرسری طور پر۔ مثلاً قصیدہ کا تو غالباً نام بھی نہیں۔ مثنوی اور مرثیہ کا اشارتاً ذکر ہے اور مرثیہ میں میر انیس اور دیگر مشاہیرِ فن کا بالکل بیان نہیں۔ حالانکہ اس صنفِ شاعری کا جو مرتبہ اُردو میں ہے وہ ہر صاحبِ نظر پر روزِ روشن کی طرح واضح ہے۔ اور میر انیس سے شاعر کا ایک ایسی کتاب میں جو اُردو شاعری کے تمام اقسام کے بیان میں لکھی گئی ہو مذکور نہ ہونا ایک ناقابلِ توجیہ فروگذاشت ہے۔ ممکن ہے مصنف نے اس خیال سے کہ مولانا شبلی "موازنۂ انیس و دبیر" میں اس موضوع پر بہت کچھ لکھ چکے ہیں، عمداً اسکو نہ لیا ہو۔ لیکن اگر یہ واقعہ ہے تو اس کا ذکر بالصراحۃ دیباچہ میں ہونا لازمی تھا۔ یا یہ بھی ممکن ہے کہ حصہ دوم میں اس کا ذکر ہو۔ دیگر اصنافِ شاعری کے بیان میں بھی بعض مشہور شعرائے حال کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ مثلاً قومی شاعری اور وصف نگاری کے باب میں صفی کا بالکل ذکر نہیں اور جو مہارت اُن کو ان اصناف شاعری میں حاصل ہے اُسکے بیان کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح ظریفانہ شاعری میں بھی ظریف لکھنوی کے کلام کا کوئی نمونہ مجھے کتاب میں نہیں دکھائی دیتا۔ جن لوگوں نے ان کی ظریفانہ نظمیں پڑھی ہیں یا جنھیں حال میں کیننگ کالج کے مشاعرہ میں شرکت کا موقع ملا ہے وہ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ انھیں اس فن میں کس قدر یدطولیٰ حاصل ہے۔

بہرحال کونسا پھول ہے جو بے خار ہے اور انسان کا کیا کام خطا سے بری ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ قدرشناس لوگ بوستانِ ادبِ اُردو کے اس گلِ نودمیدہ کا پرتپاک خیرمقدم کریں گے اور میری طرح اسکی شادابی اور سردیٔ تغافل سے مصئون رہنے کی تمنا۔ فقط

محمد وحید مرزا

شرابی

(چیخوف کی تیسری کہانی)

فرولف، ایک کامیاب و مشہور تاجر اور آلمر، اُسکا وکیل شہر کے باہر ایک قہوہ خانہ کے کمرہ میں بیٹھے شراب پی رہے تھے؛ فرولف، نوجوان اور خوبصورت تھا، اُسکی گول داڑھی تھی اور روشن و مخملی آنکھیں، آلمر معمّر تھا، اُسکا سر بڑا اور بھدّا تھا؛ وہ دونوں رقص خانہ سے آرہے تھے، اس لیے اُن کے جسم پر چھوٹے کوٹ اور گلے میں سفید ٹائیاں تھیں۔ کمرہ میں اُن کے یا نوکروں کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ فرولف نے کہہ رکھا تھا کہ کسی کو آنے نہ دیا جائے۔

دو بڑے بڑے گلاس سرخ شراب سے اُنھوں نے بھرے اور خالی کر دیے؛ پھر وہ گوشت کھانے لگے۔

"سنتے ہو!" آلمر نے کہا "شراب کے ساتھ گوشت کھانے کا رواج میں نے ہی شروع کیا ہے، شراب تمھارے گلے میں اک خراش، اک سوزش پیدا کر دیتی ہے اور گوشت کھاتے وقت تمھیں ایک عجیب گدگدی محسوس ہوتی ہے؛ کیوں نا؟"

ایک تمیزدار ملازم نے جس کے ہونٹوں پر سبزہ جم رہا تھا میز پر ایک کشتی لاکر رکھی۔

"کیا لائے ہو؟" فرولف نے دریافت کیا

"تلے ہوے انڈے، آلو کے کباب اور...."

"کیا اسی طرح لاتے ہیں؟" فرولف چلایا، اُس نے کشتی میں نظر ڈالے بغیر بگڑ کر جھنجلانا شروع کیا "یہ انڈے ہیں؟ اسی کو انڈا کہتے ہیں؟ تجھے کچھ تمیز بھی ہے؟ بیوقوف... اُلو...!"

فرولف کی مخملی آنکھیں چمکنے لگیں، اُس نے میزپوش کا ایک سرا اپنی انگلی سے پکڑ کر کپڑے کو ہلکی سی جنبش دی اور آن کی آن میں پلیٹیں، بوتلیں، گلاس اور شمعدان، ایک دوسرے سے دست و گریبان ہو کر میز کے نیچے آرہے اور ٹوٹ کر چور چور ہو گئے۔

ملازم جو اِن حرکتوں سے اچھی طرح واقف تھا، خاموشی کے ساتھ زمین پر بیٹھ کر ٹوٹے ہوے برتن جمع کرنے لگا۔

"ان ٹکڑاموں سے کام لینا تم ہی خوب جانتے ہو!" آلمر نے کہا اور وہ ہنسا "لیکن... دیکھو، ذرا میز سے ہٹ کر بیٹھو، تمہارا پیر انڈوں پر نہ پڑ جائے"

"انجنیر کو بلاؤ!" فرولف نے حکم دیا۔

یہ ایک بڈھا، کمزور اور ناکارہ انسان تھا جو کبھی انجنیر رہ چکا تھا اور اب اس قہوہ خانہ میں نوکروں کا داروغہ تھا، اور گانے یا عیاشی کے انتظام کی دیکھ بھال اسکے سپرد تھی۔ وہ آیا اور اپنا سر ادب سے ایک سمت جھکا لیا۔

"دیکھیے!" فرولف نے اُس سے کہا "اس بد انتظامی کا کیا مطلب ہے؟ ایک نوکر بھی ڈھنگ کا نہیں! آپ کو نہیں معلوم میں اِن باتوں سے کتنا گھبراتا ہوں؟ خدا غارت کرے! کیا تم لوگوں کا مطلب یہ ہے کہ یہاں آنا بند کر دیا جائے؟"

"میں نہایت ادب سے معافی چاہتا ہوں" انجنیر نے جواب دیا "میں ابھی خبر لیتا ہوں اور آیندہ سے آپ کو کوئی شکایت نہ ہو گی"

"ٹھیک! بس جائیے....."

انجنیر نے اپنا سر خم کیا اور دو قدم پیچھے ہٹ کر وہ ایک دروازہ میں غائب ہو گیا۔

میز پھر سے چُنی گئی، آلمر نے سرخ شراب پی اور بھونا ہوا گوشت اور انڈے کھائے، فرولف صرف معمولی دیسی شراب پیتا رہا، اپنے کھُلے ہاتھوں کو اُس نے اپنے چہرہ پر پھیرا، ایک جمائی لی، اور بڑبڑانے لگا، اُس کی طبیعت میں ایک طرح کی تھکن، ایک طرح کی بےچینی تھی، اُس کا چہرہ پریشان اور سرخ تھا، دونوں خاموش تھے، کمرے میں تنہائی اور خاموشی تھی، بجلی کے دو لیمپ مدھم، بے روح اور اُداس جل رہے تھے۔

دروازہ اور کھڑکیوں میں کمسن خوبصورت مصری لڑکیاں گنگناتی ہوئی جھانک رہی تھیں۔

"ہزار پیو مگر طبیعت کی اُداسی، افسردگی نہیں جاتی" فرولف نے کہا "جتنا میں پیتا ہوں اُتنی ہی بے لطفی اور بے کیفی بڑھتی ہے؛ لوگ شراب پی کر بے فکر اور مست ہو جاتے ہیں، مجھے غصہ آتا ہے، پریشان خیالات، بے خوابی، اُداسی۔ آخر لوگ عیاشی اور شراب نوشی کے علاوہ کوئی اور شغل کیوں نہیں تلاش کرتے؟"

"مصری لڑکیوں کو بلاؤ؛ طبیعت ٹھیک ہو جائے گی!" آلمر نے رائے دی۔

"دُور بھی کر دو!"

دروازہ سے ایک بڑھی وقاصہ جھانکی۔

"حضور!" بڑھی عورت بولی "یہ لڑکیاں شراب اور چائے مانگتی ہیں، دی جائے؟"

"ہاں، ہاں" فرولعت نے کہا "تم جانتی ہو کہ ایک فی صدی منافع کی یہ حصہ دار ہیں، آخر انھیں کی وجہ سے تو لوگ یہاں آتے ہیں ورنہ کون آتا ہے! اور آج کل اعتبار کس کا ہے، خریداروں کا بھی کوئی اعتبار نہیں، سب لالچی، خود غرض، دغاباز، بے ایمان لوگ ہیں، کسی کا اعتبار نہیں، اب ان نوکروں ہی کو دیکھو، چہرہ سے بالکل پروفیسر معلوم ہوتے ہیں انھیں دو سو روبل ماہوار ملتا ہے، یہ اپنے اپنے مکانوں میں رہتے ہیں اور اپنی لڑکیوں کو اسکول بھیجتے ہیں انھیں کوئی تکلیف نہیں، مگر ان سے چاہے جتنی قسمیں لے لو، ان کی چاہے جتنی نگہداشت کرو مگر بھلا یہ اپنی بے ایمانی سے باز آتے ہیں۔"

"آخر یہ ہے کیا؟" آلمر نے اُسے حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا "اتنے بدحواس کیوں ہو رہے ہو؟ تمہارا چہرہ سرخ ہو رہا ہے جیسے کوئی وحشی جانور ہو۔۔۔"

"اُف۔۔۔ ف۔۔۔ تو وہ ایک بات ہے جو کسی طرح میرے دل سے نکلتی ہی نہیں، وہ ذہن سے جاتی ہی نہیں، معلوم ہوتا ہے وہاں وہ جم گئی ہے، گاڑ دی گئی ہے، وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتی"

ایک بدقطع، گول، بڑھا، جس کے جسم پر گوشت ہی گوشت تھا اور جس کے سر کے بال غائب تھے، ایک میلی واسکٹ پہنے اور ایک پرانا ستار اپنے کندھے سے لگائے کمرے میں داخل ہوا، اُس کے چہرے پر خباثت اور وحشت تھی، پاس آکر اُس نے ایک فوجی سلام کیا۔

"آگیا، خبیث!" فرولعت نے ایک خشک قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "تم شاید اسے نہیں جانتے" اُس نے آلمر کو مخاطب کیا "یہ ثور کی بوی کی نقل خوب کرتا ہے"

اُس نے کئی قسم کی شراب ایک گلاس میں ملا کر بڈھے کو دی، بڈھے نے شراب پھینک دی اور خالی گلاس اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔

"کچھ سنائیے گا؟" فرولعت نے اُس سے کہا۔

بڈھا بیٹھ گیا، اپنی موٹی بھدی انگلیوں سے اُس نے تاروں کو چھیڑا اور گانا شروع کیا:

"آجا۔۔۔ آجا۔۔۔ پیارے! ہاں، آجا۔۔۔ آجا۔۔۔ بانکے!

کب سے ہے انتظار۔۔۔!"

فرولعت مدہوش ہو رہا تھا، اُس نے اپنی مٹھی زور سے میز پر مار کر کہا:

"وہ بات کسی طرح نہیں نکلتی، ایک منٹ مجھے چین سے نہیں بیٹھنے دیتی"

"کیوں! آخر کیا بات ہے؟"

"میں بتا نہیں سکتا، یہ ایک راز ہے، اس قدر پوشیدہ بات ہے کہ وعاکے وقت کے سوا کبھی میں اپنی زبان سے نہیں نکال سکتا ... تم پوچھتے ... تو ... دوستی کی وجہ سے ... تم سے چھپانا بیکار ہے ... مگر ... مگر ... دیکھو کسی سے ... کسی سے بھی نہیں ... نہیں ... ہاں میں تم سے کہوں گا، اس سے میری طبیعت ہلکی ہو جائے گی ... مگر ... بس سنو اور بھول جاؤ ..."

فرولف نے جھک کر ایک منٹ تک آلمر کے کان میں کہا:

"مجھے اپنی بیوی سے نفرت ہو گئی ہے!"

وکیل نے تعجب سے اُسے دیکھا۔

"ہاں، ہاں، اپنی بیوی سے ... ماریا سے" فرولف چیخنے لگا "میں اُس سے نفرت کرتا ہوں، اور یہی خیال اتنی دیر سے مجھے پریشان کر رہا ہے"

"کیوں؟"

"مجھے خود نہیں معلوم کیوں! ابھی ہماری شادی کو دو سال بھی نہیں ہوئے، تم جانتے ہو، شادی محبت کی بناء پر ہوئی تھی اور اب میں اُسے دشمن سے بدتر سمجھتا ہوں، کوئی سبب سمجھ میں نہیں آتا! جب وہ میرے پاس بیٹھتی ہے یا میرے ساتھ کھاتی ہے یا مجھ سے کوئی بات کرتی ہے تو میری روح گھٹنے لگتی ہے، میں آپے سے باہر ہو جاتا ہوں، کاٹ کھانے کو جی چاہتا ہے، مگر اُس سے کیسے کہوں، اُسے چھوڑ دینا بالکل ناممکن ہے، یہ بڑی بیجا بات ہے اور پھر واقعات عدالت اختیار کرلیں گے، اُس کے ساتھ رہتا ہوں تو جی متلاتا ہے، گھر دوزخ سے بدتر ہے، میں گھر پر ٹھہر نہیں سکتا! دن بھر دکان پر رہتا ہوں، راتیں ہوٹلوں میں گذارتا ہوں، ایک اختلاجی کیفیت ہر وقت مجھ پر طاری رہتی ہے، مگر بتاؤ! آخر اُس سے کوئی کس طرح کہے؟ وہ معمولی عورت نہیں، وہ خوبصورت ہے، عقلمند ہے، خاموش ہے!"

بد قطع وجمعیت بڈھا آواز پر زور دے دے کر گائے جاتا تھا:

"نین میں تیرے جادو! ... پیت تری سلونی ...!

آنکھ کے تارے، دل کے سہارے! کب سے ہے انتظار ...! آجا ... آجا ... پیارے!"

"میں کہتا ہوں میرا شروع سے خیال تھا کہ ماریا تمھارے لائق نہیں ہے" ایک لمحہ کی

خاموشی کے بعد آلمر نے کہا اور اُس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری ۔

"تمہارا مطلب یہ ہے کہ وہ مجھ سے زیادہ تعلیم یافتہ ہے ؟ ... واہ ، اسکول میں مجھے ایک دفعہ طلائی تمغہ ملا تھا ، اپنے وقت میں سب سے زیادہ قابل طالب علم مَیں سمجھا جاتا تھا ، پھر ، میں تین مرتبہ پیرس بھی جا چکا ہوں ، اس میں شک نہیں میں تم سے زیادہ عقل نہیں رکھتا ، مگر بہ ہر حال بیوی سے کہیں بہتر ہوں ، نہیں بھائی ، تعلیم کا کوئی سوال نہیں ، میں بتاؤں یہ شروع کیسے ہوا ؟ یہ یوں شروع ہوا ، کہ ایک دن بیٹھے بیٹھے مجھے خیال آیا کہ آریا نے محبت میں نہیں بلکہ روپئے کی وجہ سے مجھ سے شادی کی ہے ' یہ خیال میرے دماغ پر حاوی ہوگیا ، چھا گیا ، میں نے ہزار کوشش کی کہ اسے نکال دوں مگر وہ اُسی جگہ پر ہے ' وہ اپنی مسند پر قائم ہے ، اُس پر طرہ یہ کہ میری بیوی واقعی بہت خرچ کرنے والی واقع ہوئی ہے ، افلاس کے بھٹے سے نکل کے اب جو وہ سونے اور چاندی کی کان میں داخل ہوئی تو خرچ ہی کی اُسے پڑی ہے ' ہر وقت خرچ ، روپیہ پیسہ کی طرح بہایا جاتا ہے ، اُسے کوئی ہمدردی نہیں ، یہاں تک کہ آخر آخر وہ بیس ہزار سالانہ اُٹھانے لگی ، اور میں تو بھائی کسی سے کوئی امید نہیں رکھتا ، نہ کسی کا اعتبار کرتا ہوں ، میں ہر شخص کو شبہ کی نظر سے دیکھتا ہوں ، جتنا تم مجھ سے قریب ہوتے جاؤ گے ' اُتنا ہی میں فکر مند رہوں گا ، مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے ، گویا روپیہ کی خاطر میری خوشامد کی جاتی ہے ' میں کسی کا اعتبار نہیں کرتا میں عجیب وغریب انسان ہوں ، بہت دشوار ، مجھے سمجھنا مشکل ہے ! "

فرولف نے ایک سانس میں شراب کا ایک گلاس خالی کیا ۔

"مگر یہ سب کچھ نہیں " اُس نے پھر کہنا شروع کیا " اس کا ذکر ہی بیکار ہے ' یہ حماقت ہے میں بدحواس ہوں اور نہ معلوم کیا بک رہا ہوں ، تم مجھے وکیل کی نظر سے دیکھ رہے ہو — تم خوش ہو کہ میرا راز معلوم کر لیا ، خیر ، خیر ... اب اس ذکر کو جانے دو ، پیو ! کوئی ہے ؟ اُس نے ایک نوکر کو مخاطب کیا " ارے مصطفے یہاں ہے ؟ ذرا اسے بلاؤ ! "

کچھ دیر بعد ایک چھوٹا کوئی بارہ برس کا تاتاری لڑکا کمرے میں آیا ، وہ ایک چھوٹا کوٹ پہنے تھا ، اور اُس کے ہاتھوں میں سفید دستانے تھے ۔

"یہاں آؤ " ! " فرولف نے اُس سے کہا " یہ تو بتاؤ : ایک وقت تھا جب تاتاریوں نے ہمارے ملک کو فتح کر لیا تھا اور تم لوگ ہم پر حکومت کرتے تھے ، اب تم ہمارے غلام ہو ، نوکر ہو ، اس کی کیا وجہ ہے ؟ "

مصطفےٰ نے اپنی شرمیلی آنکھیں اُٹھائیں اور کہا: "یہ قسمت کا انتقام ہے!"
آلمر نے اُسکے چہرے کو غور سے دیکھا اور ایک قہقہہ لگایا۔
"اچھا! اسے ایک روبل دیدو" فرولف نے کہا "یہ قسمت کے انتقام ہی سے اپنی روزی کماتا ہے، انھیں دو الفاظ کے لیے یہ یہاں رکھا گیا ہے، مصطفےٰ! شراب پی گئے؟ تم بہت شریر ہو، میرا مطلب یہ ہے کہ تمھاری طرح نہ معلوم کتنے آزار رئیسوں کے پیچھے لگے ہیں، اس قسم کے صلح کُن اور خاموش ڈاکوؤں کا شمار ہی نہیں ہو سکتا! اچھا! اب مصری لڑکیوں کو بلاؤ ۔۔۔!"
لڑکیاں جو دیر سے بے صبر ہو رہی تھیں، اک دَم گھس پڑیں۔
"شراب پیو!" فرولف نے اُن سے کہا "پیو اور گانا گاؤ!"
"وہ رات ٹھنڈی ... وہ تیرا آنا ..."
لڑکیاں گاتی رہیں، ہنستی رہیں، ناچتی رہیں، نشۂ دولت اور نشۂ شراب میں چُور فرولف نے اُنکے لیے کھانا طلب کیا، اور شراب منگائی، بجلی کا لیمپ توڑ دیا، بوتلیں آئینوں اور تصویروں پر پھینکنا شروع کیں اور اس انداز سے برابر گرجتا رہا، برستا رہا، جیسے وہ تمام دنیا سے بیزار ہے، اور سب سے قطع تعلق کر لینا چاہتا ہے، انجنیر کو بُلوا کر اُس نے زبردستی اُس سے گانا سنا اور دیسی ذلیل شراب میں تیل ملا کر اُسے پلوایا۔
چھ بجے اُنھوں نے بِل پیش کیا۔
"نو، سو، پچیس، روبل" آلمر نے پڑھا اور کانپ گیا "یہ کیسے؟ نہیں، میں حساب دیکھوں گا!"
"رہنے دو!" فرولف نے اپنی پاکٹ بُک نکال کر جھنجلاتے ہوے کہا "اچھا! ... لُوٹ لو، مجھے لُوٹ لو، میں اسی لیے امیر بنایا گیا ہوں کہ مجھے لوٹ لیا جائے! اِن لوگوں سے کسی طرح رہائی نہیں! ... تم میرے وکیل ہو ... تم مجھ سے چھ ہزار سالانہ لیتے ہو اور ... کس لیے؟ ... مگر خیر، معاف کرو ... مجھے نہیں معلوم کیا بَک رہا ہوں"
جب وہ آلمر کے ساتھ گھر واپس جا رہا تھا، فرولف نے اُس سے راہ میں کہا:
"گھر جانے سے اور وحشت ہوتی ہے! افسوس ... اس دُنیا میں کوئی نہیں جس سے میں دل خوش کر سکوں ... سب ڈاکو ہیں ... دغا باز ... مکّار ... اور میں نے تم سے اپنا ... کیوں کہہ دیا؟ ... کیوں کہہ دیا؟ ... بتاؤ ... کیوں کہہ دیا؟

گھر کے پھاٹک پر پہونچ کر لڑکھڑاتے ہوئے وہ اکمل سے رخصت ہونے لگا :
"خدا حافظ ... میں عجیب آدمی ہوں، قابلِ ملامت، بدکار ..." اُس نے کہا
"ایک ناکارہ، ذلیل، بجیا انسان ؛ تم تعلیمیافتہ ہو، عقلمند ہو، مگر تم بھی صرف میرے ساتھ شراب پیتے ہو، اور مجھ پر ہنستے ہو ... تم لوگوں سے کوئی امید نہیں ... اگر تم میرے دوست ہوتے، اگر تم ایماندار اور وفادار ہوتے تو تم مجھ سے نفرت کرتے، تم کہتے "دور ہو، قابل نفرت، قابلِ لعنت درندے !"

"اچھا اچھا" اکمل نے کہا "اب جا کر سو رہو"

"کوئی امید نہیں، صرف ایک امید ہے، گرمیوں میں جب دیہات کے دورے کو جاؤں اور کہیں سیر کو نکلوں تو ایک خوفناک طوفان آجائے، اور مجھ پر بجلی گر پڑے اور میں اُسی جگہ جل کر خاکِ سیاہ ہو جاؤں ..."

فرولعت کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے اور دو نوکر اُسے سہارا دے کر کوٹھے پر چڑھا لے گئے۔

جلیل قدوائی (علیگ)

جفا کا آپ دکھا دیجیے جفا کر کے
بگڑ گئے زخم کو مرہم سے آشنا کر کے
بہارِ جوشِ جنوں گر یہی رہی اپنی
بتا دے اے دلِ ناکام اس سے کیا حاصل
جو کہنا چاہے دہنِ زخم سے کہے بسمل
وہ ہنس کے غیر سے کہتے ہیں میری تربت پر
زبانِ حال سے کہتی ہے میری ناکامی
اٹھا لیا مرے ساقی نے مجکو محفل میں

ستم کو چھوڑ دیے ہرگز نہ ابتدا کر کے
خراب کر گئے عادت مری دوا کر کے
اس ابتدا کی دکھا دینگے انتہا کر کے
کلیجہ تھام لیا آہِ نارسا کر کے
خدا کے سامنے قاتل کا سامنا کر کے
یہ خوب سوئے محبت کا حق ادا کر کے
کہ کیا ملا ہے تمھیں عرضِ مدعا کر کے
دلِ شکستہ کو جامِ جہاں نما کر کے

کسی کی بزم میں باسط کا دل کوئی دیکھے
نگاہِ ناز کا بیٹھا ہے سامنا کر کے

باسط بسوانی

ایک ابر کا ٹکڑا

ایک روز غروب آفتاب کے قریب مجھے چند ابر کے خوشنما ٹکڑے نظر آئے۔ بیساختہ جی چاہا کہ ان پر پریاں بٹھاؤں، اور اُن سے جنوں کی تاک جھانک دکھاؤں۔ قلم اُٹھایا تو تخئیل لے بھاگی۔ جو کچھ بُرا بھلا اُسوقت لکھ سکا ہدیۂ ناظرین الناظر ہے۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

زعفر جن ہوا میں اُڑتا، اپنے پر و بازو پر ناز کرتا، اپنی قوتِ پرواز پر گھمنڈ کرتا ہوا، آفتاب سے آنکھ لڑائے چلا جا رہا تھا۔ اُسکے زعم میں زمین و آسمان کچھ نہ سماتے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ دنیا والے اُسے صد سالہ ہونے کی وجہ سے مُسن سمجھیں گے اور آسمان والے ناکردہ کار۔

لیکن رگوں میں گرم خون کا سیلان، طبیعت میں اُمنگ اور دل میں پریوں کی تلاش کی خواہش ایسی نہ تھی جو اُسے یہ نہ بتا دیتی کہ اُس کا عین عنفوانِ شباب تھا۔ پوری ایک صدی گذر گئی تھی لیکن اس جنوں کے شہزادے کو صنفِ مخالف سے ربطِ روحی نہ ہوا تھا۔ آج دفعتاً اسکے دل نے پھریری لی اور ایک خاص کیفیت اس پر طاری ہوئی۔

وہ مروارید کے محل میں بیٹھا ہیرے کے فوارے سے پانی کا اُچھلنا اور گرتے گرتے موتی کی لڑی بننا دیکھ رہا تھا کہ دفعتاً جسم بھر بھرایا، رونگٹے کھڑے ہوے، اور اُسے ایک خاص قسم کی مسرت محسوس ہوئی۔ وہ بیساختہ گاتا ہُوا ہوا میں اُڑنے لگا۔

وہ اسی انوکھی کیفیت پر غور کرتا ہوا۔ ہوا پر کبھی تھمتا، کبھی اپنے شہپروں سے اُسے کاٹتا ہوا چلا جا رہا تھا کہ اسکی نظر ایک ابر کے ٹکڑے پر پڑی جسکے سپید سپید چلتے ہوے روئی کے پہل کے ڈھیر کو شعاعوں کی روپہلی سُنہری دیویاں طرح طرح کے رنگوں سے رنگ رہی تھیں۔

زعفر کی آتش و باد کی بنی ہوئی آنکھیں، آفتاب کے سامنے نہ جھپکنے والی آنکھیں خیرہ کرنے لگیں۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں بند کرلیں، اپنے میں طرح طرح کے جذبات محسوس کیے۔ کچھ گھبراہٹ، کچھ استعجاب، اور تھوڑا سا ڈر۔

ابھی جو کھن سے آہستہ آہستہ چھوٹنے والے ماہتاب کی طرح آنکھیں کھولیں تو دیکھا سُنہری پری

ایک مخملی بادل پہ قد سے لانبے بال چھٹکائے، سانچے میں ڈھلی ہوئی ٹانگیں پھیلائے رُوپہلی پری کو بیٹھی چھیڑ رہی ہے۔ ہنستی ہے تو بجلی چمکتی ہے، ابرو اُٹھتے ہیں تو قوس قزح بنتی ہے، ہاتھ لاتی ہے تو دُنیا کا ذرہ ذرہ چمک اُٹھتا ہے۔

زعفر نے آنکھوں سے اس تصویر کو پینا چاہا، کلیجہ مُنہ کو آنے لگا - ہر بُن مو میں روح آکر پھڑپھڑانے لگی - اُس نے گھبرا کر پھر آنکھیں بند کر لیں اور داہنا پَر بڑھا کر چہرے کے سامنے آڑ کر لیا -

کیوپڈ نے عرش کے جھروکے سے جھانک کر دیکھا - اس جوانِ رعنا کی سادہ لوحی پر ہنسا اور کمان میں تیر جوڑ کر شست باندھی -

زعفر ابھی تک ایک پَر سامنے کیے دوسرے پَر کے ذریعے ہوا پر قائم تھا کہ دل مچلا، نوجوان خون سرعت سے دماغ کی طرف چلا، کنپٹی اور گردن کی رگیں پھول لیں، اور اُس نے ڈرتے ڈرتے پَروں کی آڑ سے سنہری پری پر چوری نگاہیں ڈالیں - تقاضائے فطرت نے اُن مستی و مدہوشی کے سمندروں کو بھی ادھر پھیرا - بحر کاہل و بحر منجمد ملے!

کیوپڈ کے قہقہے میں جنتی ترنم کی لہر آئی - کمان سے تیر چھوٹا - ہوائیں رباب بابدی کی صدائیں پھیلیں - اور تیر - کیوپڈ کا سنہرا تیر - زعفر کا بایاں بازو توڑتا، پہلو چھیدتا، پرافشاں نکل گیا -

زعفر ہوا میں لڑکھڑایا - اور ایک آہ کے ساتھ زمین خس و خاشاک سے بھری زمین کی طرف چلا - گلابوں کی شاخیں جھکیں - لالہ نے آغوش پھیلائی لیکن وہ تیر عشق کا گھایل - خون میں نہایا ہوا، خار مغیلان میں آکر اٹک رہا - اُس کا ٹوٹا ہوا بازو لٹک رہا تھا - اُسکے دل سے خون کے فوارے نکل رہے تھے - اُس کا منکا ڈھلا ہوا تھا اور اُس کی چاند کو شرمانے والی آنکھیں بند تھیں -

سنہری پری ابھی تک اٹکھیلیوں ہی میں مشغول تھی - اُسے یہ بھی خبر نہ تھی کہ زعفر پر کیا گذری کہ دفعتاً سائیک* - کیوپڈ کی دوسری تصویر - یا دوسرے رخ نے اپنے کھلے ہوئے جوڑے سے - ریشم -

† کیوپڈ یونانیوں کے خدائے عشق کا نام ہے - اُسکے پاس ہر وقت ایک سنہرا تیر رہتا ہے، اور جسکے دل میں محبت پیدا کرنی ہوتی ہے اسے وہ اس تیر کا ہدف بناتا ہے -

* سائیک کیوپڈ کی معشوقہ ہے - میں نے اپنی تخئیل سے مجبور ہو کر اُسکے لیے بھی ایک کام نکالا - ورنہ یونانیوں نے اسے محض ایک ہیولی مروی بنا کر چھوڑ دیا ہے -

سے زیادہ نرم۔ ایک بال ٹوٹا اور اُسکے دونوں سروں پہ دو پھندے دے کر ہوا کے سپرد کیا۔ ایک تو زعفر کے ڈھلے ہوئے سر میں جا کر اٹکا، اور دوسرا شاید سنہری پری کے گلے کی ہیکل بنا۔

اس لیے کہ دفعتاً پری نے پلٹ کر اپنے بسمل کو دم توڑتے دیکھا، اور پر جوڑ کر بجری کی طرح ٹوٹی اور زعفر کے پھول سے جسم پر شبنم کی طرح گری اور بلبل کی طرح فریاد کرنے لگی۔ اس تیر عشق کے زخمی نے جو روح کو ایک خاص طرف کھنچتے پایا، گھبرا کر آنکھیں کھول دیں اور سر اُٹھا کر ادھر اُدھر دیکھا۔ دفعتاً پھر صاعقۂ طور سی چمک دکھی۔ کمزور دل و دماغ میں دھچکا لگا۔ اور وہ پھر اُسی طرح بیہوش ہو گیا کہ اُسکا آغوش محبت میں رہنے والا سر کانٹوں پر آرہا۔

زعفر کی اس جھینپ نے ہلتی ہوئی شاخوں کو اور جنبش دی اور اُس کا بے حس و حرکت جسم آن کی گود سے۔ مچلنے والے بچے کی طرح۔ چھوٹ کر زمین کی طرف چلا۔ پری تڑپ کر اُٹھی، اور قبل اسکے کہ وہ گل اندام خود رو سبزے کے مخملی گدّے پر پہونچ سکے، اُس نے جھپٹ کر زعفر کو بغل میں دبا لیا، اور آسمان پر لے اُڑی!

علی عباس حسینی۔ ایم اے

ناکام جا رہا ہے کوئی بزم یار سے　　　ہوش و حواس کھوئے دل بیقرار سے

فرقت نصیب تنگ رہے ہیں جا ے مرگ　　　گھبرا گئے ہیں کشمکشِ انتظار سے

اس فتنہ خیز چال سے ظالم سنبھل کے چل　　　ہیں اور بھی مزار ہمارے مزار سے

دم سے اسی کے ہے یہ جہاں میں چہل پہل　　　ہنگامہ عشق کا ہے بپا حسنِ یار سے

کیوں ہر نفس بپا ہے یہ شورِ رواروی　　　کیا مرنا ہے زندگی مستعار سے

مشتاق تیرے وصل کے جو تھے وہ روز حشر　　　آغوش وا کیے ہوئے اُٹھے مزار سے

میں خوش ہوں میرے خرمن ہستی کو پھونک دو　　　بجلی گرا دو حسن تبسم شعار سے

دیکھا۔ حریم ناز کے پردے اُلٹ گئے　　　میری ہوا ے دل انتظار سے

راز آشنا ے غم ہے مرے سوگ میں یہ　　　آنسو ٹپک رہے ہیں جو شمع مزار سے

اقدس بس ہے جس کا نام وہ عاشق مزاج پر　　　خوش ہو گئے ل کے آپ بھی اس جاں نثار سے

اقدس حیدرآبادی

اظہارِ خیال

النّاظر بابت ماہ جنوری ۲۶ء میں مولوی محمد محسن صاحب تاثیر ایم اے کا مضمون "اودھ پنچ کے بیجا اعتراضات" میری نظر سے گذرا۔ اس میں بعض امور مزید تحقیق کے محتاج ہیں

غالب کا شعر ہے

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا — حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

حضرت تاثیر فرماتے ہیں کہ "ماندگی سے بیابان کا کوئی ترکیبی تعلق نہیں۔ وضاحت کے لیے مصرعہ اول کی نثر کیے دیتا ہوں، غالب کہتے ہیں کہ ماندگی سے میرا ذوق (دشت نوردی) ایک بیابان (پھر بھی) کم نہ ہوگا۔"

مولانا نظم نے "یک بیاباں ماندگی" سے کثرتِ ماندگی مراد لی ہے اور اس بات کے سمجھانے کو کہا ہے کہ ایک بیاباں خواہ صد بیابانِ ماندگی کہو مراد ایک ہی ہے یعنی ماندگیِ مفرط۔ ایک بیاباں کہکر ماندگی کی مقدار بیان کی ہے گویا بیاباں کو اُس کا پیمانہ فرض کیا ہے۔

مجھے حضرت تاثیر سے اتفاق نہیں کہ بیابان سے ماندگی کا کوئی ترکیبی تعلق نہیں۔ لفظ ماندگی بیکاری نہیں بلکہ تھکن کا مرادف ہے لہذا اسکا تعلق ذوقِ صحرانوردی سے ظاہر ہے۔ بادیہ پیمائی میں پاؤں کا شل ہونا لازمی ہے۔ اگر بیابان اور ماندگی میں ربط نہیں جیسا حضرت تاثیر کا خیال ہے تو "یک بیاباں ماندگی" اور "بیابان بھر ماندگی" دونوں میں سے ایک بھی صحیح نہیں۔

"یک بیاباں ماندگی" سے کثرتِ ماندگی ہی مراد ہے جیسا مولانا نظم نے فرمایا۔ میر کا شعر ہے اور لاجواب شعر ہے

یک بیاباں برنگِ صوتِ جرس — مجھ پہ ہے بیکسی و تنہائی

یہاں بیکسی و تنہائی کی افراط یک بیاباں کہہ کر دکھائی ہے۔ اس پر "برنگِ صوتِ جرس" کے ٹکڑے سے ترقی کرنا اور تشبیہ سے ثبوت پیش کر دینا میر او رحضرت میر کا کام تھا۔

شعلہ سے نہ ہوتی ہوس شعلہ نے جو کی — جی کس قدر افسردگیِ دل پہ جلا ہے

مولانا نظم نے اس شعر کی یہ شرح کی ہے۔ "ہوس شعلہ نے جو بات کی وہ شعلہ سے بھی نہ ہوتی کہ جی کو جلا ہی ڈالا۔ اور جی جلنا اردو کے محاورہ میں ناگوار ہونے کے معنی پر ہے۔ یہاں یہ مقصود نہیں ہے بلکہ جی جلنے سے کڑھنا مقصود ہے۔ اور یہ مصنف نے اپنے مزاج کے موافق دل سوختن کا ترجمہ کر لیا ...... لیکن اردو میں یہ کہنا کہ اُس کی بےکسی پر دل جلتا ہے اچھا نہیں ہے۔ افسردگی دل سے اُسکا شعلۂ عشق سے خالی ہونا مراد ہے۔"

مولانا نظم کا فرمانا لفظ بلفظ درست ہے کہ جی جلنا محاورہ ہے اور اسکے معنی ناگوار ہونے کے ہیں۔ یعنی دل کڑھنا محاورہ نہیں بلکہ فارسی کا ترجمہ ہے۔ مولانا بیخود یا تاثیر نے جو شعر میر کا لکھ کر درج کیا ہے اور جو دراصل سودا کا ہے اُنکے دعوے کی دلیل نہیں ہو سکتا۔

بیکس کوئی مرے تو جلے اُسپہ دل مرا　　　گویا یہ ہے چراغ غریباں کی گور کا

کیونکہ خود سودا بھی غالب کی طرح فارسی جملوں اور محاوروں کے ترجمہ کا شایق تھا۔ متعدد مثالیں اُسکے کلیات میں ملیں گی۔ تذکرۂ آبِ حیات میں مفصل بحث موجود ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ مگر یہ ترجمے محاورہ کا حکم نہیں رکھ سکتے۔ گو الفاظ محاورہ کے ہوں۔ جب تک اُسی خاص مفہوم میں مستعمل نہ ہوں جو اہل زبان نے مقرر کر دیا۔

اندرونِ خانہ زرزان ست پنہاں　　　کیں حال نیست صوفیِ عالی مقام را

یہ پابندیِ محاورہ وسعتِ زبان میں مخل اندازی ہے یا نہیں ایک مختلف بحث ہے جس سے مجھے اسوقت سروکار نہیں۔ سوال یہ ہے کہ غالب نے اپنے شعر میں جی جلنا کس معنی میں استعمال کیا ہے؟ آیا جو محاورہ ہے یعنی ناگوار ہونا یا فارسی کا ترجمہ ہے یعنی کڑھنا یا مغموم ہونا؟ میرے نزدیک غالب نے محاورہ ہی نظم کیا ہے پہلے مصرعہ سے شکایت کا پہلو نکلتا ہے۔ دل شعلۂ عشق سے اس طرح نہ جلتا جس طرح اس شعلہ کی حسرت یا ہوس میں چپکے چپکے جل گیا۔ شاعر کو دل کے اس طرح جل جانے پر غم و غصہ ہے (جس میں ناگوار ہونے کا مفہوم مضمر ہے) اور کہتا ہے کاش یہ دل پژمردہ و افسردہ اس قدر ہمت رکھتا ہوتا اور جانتا ہوتا کہ جلنا ہی ہے تو شعلۂ عشق سے ہم آغوش ہو کر بے محابا کیوں نہ جل جائے۔ مگر دل ہوس شعلہ میں (ہوس میں گرمی و التہاب بخاصیہ موجود ہے) اندر ہی اندر سلگ کر خاک ہو گیا۔ یہ موقع غم و غصہ کا ہے نہ کہ تاسف کا۔ گر حضرت تاثیر نے شعر زیر بحث میں "جی جلنا" کے وہی معنی تسلیم کر لیے جو مولانا نظم نے بیان فرمائے یعنی دل کڑھنا حالانکہ غالب نے محاورہ کو محاورہ ہی کی حد میں نظم کیا ہے۔ اُسکے متعدد اشعار اس دعوے کے شاہد ہیں جو نہیں کہا جا سکتا

وہ اس محاورہ سے نا واقف تھا۔ مثلاً خود وہ شعر جو جناب تاثیر نے نقل کیا (دگر محاورہ کا دوسرا پہلو کہے)

ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتشبار ہے　　جی جلے ذوق فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں

یا یہ مقطع

دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دُنیا جل گیا　　میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل

یہاں سوا غم و غصہ و ناگوار ہونے کے اور کوئی گوشہ پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔

اثر۔ لکھنوی

کلامِ بیخود

محشر میں اک نگاہ تری کام کر گئی　　عالم پہ ایک ساتھ قیامت گذر گئی

کیا جانے دل نگاہ پہ کیسی گذر گئی　　دل تا بجلوہ گاہ نظر تا بدر گئی۔

ہر ذرہ بیقرار ہے ہر شے ہے سوگوار　　اک دل کے ٹوٹنے کی کہاں تک خبر گئی

کہتی ہے قیس سے یہ پلٹ کر نگاہِ شوق　　محمل اُداس اُداس ہے لیلیٰ کدھر گئی

ہاں ہاں یہی نظر کہ ہے آئینۂ جمال　　چلمن بنی ہے جی کی طرح جب بکھر گئی

میں دل سے پوچھتا ہوں حواسوں کو ہول میں　　دل مجھ سے پوچھتا ہے تمنا کدھر گئی

پھر حشر چاہتے ہیں قیامت کے داد خواہ　　ہر سُو دوہائیاں ہیں کہ بدنام کر گئی

کس طرح سجدے سیجئے پائے نگاہ تک　　دیکھا کسی نے مُڑ کے یہ جب تا بدر گئی

جب غش سے چونکتے ہیں تیارکے پائمال　　اُٹھتا ہے ایک شور کہ برباد کر گئی

ہر شے کو کچھ نہ کچھ تو کسی سے لگاؤ تھا　　سجدے کیے ہیں دل نے جہاں تک نظر گئی

بیخود کو صور حشر نہ بیدار کر سکا
اب تک نہ دل سے لذتِ خوابِ سحر گئی

محمد احمد بیخود موہانی (ایم اے)

اخلاقیات

دکھائے جو نہ جاں بازی کہاں اُسکو سرفرازی — نہ ہوتا جو جُدا تن سے گریباں میں وہ سر ہوتا

بحرِ غفلت کے تلاطم سے ذرا بچ کے نکل — اس کی ہر موج میں خمیازہ ہے طوفانوں کا

اپنے سینے میں ذرا جھانک کے دیکھ اے حاسد — آتشِ دوزخ سوزندہ کا سوزاں ہونا

ملت کی بزدلی کا دیکھیں یہ سین کب تک — اے جذبۂ شجاعت سینوں سے پھر اُبل جا
جرأت اگر امر ہے۔ ہمت اگر اٹل ہے — آئی ہوئی قضا سے کہہ دو کہ سر سے ٹل جا

چڑھ جاؤ تم ترقیٔ عزت کے بام پر — گر ہمتِ بلند کی ہو نردباں نصیب

تو نہ جس قوم کی ساتھی ہو وہ ہوتی ہے تباہ — تجھ میں ہے راز ترقی کا نہاں اے ہمت
جی چُراتے نہیں زحمت سے جو سائے میں ترے — دیکھتے ہیں وہی رحمت کا سماں اے ہمت

اے حسد تجھ میں قیامت کی جلن پاتا ہوں میں — جسکی لَو سے آتشِ دوزخ کی شرماتی ہے آنچ

سینہ بے کینہ رکھ اے شیخ کدورت ہو تجھے — نظر آتا نہیں وہ دل میں غبار آنے پر

ناکامی کام ہے مردوں کا، نامرد ہیں جو کامی ہیں یہاں — ہمت ہے اگر تو دل کو کبھی جذبات ہوس کا رام نہ کر
جو عیش طلب ہیں عیش اُن کا ہوتا ہے بدل کر طیش اکثر — آرام سے ہیں دن کاٹنے گر، تو ایک گھڑی آرام نہ کر

کر عاجزی کی قدر تو اے خود پسند دل! یہ چیز وہ ہے جو نہیں ملتی خدا کے پاس

اقبال کی موجوں پہ سفینوں کو چلا تُو رہنا ہے اگر ورطۂ ادبار سے محفوظ
ناکام اگر ہو تو نہ ہمت کبھی ہارو رہتے نہیں بازی میں سدا ہارے محفوظ
ٹُھک ٹُھک کے منافق جو ملا کرتے ہیں اکثر تلوار ہیں یہ - انکی رہو دھار سے محفوظ
دمساز جو دم دے - تو نہ دم دو کبھی اُس پر گر یار رہو عیار - رہو یار سے محفوظ

الٰہی دے مجھے وہ دل کہ ہر ساعت ہے خنداں اگرچہ سیکڑوں نشتر پہونچ جائیں رگِ جاں تک
چھپاتی نورِ حق کو ہیں حسد کی ظلمتیں اب بھی پہونچ سکتا ہے اب بھی ماہِ کنعاں چاہِ کنعاں تک

خودی نے مجھ کو پہونچایا وہاں تک خدا بھی آ نہیں سکتا جہاں تک

دل خوں ہے ۔ پھر بھی ہنستے ہیں رنج و محن میں ہم اک پھول ارغواں کا ہیں گویا چمن میں ہم

تم کبھی نرم مزاجی پہ ستمگر کی نہ جاؤ پنجہ فولاد کا مخمل کے ہے دستانے میں
دل میں قوت جو اُبھرنے کی ہے بیکار نہ جائے ایک پودا ہے پھبکتا ہوا اس دانے میں

زنہار نہ ملاح سے امداد طلب کر طوفاں بھی گر آکر تری کشتی سے لپٹ جائیں

حجابِ سستی و بیخودی کا ہٹادو روشن دلوں سے اپنے
تمہاری قسمت کے ہیں جو تارے تم اُنکو آنے نہ دو گہن میں

اس طرح چلتی ہے قوموں میں تعصب کی ہوا دوڑتی آگ ہے جس طرح نیستانوں میں

محنت و صبر سے ہوں گی وہ مہمیں پوری ہمتیں جن کے تصور سے جھجک جاتی ہیں

نرم نرم آکے جو ٹکراتی ہیں لہریں پیہم
لبِ دریا سے چٹانیں بھی سرک جاتی ہیں
بغض کی آگ بھڑکتی ہے جو محکوموں میں
قسمتیں اہلِ حکومت کی چمک جاتی ہیں
جن کو ہے خوئے تعیش نے بنایا نازک
بارِ غم سے کمریں اُنکی لچک جاتی ہیں

عسرت کے در پہ کاش لگائے کوئی صدا
"اک روز جھانکنی ہیں امیروں کی چوکھٹیں"

حال اپنا نہ تم بدلو۔ احول بدل جائے
مرکز ہیں سدا قائم۔ گردش میں ہیں پرکاریں

وحیدالدین سلیم (از حیدرآباد دکن)

جذباتِ اثر

تری زلف کیوں ہے شکن شکن کہ اسیرِ موجِ صبا نہ ہو
ترا حُسن کیوں ہے چمن چمن کہ بہار آکے فدا نہ ہو
کم و بیش کو ہو دخل اگر تو دلیل نقص ہے بے خبر
وہی عشق ہے جو نہ بڑھ سکے وہی درد ہے کہ سوا نہ ہو
ترا وسوسہ ہے غلط ضرور اُسے تو نہ وعدہ خلاف کہہ
مری آس توڑ نہ ہمنشیں اُسے یاد وعدہ رہا نہ ہو
ملے اور دل کے جھکے ذرا اُٹھے اور دل میں چبھے ذرا
نہیں دیکھنے میں یہ دیکھنا کہ نظر لڑے تو جدا نہ ہو
یہ جفا کا شوق تو دیکھیے کبھی دستکش بھی ہوا اگر
یہی سوچتا رہا فتنہ گر کہ وہ ظلم ہو جو ہوا نہ ہو
نہیں بچیگا نہ نماز اثر جسے وقت وقت سے پڑھ لیا
یہ فریضہ عشق کا عمر بھر جو ادا کرو تو ادا نہ ہو

اثر لکھنوی

باغ فردوس کا اصلی مصنف

جناب بندہ - تسلیم۔ "الناظر" کے پرچہ اکتوبر و نومبر و دسمبر ۱۹۲۵ء کے حصہ "نظرے خوش گذرے" میں بصفحہ ۹۰ میر ولایت علی فردوس و حیدری کی جانب مثنوی "باغ فردوس" (جس میں "فسانہ عجائب" نظم کیا گیا ہے) منسوب کی گئی ہے - چونکہ ادبی معاملات میں "الناظر" کی بےنظیر کدوکاوش غالباً اسکے پیدائش سے میرے زیر مطالعہ رہی ہے، اور یہی اسکی نمایاں خصوصیت ہے جو اسکے دیگر اوصاف علمی و تاریخی وغیرہ پر غالب ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ اس مثنوی کے متعلق ایک خاص امر سے آپ کو مطلع کروں - جو یہ ہے کہ یہاں باندا میں اس مثنوی کے متعلق ابتداء سے وہی خیال ہے جو مثنوی "گلزار نسیم" کے متعلق عام طور پر مشہور اور بعض حلقوں میں مسلم ہے - میر صاحب موصوف یہیں کے رہنے والے ہیں۔ اور غالباً سنہ ۵۸ء کے چند برس بعد یہاں سے لکھنؤ میں جا بسے تھے۔ مگر اُنکے خاندان کی ایک خاتون مع مرزا حبیب حسن صاحب (مصنف "معدن تہذیب" وغیرہ) یہیں رہ گئی تھیں - اور گو آخر الذکر بھی انٹرنس پاس کرنے کے بعد لکھنو کو چلے گئے، مگر خاتون موصوفہ یہیں مریں اور دفن ہوئیں - انکے بعد ایکبار میر صاحب پھر یہاں تشریف لائے تھے اور چند ماہ تک ٹھہرے رہے تھے - اس چندروزہ قیام میں اور اس سے قبل مستقل قیام کے زمانہ میں اُنھوں نے اکثر اس مثنوی کے متفرق مختصر مختصر حصے مجمع احباب میں بیٹھ کر سنائے اور ہمیشہ نہایت لطف بخش ادا کے ساتھ - ان سامعین میں ایسے بزرگ بھی تھے جو باندہ کے آخری نواب شمشیر بہادر صاحب اور انکے نامی شاعر میر نادر علی صاحب نادر کی صحبت میں بیٹھے ہوئے تھے - اور اُنکا ہمیشہ یہ بیان رہا کہ بعینہ اسی مثنوی کو اُنھوں نے بارہا نواب صاحب موصوف کے دربار میں نادر کی زبان سے سُنا تھا لیکن صرف اُس مقام تک جہاں تباہی جہاز کا ذکر ہے - اور خود جناب فردوس نے اس سے آگے کا کوئی حصہ یہاں کبھی نہیں سنایا۔ ممکن ہے کہ تکمیل اُنھوں نے کرلی ہو - میرے راوی میرے دوست حکیم مرزا قادر بیگ صاحب ہیں اور وہ اپنے والد مرزا امیر بیگ صاحب اور اپنے پھوپھا مرزا رحیم علی بیگ صاحب اور اپنے اُستاد حکیم رشید محمد صاحب رشید سے راوی ہیں - حکیم رشید صاحب نادر کے شاگرد تھے اور فن شعرگوئی میں شان اُستادی رکھتے تھے - اور خود اُن کو اس مثنوی کے بہت سے

اشعار یاد تھے۔ اُنکے دو دیوانوں کو جو اعلیٰ درجہ کے کلام پر مشتمل بیان کیے جاتے ہیں اُنکے ایک شاگرد لالہ بھیشری پرشاد عرف رجولال آثر نے اپنے خاندان کے ایک نالائق فرد سے حاصل کرکے اور اُس میں آثر کے بجائے اپنا جدید تخلص تسنیم داخل کرکے اپنا لیا ہے۔

بالفعل مجھے نادر کا ایک شعر ملا جو یہ ہے:

سرگشتہ ہوا ہوں فلکِ پیر سے پہلے　　　پابند ہوں پیدائش زنجیر سے پہلے

رشید کے کلام کا نمونہ یہ ہے:—

پیری میں اپنی سیف زباں کا اثر نہیں　　　پھلتا ہے جس میں تیغ کا پھل وہ شجر نہیں

چمن سا حسن پھولا ہے شبابِ گلرخاں ہو کر　　　نکھر آیا ہے کیا جوبن بہار بے خزاں ہو کر
مری آہ و فغاں کے ساتھ چل نکلا دلِ مضطر　　　روانہ ہو گیا یوسف شریک کارواں ہو کر
سگ جاناں ادھر ہے اُس طرف تو لے ہُما پر ہے　　　پڑا ہیں مرکے کس جھگڑے میں مشت استخواں ہو کر

گرداب بحرِ عشق میں چکر بلا کے ہیں　　　ہر موج کے نیام میں خنجر قضا کے ہیں
اچھے مریض عشق بتِ مہ لقا کے ہیں　　　منت کش دعا ہیں نہ خواہاں دوا کے ہیں

مخمس کا ایک بند:—

نہ فکر دلق گدائی نہ ذکر تاج شہی　　　نہ ذوقِ تنگ قبائی نہ شوق کج کلہی
گذر گئے ہو تم آپے سے یار ہے ہو وہی　　　تمہیں نہ یاد ذرا منزلِ عدم میں رہی
رشید جامۂ ہستی کہاں اُتار آئے

آپ کے اس فقرہ "وہ (یعنی فردوس) مشاعرہ کے مرد میدان نہ تھے" نے حکیم قادر بیگ صاحب کی یہ روایت بھی یاد دلا دی کہ جناب میر صاحب نے بارہا لکھنؤ سے طرح بھیجکر رشید سے غزل منگوائی تھی۔

تینوں سامعین مرت ہوئی کہ عدم آباد کو سدھار گئے۔ میرے راوی حکیم قادر بیگ صاحب ہنوز بقید حیات ہیں۔ عمر قریب ۶۰ کے ہے۔

مخلص عبدالرحیم عفی عنہ سنٹرل ناظر عدالت ججی باندا۔ خریدار الناظر ۱۶۹

نظرے خوش گذرے

الناظر کا یہ مشترکہ نمبر اپریل میں شایع ہو جانا چاہیے تھا مگر میری صحت کی روزافزوں ابتری نے اب اس قدر بے بس کر دیا ہے کہ میرے سب کام وقت کے بعد ہی ہوتے ہیں - جاڑوں میں طبیعت ذرا چاق رہتی ہے تو کچھ کام بھی کیا جاتا ہے، گرمی کے مہینوں میں بالکل ہی ناکارہ ہو جاتا ہوں - اسلیے مجبوراً یہ تہیہ کرنا پڑا ہے کہ الناظر کی خدمت سے دستکش ہو جاؤں اور جو تھوڑی بہت محنت ہو سکتی ہے وہ اُس کاروبار پر صرف کرتا رہوں جو الناظر کے بدولت اگرچہ معرض وجود میں آیا ہے لیکن اب عرصہ سے خود الناظر کے نقصانات کا بہت کچھ کفیل ہے -

ممکن تھا اور غالباً قرین مصلحت بھی یہی تھا کہ الناظر بند کر دیا جاتا، لیکن ابھی شاید خدا کو یہ منظور نہیں ہے - اس لیے جولائی سے الناظر کی خدمت ایک لائق اور باہمت نوجوان کے سپرد کرنا چاہتا ہوں - یہ نوجوان بی اے کا امتحان دے رہے ہیں اور اپنے ادبی ذوق کی وجہ سے امتحان سے فراغت کر کے الناظر کی خدمت میں انشاء اللہ مصروف ہو جائینگے

اپریل - مئی اور جون کے تین پرچے اگر آیندہ ایک ماہ کے اندر شایع ہو سکتے تو بہتر تھا مگر اپنی صحت کی موجودہ حالت میں اور نیز اس سبب سے کہ الناظر بک ایجنسی کے بعض کاموں کے لیے جلد سے جلد حیدرآباد و بمبئی وغیرہ جانے کا قصد ہے امید نہیں کہ ان پرچوں کی اشاعت کا انتظام ہو سکے - اسلیے ان پرچوں کے معاوضہ میں ناظرین کرام کو دیوان تاثر چاندپوری کا ایک نسخہ ارسال خدمت کر دیا جائے گا -

جولائی سے انشاء اللہ ماہ بماہ پرچہ شایع ہوا کرے گا اور الناظر کی ظاہری و معنوی حالت میں ممتاز فرق نظر آئے گا - جو احباب الناظر کی ناوقت اشاعت سے آزردہ رہتے ہیں امید ہے کہ میری معذوریوں پر نظر فرما کر معاف کریں گے اور جدید انتظام سے مطمئن رہیں گے -

جن احباب کی قلمی اعانت کی بدولت الناظر کی تیس جلدیں پایہ تکمیل کو پہونچی ہیں اُن سے استدعا ہے کہ الناظر کے اس دَورِ جدید کو کامیاب بنانے میں اپنی امکانی سعی سے دریغ نہ فرمائیں میں خود بھی اگر طبیعت اجازت دیگی اور کچھ وقت صرف کر سکوں گا تو انشاء اللہ کبھی کبھی ناظرین و قدردانان

الناظر کی خدمت میں اپنے ٹوٹے پھوٹے خیالات پیش کرتا رہوں گا۔ وما توفیقی الا باللہ۔

باغ فردوس کے متعلق باندہ سے، منشی عبدالرحیم صاحب نے جو تحریر بھیجی ہے اُسکے بارہ میں زیادہ وثوق کے ساتھ کچھ عرض کرنے کا موقع نہیں۔ اس لیے کہ فردوس کا سارا کلام میری دسترس سے باہر ہے اور وہ لوگ جنھوں نے فردوس کے کلام سے پورا لطف اُٹھایا اب بہت کم رہ گئے ہیں۔ لیکن اُنکے اہل خاندان کا بیان یہی ہے کہ فردوس کا وطن ضلع رائے بریلی میں تھا۔ باندہ میں ان کا قیام اپنے بعض اعزا کے تعلقات کی وجہ سے ضرور رہا مگر وطن نہ تھا۔ حکیم مرزا قادر بیگ صاحب نے مثنوی کے بارہ میں جو روایت بیان کی ہے اُسکے تسلیم کرنے میں مجھے تامل ہے۔ اول تو یہ صحیح نہیں ہے کہ باغ فردوس میں تباہی جہاز تک کے حالات نظم کیے گئے ہیں۔ مثنوی چھپ چکی ہے اور ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اس میں صرف ملکہ مہر نگار کے پاس سے جانعالم کے رخصت ہونے تک کے حالات ہیں۔ کسی کتاب کے نامکمل رہ جانے کی صرف یہی ایک صورت نہیں کہ کسی دوسرے شخص کو اُسکا مصنف قرار دیا جائے۔ لاابالی اور رند مشرب لوگوں کے اکثر کام نامکمل ہی رہتے ہیں۔ اور فردوس کو جن لوگوں نے دیکھا ہے وہ یقیناً اس بات کی شہادت دینگے کہ اُن میں یہ صفت بدرجۂ کمال موجود تھی۔

منشی صاحب موصوف نے رشید کے بعض اشعار لکھے ہیں اور یہ روایت بھی بیان کی ہے کہ فردوس اُنکے پاس طرح بھیجکر غزلیں کہلواتے تھے۔ حالانکہ میں عرض کر چکا ہوں کہ فردوس مشاعرہ میں شریک ہی نہیں ہوتے تھے۔ اسکے علاوہ فردوس کا جو کلام میرے علم میں ہے اُس میں اور رشید کے کلام میں نمایاں فرق ہے۔ رشید کا ایک شعر ہے ؎

پیری میں اپنی سیحتِ زباں کا اثر ہوں میں ۔۔۔ پھلتا ہے جس میں تیغ کا پھل وہ شجر ہوں میں

اسی طرح میں فردوس کی بھی غزل ہے جسکا یہ شعر مجھے یاد ہے

الفت بتوں کے دل میں ہو میری خدا کی شان ۔۔۔ جو پتھروں پہ جم کے اُگے وہ شجر ہوں میں

دونوں نے شجر کا قافیہ باندھا ہے۔ سخن فہم اصحاب اندازہ کریں کہ رشید اور فردوس کے تخیل اور انداز بیان میں کتنا فرق ہے۔ رشید کے مطلع میں رعایتِ لفظی کے سوا کوئی معنوی خوبی نظر نہیں آتی۔ فردوس کا شعر اسکے مقابلہ میں کتنا صاف اور مضمون کے لحاظ سے کیسا پاکیزہ ہے۔ م

الناظر کی ابتدائی جلدوں میں فردوس کا فارسی و اردو کلام کبھی کبھی چھپا ہے۔ جولائی سنہ ۱۹

کے پرچے سے ایک اُردو غزل یہاں نقل کی جاتی ہے جس سے اُنکے رنگ کلام کا کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے

بغل میں ساقیٔ مہرو شراب ہاتھ میں ہے — دماغ عرش پہ ہے آفتاب ہاتھ میں ہے
لکھی ہے یار نے رنجش، میں پڑھ کے روتا ہوں — یہ مرثیہ ہے کہ خط کا جواب ہاتھ میں ہے
کبھی چھوا تھا تری زلف و روئے پُر نم کو — ہنوز نکہتِ شک و گلاب ہاتھ میں ہے
ہمارا قوتِ بازو ہے کاتبِ اعمال — خدا کے گھر کا حساب و کتاب ہاتھ میں ہے
ہوا ہوں میں یہ گنہگار چھو کے افعیٔ زلف — کہ زندگی میں لحد کا عذاب ہاتھ میں ہے
سوارِ توسنِ عمرِ رواں ہے عہدِ شباب — جلو میں ساتھ ہے تیرے رکاب ہاتھ میں ہے
جدھر سے چاہا طبیعت کی پھیر دیں باگیں — عنانِ توسنِ عہدِ شباب ہاتھ میں ہے

فردوس کا فارسی دیوان تقریباً مکمل تھا۔ اُردو دیوان جس وقت میں نے دیکھا ہے بہت ہی نامکمل تھا۔ مگر مرثیے اور قصیدے بہت تھے۔ مرثیہ گوئی میں میر انیس سے اصلاح کی تھی۔ اور اگر اُنکے مرثیے شایع ہو جائیں تو اندازہ ہو سکے گا کہ اس میدان کے وہ کیسے شہسوار تھے۔ اسکے علاوہ اُنھوں نے 'دُنیا' کا ایک ناٹک لکھا تھا جسکے بہت سے اشعار کبھی مجھے یاد تھے۔ اب بھول گیا ہوں۔ اس ناٹک میں اُنھوں نے دُنیا کی نیرنگی اور بے ثباتی کا خاکہ کھینچا تھا۔

مرزا قادر بیگ صاحب نے جو روایت بیان کی ہے اُسکے تسلیم کرنے کے لیے محض اُنکی ثقاہت اور کبر سنی کافی نہیں ہے۔ نادر نے بھی ممکن ہے کہ فسانہ عجائب کو اسی بحر میں نظم کیا ہو، اور ہم مضمون اشعار کو سُنکر لوگوں نے یہ خیال کیا ہو کہ فردوس بھی وہی کلام سنا رہے ہیں جو نادر نے سنایا تھا۔ گلزار نسیم پر کیا موقوف ہے، یورپ میں ایک جماعت تو شیکسپیر جیسے ملک الشعرا تک کے متعلق یہ رائے رکھتی ہے کہ جو کچھ اُسکے نام سے دنیا میں شایع ہے وہ شیکسپیر کا کلام نہیں، اور اس پر انگلستان کے رسائل میں برسوں بحث ہوئی ہے۔ مگر اس قسم کی روایات بہت ہی مشکل سے قابل قبول ہو سکتی ہیں۔

بہر حال امید ہے کہ فردوس کا بقیہ کلام بھی جلد یا بدیر منظر عام پر آجائے گا، اُس وقت مرزا صاحب کی روایت کی حقیقت زیادہ واضح ہو جائے گی۔

رسالۂ استبداد، اس دفعہ ختم ہو گیا ہے، سرورق ہنوز طبع نہیں ہوا۔ جن اصحاب نے اسکے اجزا بصورت کتاب مرتب کیے ہوں دفتر کو مطلع فرمائیں تاکہ سرورق طبع ہونے پر ارسال خدمت کیا جائے۔

برتنا، عزت کی حفاظت، حقوق کی مدافعت، دین کی حمایت، وطن کی خدمت، خاندان کی محبت، علم کی اعانت، مظلوم کی نصرت، ظالم کی عداوت، حقیر زندگی سے نفرت، غرضکہ اُن تمام اوصاف سے متصف ہونا اور اُن تمام کاموں کے لیے ہر وقت کمربستہ رہنا جو خاندانی و قومی تربیت کے چمنوں میں سرسبز اور بارآور ہوتے ہیں

استبداد قوم کو دروغ، مکر، حیلہ، دھوکہ، نفاق، تذلل، احساس کی مخالفت، عقل کے قتل ... پر مجبور کرتا ہے یعنی وہ ایسے صفات پر تربیت کرتا ہے جن کی موجودگی میں والدین خیال کرنے لگتے ہیں کہ بچوں کی خانگی تربیت ایک نہ ایک دن ضرور رائیگاں جائے گی، کیونکہ استبداد اُسے اُسی طرح مسخ کر ڈالے گا جس طرح اس سے پہلے خود اُنکی اپنی تربیت مسخ کرچکا ہے۔ مطلق العنان حاکموں کے غلام نہ اپنی جان کے مالک ہوتے ہیں نہ اپنی اولاد کے۔ اُنھیں کبھی یقین نہیں ہوتا کہ وہ اپنی اولاد کو اپنے یا خود اُسکے فائدہ کے لیے پرورش کر رہے ہیں بلکہ درحقیقت ایک مبہم احساس اس صورتِ حال کا رکھتے ہیں کہ اُنکی اولاد، اولاد نہیں بلکہ چوپائے ہیں جنھیں وہ مستبد کی شکم پُری کے لیے موٹا کر رہے ہیں۔ عہد استبداد میں اولاد دراصل آہنی زنجیریں ہیں جن سے غریب والدین ظلم و ذلت اور خوف و تنگی کے کھونٹوں پر بندھ جاتے ہیں۔ لہذا دورِ استبداد میں اولاد پیدا کرنا ایک حماقت ہے اور اسکی تربیت کرنا دوہری حماقت ہے۔

اکثر غلام افزائشِ نسل کے خیال سے اولاد پیدا نہیں کرتے بلکہ اسکی علت ایک تاریک جہالت ہوتی ہے۔ اِن بدبختوں کو کبھی احساس نہیں ہوتا کہ وہ علم، عزت، دولت، سخاوت، اور حملہ روحانی لذتوں سے محروم ہیں اور ایک ایسی زندگی بسر کر رہے ہیں جس میں کوئی لطف نہیں، اُن کی تمام لذتیں صرف اس میں ہیں کہ پیٹ کو حیوانات کا مقبرہ بنائیں، اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو نباتات کا گھورہ بنا دیں، پھر یہ کوشش ہوتی ہے کہ کسی طرح اپنی شہوت اُگل ڈالیں گویا اُن کے جسم سطح زمین پر پھوڑا ہیں جس کا کام بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ پڑا پیپ بہایا کرے! یہی بہیمی ندیدہ پن ہے جو اعلیٰ اخلاقی لذتوں سے محروم ہونے کی وجہ سے غلاموں میں پیدا ہوتا اور اُنھیں اندھا کرکے ازدواج و تناسل کی طرف ڈھکیلتا ہے۔ حالانکہ عہدِ استبداد میں دوسرے حقوق کی طرح عزت و آبرو بھی محفوظ نہیں ہوتی اور ہمیشہ فاسق مستبدوں اور اُن کے بدچلن مددگاروں کی ہوسناکیوں کی زد میں رہتی ہے، خصوصاً شہروں اور کمزور قصبوں

میں اُسکی حفاظت بہت مشکل ہوتی ہے۔

دولت و غربت کو بھی تربیت میں بڑا دخل ہے۔ نیز معیشت میں سلیقہ مندی بھی اگرچہ تنگدستی کے ساتھ ہو، تربیت کے لیے نہایت ضروری ہے۔ لیکن استبداد کے قیدیوں کی معیشت، عام اس سے کہ امیر ہوں یا غریب، تمامتر بدنظمی ہوتی ہے۔ اسی لیے تربیت سے کوسوں دُور ہوتے ہیں۔ پھر ایسے والدین تربیت کی زحمت کیوں برداشت کریں جبکہ خوب جانتے ہیں کہ اگر اُنکی اولاد روشن خیال ہو جائے گی تو اُسکا احساس بھی قوی ہو جائے گا اور ذہانت و ذکاوت اُسے بدبختی میں ڈالے گی۔ بنابریں ذرا بھی عجیب نہیں اگر استبداد کے وہ قیدی جن میں ادراک کا ایک شمہ بھی موجود ہے اپنی اولادیوں ہی چھوڑ دینا بہتر سمجھیں کہ بے خبری اور بے وقوفی کے سیلاب میں پڑی غوطے کھایا کرے۔

اگر ہم ایک لمحہ کے لیے غور کریں کہ عہدِ استبداد میں فقیر اپنے گھر (اگر گھر ہو) میں کس طرح پلتا اور تربیت پاتا ہے تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ ماں کے پیٹ میں عموماً ایسے وقت آتا ہے جب اُسکے والدین باہم لڑتے جھگڑتے ہوتے ہیں۔ پھر جب اُس کا پتلا بنکر پیٹ میں ہلنے لگتا ہے تو ماں کے غیظ و غضب کی تند لہریں اُسے ٹکرایا کرتی ہیں۔ وہ اُسے برابر گالیاں دیتی ہے اور اگر زیادہ کلبلاتا اور دُکھ دیتا ہے تو گھونسے بھی مارتی ہے۔ پھر جب پورا بچہ بن جاتا ہے تو وہ اُس پر جگہ تنگ کر دیتی ہے، کیونکہ وہ سستی سے جھکی رہنے کی خوگر، ذلت سے خم رہنے کی عادی، بچھونے کی تنگی کی وجہ سے سمٹے رہنے پر مجبور ہوتی ہے۔ پھر جب پیدا ہوتا ہے تو جہالت کی وجہ سے اُسکے ہاتھ پاؤں باندھ کر اُس پر بوجھ ڈالتی ہے، جب وہ کسی تکلیف سے روتا ہے تو چھاتی دیکر اُس کا منہ بند کر دیتی ہے یا جھولے میں ہچکولے دیکے چُپ کر دیتی ہے یا کوئی نشیلی دوا دے کر غافل کر دیتی ہے کیونکہ باقاعدہ علاج کا بار اُٹھا نہیں سکتی۔ دودھ چھوٹتا ہے تو اُسے خراب غذا کھلاتی ہے جو معدہ پر بوجھ ہوتی اور مزاج کو بگاڑ دیتی ہے۔ اگر سخت جان ہوا اور ان تمام تہلکوں سے بچ کر دوڑنے لگا تو کھیل کود کی ورزش سے منع کیا جاتا ہے کیونکہ گھر تنگ ہوتا ہے۔ اگر طبیعت متجسس اور تیز ہوئی تو زیادہ سوال کرنے اور ہر بات کی کرید کرنے پر ڈانٹا اور مارا جاتا ہے کیونکہ والدین درشت مزاج ہوتے ہیں۔ جب ٹانگیں اور زیادہ مضبوط ہوئیں تو دروازہ کے باہر نکال دیا جاتا ہے جہاں گندہ لڑکوں کی صحبت میں رہ کر بدزبان ہو جاتا ہے۔ اگر اب بھی نہ مرا اور برابر بڑھتا رہا تو کسی میاں جی یا کاریگر کے پاس بھیجدیا جاتا ہے

جس سے بڑی غرض یہ ہوتی ہے کہ مقید رہے اور کو دپھاند نہ کرنے پائے۔ جب شباب کو پہنچتا ہے تو والدین فوراً شادی کے کھونٹے پر باندھ دیتے ہیں کہ موت سے بدتر زندگی کی مصیبتوں میں اُن کا شریک بن جائے اور اولاد پیدا کرکے اُسی جُرم کا مرتکب ہو جسکے خود وہ ہو چکے ہیں۔ پھر وہ اپنے تئیں طرح طرح کی تنگیوں میں ڈال دیتا ہے جن میں ایک تنگی بھاری کپڑے بھی ہیں جو جسم کی آزادی سلب کر لیتے ہیں۔ دوسری طرف مستبد اُس کی عقل، زبان، عمل اور امیدیں اپنے آہنی شکنجہ میں جکڑے رہتا ہے۔ اس طرح اسیر استبداد ماں کے پیٹ سے قبر کے گڑھے تک تنگی و سختی ہی میں زندگی گذارتا ہے اور جب مرتا ہے تو دنیا و آخرت دونوں کھو کر مرتا ہے۔ نہ اُسے دنیا چھوڑنے کا زیادہ افسوس ہوتا ہے نہ کوئی اور اُسکی جدائی پر آنسو بہاتا ہے!

یہ سمجھنا غلطی ہے کہ دولتمند قیدیوں کی حالت، اِس حالت سے کچھ زیادہ اچھی ہوتی ہے۔ بلاشبہہ وہ اُن تکلیفوں سے دُور ہوتے ہیں جن میں اُن کے غریب بھائی بندگرفتار رہتے ہیں، مگر اور بہت سی مصیبتیں ہیں جن میں وہ مبتلا رہتے ہیں۔ مثلاً وہ مجبور ہیں کہ ہمیشہ آرام، خوشحالی، عزت، قوت، کی نمایش کرتے رہیں۔ ان میں سے بعض چیزیں حقیقی ہوتی ہیں اور بعض سراسر ڈھکو اور دکھاوا ہوتی ہیں اور ایسی بوجھل بیڑیاں بن جاتی ہیں کہ اُنکے سامنے غریبوں کی جملہ مصیبتیں ہیچ ہیں۔

اسیر استبداد کی زندگی اُس سوتے آدمی کی حالت سے مشابہ ہے جو خوفناک خوابوں میں پڑا لرز رہا ہو۔ اسیر استبداد کی زندگی کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ فانی جسم کی خواہشات پوری کرتا رہے اور انسانیت کی اعلیٰ خوبیوں سے ہمیشہ دُور رہے۔ اگر کائنات کی ہر چیز ایک خاص نظام کے ماتحت نہ ہوتی (حتیٰ کہ فلتات طبیعۃ اور اتفاقاتِ زمانہ بھی جو غیر معمولی اسباب کا نتیجہ ہوتے ہیں) تو ہم جزم کر لیتے کہ گرفتارانِ استبداد کی زندگی سراسر خلل اور نظام قدرت سے بالکل الگ ہے۔ لیکن دقیق تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ قیدی بھی اپنا ایک نظام رکھتے ہیں جسکے عجیب و غریب اصول اُنھیں ہلاکت سے ایک حد تک بچاتے ہیں۔ یہ اصول کسی کتاب میں مدوّن نہیں ہیں نہ شمار میں آسکتے ہیں۔ لیکن قیدی اُنھیں خوب جانتے اور شیر مادر کے ساتھ پی لیتے ہیں، اُنھیں پر تربیت پاتے ہیں اور زندگی بھر حسب ضرورت اُن میں ایجاد و اختراع کرتے رہتے ہیں۔ ان میں ان اصولوں کا سب سے بڑا عالم وہی ہے جو عملاً ان کی تطبیق میں سب سے زیادہ مشاق ہے۔ یہی لوگ حقیقتاً تنازع للبقاء

کے میدان سے فتحمند نکلتے ہیں اور باقی وہ تمام جو ان اصولوں میں کچے ہوتے ہیں فوری بربادی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ خامی کے متعدد اسباب ہوتے ہیں مثلاً یہ کہ خوشامد نہ آتی ہو، عزت نفس موجود ہو، حساس طبیعت ہو، یا جرأت و شجاعت کے جوہر بالکل فنا نہ ہوگئے ہوں۔ جن لوگوں میں یہ اوصاف موجود ہوتے ہیں وہ عہد استبداد میں بدبخت ہوتے اور جلد مارے جاتے ہیں۔

قیدی کی زندگی کے اصول کا خلاصہ یہ ہے کہ اپنے گرد و پیش کے حالات کے مطابق اپنے تئیں بھی بدلتا اور ڈھالتا جائے۔ مثلاً جور و ظلم کے سامنے ذلیل و خوار ہو جائے۔ سختی کا مقابلہ نرمی اور تابعداری سے کرے۔ جو کچھ چھینا جائے خاموشی سے حوالہ کر دے، ہمیشہ ڈھیلا رہے۔ مکر و فریب کو کام میں لاتا رہے۔ دولت کی ڈھیریاں رکھنے پر بھی غریبی کا اظہار کرتا رہے۔ سب کچھ سُنے مگر بہرا بنا رہے۔ سب کچھ دیکھے مگر اندھا معلوم ہو۔ حساس ہو مگر بے حسی کا اظہار کرے۔ علم ہو مگر تجاہل برتے۔ عقل رکھے مگر احمق بنا رہے۔ ہر خوبی مستبد سے منسوب کرے۔ ہر برائی اُس کے دشمن کے سر تھوپے۔ کبھی حق کا مطالبہ نہ کرے بلکہ جو کچھ مانگے ناک رگڑ کر مانگے۔ غرضکہ یہ اور اسی طرح کے اصول قیدیوں کے پاس ہوتے ہیں جن سے وہ اپنی حیوانی زندگی قائم رکھتے ہیں۔

قیدی سب سے زیادہ اس بات سے ڈرتے ہیں کہ اُنکے جسم و مال میں اللہ کا کوئی فضل ظاہر ہو اور کسی مخبر کی نظر اُس پر پڑ جائے (نظر لگنے کے عقیدہ کی بنیاد یہی ہے) یا علم و دولت وغیرہ کسی بڑی نعمت میں اس کی شہرت ہو جائے، اور حاسد مستبدوں سے لگائی بجھائی کر دیں (یہی اُس حسد کی بنیاد ہے جس کے شر سے پناہ مانگی جاتی ہے)۔ جب کبھی قیدی دیکھتے ہیں کہ اُنکی دولت یا کوئی اور عزیز چیز چھپ نہیں سکتی تو اُسکے بچانے میں مکر و فریب کے دوسرے حربے استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً اگر خوبصورت بیوی، قیمتی جانور، عالیشان محل کے مالک ہیں تو مشہور کر دیتے ہیں کہ وہ منحوس ہے اور تباہی کا پیش خیمہ (یہی بنیاد ہے پیر، پیشانی، اور چوکھٹ سے شگون بد لینے کی)

⁂

گذشتہ بیان سے واضح ہوگیا کہ عہد استبداد میں صحیح تربیت کی نہ طلب ہوتی ہے اور نہ وہ ممکن ہی ہو سکتی ہے۔ ہاں ایسی تربیت ممکن ہے جس میں روح رواں ظالم کے ظلم کا خوف ہو۔ لیکن اس طرح کی تربیت نفس کی ذرا بھی اصلاح نہیں کرتی۔ بلکہ دل کو اور زیادہ کمزور

کر ڈالتی ہے۔ اسی لیے جملہ علماء سیاست و اخلاق و تربیت کی رائے ہے کہ تربیت خوف سے خالی ہونا چاہیے اور یہ کہ مدارس کی کثرت جرائم کو کم کر سکتی ہے نہ کہ قید خانوں کی سختی۔ کیونکہ تحقیقات سے ثابت ہو گیا ہے کہ سختی اور سزا سے قلب کی ذرا بھی اصلاح نہیں ہوتی۔

وہ تربیت جسکی تمام قوموں کو جستجو ہے، تدریجی تربیت ہے۔ جس میں عقل کو پہلے شعور کے لیے تیار کرنا چاہیے، پھر خوش فہمی کے لیے، پھر اخذ و اقتباس کے لیے، پھر مشق و عادت کے لیے، پھر اتباع و پیروی کے لیے، پھر پابندی و تسلسل کے لیے۔ ظاہر ہے عہدِ استبداد میں اس طرح کی عام تربیت محال اور اسکی سعی حماقت ہے۔ بنابریں غلام قوموں کے عقلاء و حکماء کے لیے اگر کام کرنے کی کوئی راہ ہے تو صرف یہ ہے کہ سب سے پہلے دماغوں پر سے جمود و خمول کی سلیں ہٹائیں، عقل و حکمت پھیلائیں تاکہ قوم استبداد کی حقیقت سے واقف ہو کر اُسے ڈھا دے۔ اس کے بعد تربیت کی طرف متوجہ ہوں جو کہیں کئی نسلوں کی لگاتار محنت سے حاصل ہوگی۔

استبداد اور ترقی

کائنات کا ذرہ ذرہ حرکت میں ہے، حرکت کی دو سمتیں ہیں، ایک اوپر کی طرف جسمیں اُبھار اور اُٹھان ہوتا ہے، اور دوسری نیچے کی طرف جس میں جھکاؤ اور پستی ہوتی ہے۔ سنتِ الٰہی جس طرح مادہ اور اُسکے اعراض میں جاری ہے، اُسی طرح معنویات و کیفیات میں بھی عمل پیرا ہے۔ اسی مفہوم کو مورخین اس طرح ادا کرتے ہیں کہ: "تاریخ اپنے تئیں دوہراتی ہے" اور اسی کو حکماء نے یوں بیان کیا ہے: "موت و حیات دو طبعی واقعے ہیں"

حرکت کے لیے ضروری نہیں کہ ہمیشہ ایک ہی رخ کو رہے، بلکہ میزانِ حرارت کی طرح وہ ہر لحظہ تغیر پذیر ہے۔ لیکن حکم، غالب پہلو دیکھ کر لگایا جاتا ہے، چنانچہ اگر کسی قوم کے افراد میں ترقی کی حرکت غالب نظر آئے تو کہا جائے گا یہ قوم زندہ ہے اگر اسکے برعکس اُسکا رجحان پستی کی طرف ہے تو فیصلہ کیا جائے گا کہ یہ قوم مر رہی ہے۔ اور یہ اس لیے کہ قوم، افراد کے مجموعہ کا نام ہے جنھیں نسل، وطن، زبان، مذہب کے رشتے ٹھیک اس طرح جوڑتے اور باہم پیوست کرتے ہیں جس طرح عمارت ایک ایک اینٹ کے چُناؤ اور ملاؤ سے وجود میں آتی ہے۔ بنابریں قوم کے ادنیٰ سے ادنیٰ فرد کی بلندی و پستی بھی افراد کے پورے مجموعہ یعنی قوم پر اسی طرح

موثر ہوتی ہے جس طرح ایک حقیر مچھر عظیم الشان جہاز کے کسی پہلو پر بیٹھ کر اُسے کچھ نہ کچھ ضرور جھکا دیتا ہے، اگرچہ آنکھ اُس جھکاؤ کو محسوس نہ کرسکے۔

حقیقی ترقی جسکی طلب انسان کی سرشت میں ہے، سب سے پہلے جسم کی ترقی ہے جو تندرستی اور مادی تمتع کا ذریعہ ہے۔ پھر خاندان اور قبیلہ کی ترقی ہے۔ پھر علم و مال کی ترقی ہے، پھر اخلاق و عادات و مَلکات کی ترقی ہے۔

ان تمام ترقیوں کے پرے ایک اور ترقی ہے جسکا تعلق روح سے ہے۔ ہر انسان اپنے اندر صریح یا مبہم احساس رکھتا ہے کہ اس زندگی کے بعد ایک اور زندگی ہے جس میں روح مکارمِ اخلاق اور اعمال صالحہ کی سیڑھی سے ترقی کے اعلیٰ مدارج طے کرے گی۔ مذہبی لوگ قیامت یا تناسخ کے قائل ہیں، ثواب کی اُمید کرتے ہیں، عذاب سے ڈرتے ہیں۔ اسی طرح لامذہب اور ملحد بھی اگر عملی جزا و سزا کے نہیں تو تاریخی زندگی کے ضرور قائل ہیں۔ اُنکی بھی یہی تمنا ہوتی ہے کہ مرنے پر اچھے الفاظ سے یاد کیے جائیں۔

ان تمام ترقیوں کے لیے انسان ہمیشہ سے کوشاں ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اگر کسی شخص کا چلن اسکے خلاف پاؤ تو سمجھ لو کہ کوئی ایسا ہی قوی مانع درمیان میں پیش آگیا ہے جس نے ارادہ و اختیار سلب کرکے اُسے ترقی کے جذبہ سے خالی کردیا ہے۔ یہ مانع کبھی قدرتی ہوتا ہے اور کبھی منحوس استبداد راہ روک کے کھڑا ہو جاتا ہے۔ لیکن قدرت ایک تھوڑے زمانہ سے زائد ترقی نہیں روکتی۔ برخلاف اسکے استبداد کی روک سخت اور دائمی ہوتی ہے۔ وہ صرف یہی نہیں کرتا کہ ترقی روکتا ہے بلکہ اُسے شرمناک تنزل سے بدل دیتا ہے، وہ اوپر کے بجائے انسان کو نیچے کھینچتا ہے، بار آور کرنے کے بجائے روندتا اور اپنے جہنمی تنور کا ایندھن بناتا ہے۔ وہ زہریلی جونک کی طرح قوم کو چمٹ جاتا ہے اور برابر اُسکا خون چوستا اور اُسکی رگوں میں اپنا زہر داخل کرتا جاتا ہے یہاں تک کہ ہوتے ہوتے وہ انسانیت کی سطح سے گر کر حیوانیت کے عالم میں پہونچ جاتی ہے۔ جسکے بعد اُسے اپنی حیوانی زندگی کے سوا کسی بات کی بھی پرواہ نہیں رہتی، بلکہ یہ حقیر زندگی بھی فارغ البالی اور اطمینان سے نہیں کٹتی اور استبداد کے مسلسل خفیہ و علانیہ حملوں کا نشانہ بنی رہتی ہے۔

کبھی کبھی استبداد کا سمِّ قاتل قوم پر اس قدر اثر کرجاتا ہے کہ اُسکے اندر ترقی کا قدرتی میلان بھی پستی کے شغف سے بدل جاتا ہے۔ چنانچہ اگر وہ بلندی کی طرف زبردستی بھی

بڑھائی جاتی ہے تو اَڑتی اور آگے بڑھنے سے صاف انکار کردیتی ہے - وہ ملبذی کی روشنی سے اُسی طرح بھاگتی اور مُنہ اُٹھاتی ہے جس طرح شپرہ روشنی سے بھاگتا ہے - اگر اُسے زبردستی آزاد کردیا جاتا ہے تو بجائے مسرت وسعادت کے شقاوت و بدبختی میں پڑجاتی ہے - بلکہ کبھی تو آزادی کے بعد اُسی طرح فنا ہوجاتی ہے جس طرح بھیڑ بکری یا جانور کھلے چھوڑ دینے سے ہلاک ہوجاتے ہیں - یہ کبھی نہیں ہوتا کہ استبداد، قوم کا خون چوس کر اور موٹا ہوکر اُسکا پیچھا چھوڑدے - بلکہ ایک دفعہ نازل ہوجانے کے بعد ہمیشہ سایہ کی طرح اُسکے ساتھ لگا رہتا اور گھن کی طرح اُسے کھوکھلا کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ مرجائے - اور اُس کی موت کے ساتھ خود بھی مرجائے -

انسانی حالات میں ترقی و تنزل کی حرکت کبھی یوں بیان کی جاتی ہے کہ وہ ایک دَوری حرکت ہے جو اندفاع و انقباض سے جاری رہتی ہے - اور یہ اس طرح کہ انسان پیدا ہوتا ہے اور جملہ حیوانوں سے زیادہ حرکت و ادراک سے مجبور ہوتا ہے، مگر بتدریج ترقی شروع کرتا ہے، نفسی و عقلی محرکات اُسے آگے ڈھکیلتے ہیں -

انسان کا قدم اُسوقت تک برابر آگے بڑھے جاتا ہے جب تک اندفاع و انقباض کی کیفیتوں میں بجلی کی ایجابی و سلبی لہروں کی طرح توازن قائم ہے - لیکن جوں ہی قدرت (نیچر) یا مزاحمت کا اُس پر غلبہ ہوجاتا ہے فوراً اُس کا قدم پیچھے لوٹنے لگتا ہے - حالت اندفاع و ارتفاع میں اگر عقل، نفس پر غالب ہوتی ہے تو رفتار کا رُخ حکمت کی طرف ہوتا ہے اور اگر نفس، عقل کو زیر کرلیتا ہے تو رُخ گمراہی کی طرف ہوجاتا ہے - رہا انقباض تو معتدل انقباض مفید اور موجب عمل ہے - البتہ شدید انقباض مہلک اور حرکت کا روک دینے والا ہوتا ہے - منحوس استبداد، جو شومیِ قسمت سے اِسوقت ہمارا موضوع بحث ہے، اسی طرح کا انقباض پیدا کردیتا ہے بلکہ وہ بیک وقت قابض و ضاغط و مسکن ہے اور اُس کے مارے ہوئے سخت بدنصیب ہوتے ہیں -

استبداد کے قیدی، خصوصاً جو اُن میں مفلس ہیں، سب کے سب بدنصیب ہیں - ان میں کوئی حرکت نہیں ہوتی - وہ اپنے ادراک میں پست ہوتے ہیں، اپنے احساس میں پست ہوتے ہیں، اپنے اخلاق میں پست ہوتے ہیں کسی نے انھیں پتھر کے کیڑے سے کیا ہی خوب تشبیہ دی ہے - لیکن ملامت کے بجائے اُن پر ترس کھانا اور پتھر کی اِس چٹان (استبداد) کو توڑنا چاہیے، اگرچہ ناخنوں سے کھرچ کرہی کیوں نہ ہو -

بالاتفاق تمام حکماء نے کہا ہے کہ اگر غلام اقوام کے رہنماؤں اور سرداروں میں مردانگی کا ذرا بھی جوہر موجود ہے، حمیت کی ایک چنگاری بھی زندہ ہے، انسانی فرائض کا ادنے احساس بھی باقی ہے، تو اُن کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ عقلوں پر سے جہالت کی سلیں اُتارنے کی کوشش کریں تاکہ علم و دانش کی کرن پھوٹے، نشو و نما کی راہ کھلے، اور خرافات و توہمات کے سیاہ بادل چھٹ جائیں جو بزدلی و کم ہمتی کا نامبارک مینہ برساتے ہیں۔

وہ استبداد جو گراتے گراتے قوم کو قبر تک پہونچا دے اور خود بھی اُسکے ساتھ دفن ہو جائے، سو اُس کی مثالیں گذشتہ اور موجودہ زمانوں میں بہت ملتی ہیں۔ لیکن وہ ترقی جسکی تمنا شروع سے انسانیت کو ہے اور جو قدرت نے اُسکے لیے مقدر کر دی ہے، سو اُس کی اب تک کوئی مثال نہیں گذری۔ کوئی قوم ایسی نہیں ہوئی جس نے اپنی عام رائے کے ذریعہ اپنے اوپر حکومت کی ہو اور استبداد کا شائبہ تک نہ آنے دیا ہو۔ گویا حکمت الٰہی اب تک انسان کو اس کا اہل نہیں پاتی کہ اُس کے افراد اور جماعتیں محبت و مساوات کے ساتھ زندگی بسر کریں اور اس طرح عالمگیر اخوت اور برادری کی برکتیں حاصل کر سکیں۔

میں یہاں اُس انتہائی ترقی کی طرف اشارہ کرتا ہوں جس تک قومیں پہونچ چکی ہیں۔ ممکن ہے تو موں کی تاریخ سے ناواقف ناظرین اور استبداد زدہ ملکوں کے باشندے میرا بیان نہ سمجھ سکیں اور شبہہ کریں جس پر میں اُنھیں ہرگز ملامت نہ کروں گا، کیونکہ وہ معذور ہیں۔ اُنکی مثال مادرزاد اندھے کی ہے جو نظر فریب مناظر کے لطف کا تصور ہی نہیں کر سکتا۔

منصف حکومتوں کے زیر سایہ شخصی آزادی و خود مختاری کو اتنی ترقی ہوئی ہے کہ انسان اسی دنیا میں وہ زندگی بسر کرنے لگا ہے جو متعدد وجوہ سے اُس زندگی کے مشابہ ہے جس کا مذہب نے جنتیوں سے اُس دنیا میں وعدہ کیا ہے۔ بلکہ درحقیقت آزاد ملکوں میں ہر شخص اس طرح زندگی بسر کرتا ہے گویا ہمیشہ جیے گا اور اپنی قوم و وطن سے کبھی بھی جدا نہ ہوگا۔ وہ سدا خوش و خرم اور اپنی تمام آرزوؤں اور خواہشوں پر مطمئن رہتا ہے:

(۱) وہ اپنے جسم و روح کی سلامتی پر مطمئن ہوتا ہے کیونکہ حکومت اُس کی محافظ ہے اور سفر و حضر کسی حال میں بھی اُس کی حفاظت سے غافل نہیں۔

(۲) وہ جسمانی و روحانی مسرتوں کے دوام پر مطمئن ہوتا ہے کیونکہ حکومت اُسکی جسمانی ذہنی عقلی ضروریات کی کفیل ہوتی ہے۔ بلکہ اُسکا احساس یہ ہو جاتا ہے کہ یہ صاف ستھری

سڑکیں، شہری آرائشیں، تفریح گاہیں، باغ، کلب، مدرسے، غرض کہ جو کچھ ہے خاص اُسی کے لیے بنایا گیا ہے۔

(۳) وہ اپنی آزادی پر اس طرح مطمئن ہوتا ہے گویا زمین پر تنہا وہی پیدا ہوا ہے، نہ اُسکا کوئی حریف ہے نہ اُس کے شخصی معاملات، خیالات، مذہب میں کوئی دخیل۔

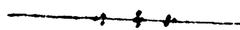
(۴) وہ اپنی قوت پر مطمئن ہوتا ہے گویا ایک زبردست پادشاہ جسکا کوئی مخالف نہیں، وہ اپنی قوم میں اپنے مفید مقاصد کی بے روک ٹوک اشاعت کرتا ہے۔

(۵) وہ اپنی شخصیت پر مطمئن ہوتا ہے، گویا ایک ایسی قوم کا فرد ہے جسکے تمام افراد درجہ میں بالکل برابر ہیں، نہ اُسے کسی پر ترجیح ہے نہ اُس پر کسی کو امتیاز ہے۔ ہاں اگر کوئی امتیاز ہے تو صرف اخلاق اور حسنِ عمل کا ہے۔

(۶) وہ انصاف کی طرف سے مطمئن ہوتا ہے گویا حقوق کی ترازو خود اُسکے اپنے ہاتھ میں ہے جس سے سب کو مساوی تولتا ہے۔ اُسے کسی زیادتی کا ڈر نہیں، کسی حق تلفی کا اندیشہ نہیں حتیٰ کہ اُسے یقین ہوتا ہے کہ اگر اُس میں پادشاہت کی قابلیت ہے تو پادشاہ ہو سکتا ہے، ساتھ ہی اگر جرم کا مرتکب ہوگا تو لا محالہ سزا بھی پائے گا۔

(۷) وہ اپنے مال و متاع کی طرف سے بالکل مطمئن ہوتا ہے، گویا جو کچھ اُس نے جائز طریقہ سے حاصل کیا ہے، زیادہ ہو یا کم، خدا نے صرف اُسی کے لیے اُتارا ہے اور کوئی چھین نہیں سکتا۔ نیز جانتا ہے کہ اگر دوسرے کے مال کی طرف نظر اُٹھائیگا تو اسکی بھی آنکھ نکال لی جائے گی۔

(۸) وہ اپنی آبرو پر بالکل مطمئن ہوتا ہے کیونکہ جانتا ہے قانون اُس کا ضامن ہے، قوم کی پشت پناہی اُسے حاصل ہے جو اُسکی ادنیٰ آبروریزی پر بھی خون بہا دے گی۔ لہذا اُسکا سر خودداری سے ہمیشہ بلند رہتا ہے اور ذلت و خواری سے جھکنا نہیں چاہتا۔



کبھی خاندان اور قبیلہ کی ساخت ترقی کرتے کرتے یہاں تک ہونچ جاتی ہے کہ اُسکا ہر فرد اپنے تئیں قومی جسم کا ایک زندہ اور ضروری عضو سمجھنے لگتا ہے۔ متمدن قوموں کے نزدیک قوم ایک زندہ جسم ہے اور افراد و خاندان اُسکے اعضا ہیں، یا وہ ایک شہر ہے اور افراد اور خاندانوں پر اُسی طرح منقسم ہے جس طرح شہر محلّوں اور گھروں پر بٹا ہوتا ہے۔

جس طرح ہر عمارت سے کوئی غرض ہونا چاہیے ورنہ بیکار ہے اور اُسکا ڈھادینا ضروری، اسی طرح قوم کے ہر فرد کی زندگی کا بھی کوئی مقصد ہونا چاہیے - ہر شخص پہ لازم ہے کہ قومی زندگی کی ترقی و بقا کے لیے اپنے تئیں کسی نہ کسی فرض کے لیے طیار رکھے - کیونکہ جو کسی کام کی بھی قابلیت نہیں رکھتا یا کوئی کام نہیں کرتا بلکہ بلا کسی واقعی مجبوری کے دوسروں کے سر بار ہوتا ہے، تو وہ نہایت حقیر اور موت کا مستحق ہے نہ کہ رحم و ہمدردی کا، کیونکہ وہ جسم کے میل کچیل اور مردہ ناخن کی طرح ہے جس کا دُور کرنا ضروری ہے -

اسی بنا پر آسمانی شریعتوں نے غیر مفید اور غیر ورزشی لہو و لعب، کام میں حارج نشہ، قمار بازی، سود خواری، وغیرہ چیزیں حرام کردی ہیں کیونکہ مفید ہونے کے بجائے سخت مُضر ہیں - اسی ضرورت و نفع کا لحاظ کرکے بعض لوگوں نے مہتر کو جراح پر ترجیح دی ہے کیونکہ پبلک کے لیے اُسکا پیشہ اسکے پیشہ سے زیادہ مفید ہے - اسی طرح نانبائی کو "شاعر" سے بہتر قرار دیا ہے کیونکہ زیادہ نفع بخش ہے -

آزاد انسان اپنی ذات کا بلا شرکتِ غیرے مالک اور اپنی قوم کا وفادار غلام ہوتا ہے - جب کسی قوم کی ترکیبی ترقی اس درجہ تک پہونچ جاتی ہے کہ اُسکا ہر فرد اپنی جان مال قوم پر قربان کردینے کے لیے ہر وقت کمربستہ رہتا ہے تو اُسوقت سے قوم اپنے فرزندوں کی جانی و مالی قربانیوں سے مستغنی ہو جاتی ہے -

---

علم و دولت کی ترقی، باقی تمام ترقیوں سے اُسی طرح ممتاز ہے جس طرح سر، باقی اعضا سے - پھر جس طرح سر، عقل اور اکثر حواس کا مرکز ہونے کی وجہ سے، تمام اعضا پر حکومت کرتا ہے، اسی طرح منتظم حکومتیں اپنے افراد اور جماعتوں کی علمی و مالی ترقی کے بل بوتے پر قدرۃً اُن افراد و اقوام پر مسلط ہو جاتی ہیں جنھیں منحوس استبداد جہالت و غربت کے تاریک غار میں گرا چکا ہے -

---

رہی اخلاقی اور روحانی ترقی کی بحث، تو یہ ایک بہت طویل بحث ہے اور اس رسالہ کی وسعت سے باہر ہے - اُسکے سرچشمے آسمانی صحیفوں، اخلاقی کتابوں اور مشاہیر عالم کی سوانحعمریوں میں موجود ہیں -

تاہم یہاں اتنا اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ ترقی کے میدان میں بھی آزاد انسان یہاں تک پہونچ گیا ہے کہ اپنی شخصی زندگی کی اُسے کئی درجہ بعد پرواہ ہوتی ہے۔ اُسکی نظر میں سب سے زیادہ اہم اُسکی قومی زندگی ہوتی ہے، پھر اپنی آزادی، پھر اپنی عزت، پھر اپنا خاندان.... اور کبھی تو اُسکے احساسات تمام عالم انسانیت کو محیط ہو جاتے ہیں اور وہ سمجھنے لگتا ہے کہ تمام نوع انسانی اُس کی قوم ہے اور تمام دنیا اُس کا وطن۔ نیز کبھی اخلاقی و روحانی ترقی انسان کو یہاں تک لے جاتی ہے کہ وہ حکومت و سیادت کو ہاتھ لگانا بھی برا سمجھنے لگتا ہے، کیونکہ اس میں گونہ تکبر ہے۔ اور تجارت سے پرہیز کرتا ہے کیونکہ اس میں قدرے فریب اور خوشامد سے کام لینا پڑتا ہے۔ وہ اگر کوئی پیشہ پسند کرتا ہے تو بے لوث قلم کا یا ہل کا یا ہتوڑہ کا۔

مختصر یہ کہ قسمت نے جن قوموں کو استبداد سے آزاد ہو جانے کا موقعہ دیا ہے وہ مادی و معنوی شرافت و عزت کے اتنے خزانے اپنے پاس رکھتی ہین کہ استبداد کے قیدی خواب میں بھی اُن کا تصور نہیں کر سکتے۔

اسیران استبداد اُن مسرتوں کا تصور کیونکر کر سکتے ہیں جن سے یہ ترقی یافتہ قومیں بہرہ اندوز ہو رہی ہیں جبکہ وہ اُن کے احاطۂ ادراک سے بالکل باہر ہیں؟ بھلا یہ قیدی کیا جانیں کہ علم و تربیت کی لذت کیسی ہوتی ہے؟ شرافت کا نشہ کیسا ہے؟ دولت و سخاوت کی خوشی کیا ہے؟ دنیا میں نیکنامی کی مسرت کیا ہے؟ صحیح خیالات اور اُنکے رواج کی لذت کیسی ہے؟ اِن غلاموں اور چوپایہ صفت آدمیوں کی جملہ مسرتیں اور لذتیں صرف اس میں ہیں کہ بہیانہ زندگی بسر کریں، اپنے پیٹ کو حیوانات کا مقبرہ یا نباتات کا گھورہ بنائیں، اور بڑے اپنی شہوت اُگلا کریں گویا وہ ایک پھوڑا ہیں جو زمین کی پیٹھ پر صرف اس لیے نکلا ہے کہ پیپ بہایا کرے!

انسان کی سب سے زیادہ مفید ترقی یہ ہے کہ: اُس نے حکومت منظم کردی ہے، استبداد کے سامنے ایک آہنی دیوار کھڑی کردی ہے، جملہ طاقتوں پر قانون کی طاقت رکھی ہے، قانون سازی کا مجاز صرف قوم کو قرار دیا ہے۔ عدالتوں کا درجہ اتنا بڑھا دیا ہے کہ امیر غریب سب پر یکساں حکم چلاتیں اور اپنے بے لاگ انصاف میں سب سے بڑی الٰہی عدالت کا نمونہ پیش کرتی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ متمدن ملکوں میں عمال حکومت، جو بیاپاک خدمت پر مامور ہیں، اس طرح جکڑ دیے گئے ہیں کہ اپنے فرائض کے دائرہ سے ذرا قدم باہر نہیں نکال سکتے، گویا فرشتے ہیں جو کسی حکم کی بھی نافرمانی نہیں کرتے۔ پھر خود قوم اتنی بیدار ہو گئی ہے کہ اپنی حکومت کی پوری نگرانی کرتی ہے، ایک

لحظہ بھی اس سے غافل نہیں ہوتی اور معمولی سے معمولی غلطی پر بھی اس سے سخت باز پُرس کرتی ہے۔

آزاد قوموں نے جب اپنی حالت اس درجہ مکمل اور ٹھوس کر لی، تو خدا نے بھی اُنھیں استبداد اور اس کی بربادیوں سے نجات دیدی۔ کیونکہ وہ ذات برتر کبھی ایسے لوگوں کو ظلم سے ہلاک نہیں کرتی جو اپنی اصلاح کرتے ہیں!

استبداد سے نجات

استبداد سے کیونکر نجات حاصل کی جا سکتی ہے؟ اسکا جواب ہمیں تاریخ سے بہتر اور کوئی نہیں دے سکتا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ایک مدت تک انسان اپنی فطری حالت میں جھتے اور ٹولیاں بنا کر زندگی بسر کرتا رہا جن کی باگ تجربہ کار شیوخ کے ہاتھ میں تھی اور خطرے کے موقعوں پر زیادہ زور آور قیادت کرتے تھے۔ پھر ایک زمانہ تک قبایلہ اور خاندان کی صورت میں بدویانہ زندگی بسر کرتا رہا۔ اس دَور میں حکومت ایک امیر کے ماتحت سرداروں اور شیخوں کے ہاتھ میں ہوتی تھی جن کی رائے پر امیر چلتا تھا اور بہت کم اپنی ذاتی رائے نافذ کر سکتا تھا۔ نظامِ حکومت بالکل سادہ تھا۔ تعزیری قوانین گنتی کے تھے جو ضمیر کی رہنمائی اور بزرگوں کی روایات کی بنیاد پر عمل میں آتے تھے۔ اب تک انسانوں کی نصف آبادی انھیں دونوں ابتدائی حالتوں پر قائم ہیں۔

باقی نصف آبادی جس نے تمدن و معیشت میں وسعت حاصل کی، قصبوں اور شہروں کی چار دیواریوں کے اندر مقید ہو گئی ہے۔ بلا شبہہ ان انسانوں نے بہت کچھ ترقی کر لی ہے، مگر اتبک ذلت و بدبختی سے نجات نہیں پا سکے ہیں کیونکہ انکی اکثریت یا تو غلام ہے یا اپنی اجتماعی زندگی بسر کرنے کے لیے بہترین اصول دریافت کرنے سے قاصر رہی ہے۔ یہی سبب ہے کہ مختلف ملکوں اور قوموں میں حکومت کی شکلیں مختلف ہیں اور کوئی ایک قوم بھی کسی عام پسند طرزِ حکومت پر کاربند نہیں ہوئی ہے۔ جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے محض تجربے ہیں یا اصلاحی و استبدادی جماعتوں کے باہمی تصادم کے نتیجے۔

حکومت کی شکل کیا ہونا چاہیے؟ یہ ایک مشکل ترین مسئلہ ہے جو نہایت قدیم زمانہ سے انسان کے بیشتر نظرا اور عقلاء کے بحث و فکر کا جولاں گاہ بنا رہا ہے۔ بلکہ بہت کم لوگ ہیں جنھوں نے اِس

لق و دق میدان میں تگ و دو کی کوشش نہیں کی: کسی نے فکر کے اڑیل ہاتھی پر بیٹھ کر، کسی نے جہالت کے منتھے اونٹ پر، کسی نے عقل کے منہ زور گھوڑے پر، اور کسی نے حماقت کے لیچڑ گدھے پر۔ یہاں تک کہ یہ آخری زمانہ آیا جس میں مغربی انسان نے اس پُرخطر میدان میں ایک حد تک فتحمندانہ قدم رکھا، جھاڑیاں کاٹیں، نالے پاٹے، نشیب و فراز برابر کیے، بنیادی اصولوں کی شکل میں چند شاہراہیں طیار کیں، عقل و دانش کی لالٹینیں اُن پر نصب کیں۔ تجارب کے ستون کھڑے کیے، اور بار بار کی آمد و رفت کے بعد اب ترقی یافتہ قوموں نے اِن رستوں کو اجتماعی شاہراہیں تسلیم کر لیا ہے اور اُن پر چل پڑی ہیں۔ لیکن باوجود اسکے ابتک ان میں اختلاف موجود ہے جو اصول میں نہیں بلکہ ان بنیادی قواعد کے فروع و جزئیات اور خاص خاص حالات پر اُن کے منطبق کرنے میں ہے۔ یہ اصول و قواعد اگرچہ مغرب میں بدیہی قضایا شمار کیے جاتے ہیں مگر شرق میں ابتک بالکل مجہول یا عجیب سمجھے جا رہے ہیں، کیونکہ یہاں اکثر لوگوں کے کان اُن سے ناآشنا ہیں۔ بعض اُنکی پرواہ ہی نہیں کرتے، اور بعض اُنھیں پسند نہیں کرتے کیونکہ خودغرض ہیں یا دل چور ی گئے ہیں یا ذلوں میں ہماری ہر ناظرین کے غور و فکر کے لیے میں بعض اُن مباحث کے موٹے موٹے مسائل پیش کرتا ہوں جن کا تعلق سیاسی زندگی سے ہے۔ لیکن اس سے پہلے انھیں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ استبداد کی تعریف میں گذر چکا ہے کہ مستبد حکومت وہ حکومت ہے جسکے اور قوم کے مابین کوئی معین، معلوم اور نافذ قانونی رشتہ نہیں ہوتا کہ جس کی عدم موجودگی میں حکومت بے لگام اور قطعی ناقابل اعتماد ہوتی ہے اگرچہ کتنے ہی وعدے کرے اور کیسی ہی چکنی چپڑی باتیں بنائے، کیونکہ جیسا بیان ہو چکا، حاکم کی قسم اور عہد سے ہرگز باور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ مذہب، تقوی، حق، انسانیت، انصاف اور قومی مفاد کے لوازمات کا خیال رکھے گا، بلکہ ایک منضبط اور زبردست قانون کی عدم موجودگی میں اُسکی یہ تمام باتیں بادہوائی ہیں جنھیں ہر نیک و بد کہہ سکتا ہے۔ قوت کا خاصہ ہی ظلم ہے اور قوت کا مقابلہ قوت ہی سے کیا جا سکتا ہے: محض زبانی جمع خرچ سے۔ جو مباحث میں پیش کرنا چاہتا ہوں حسب ذیل ہیں:

(۱) قوم کیا ہے: آیا وہ بڑھنے اور تناور ہونے والا درخت ہے یا کسی بے رحم آقا کے غلاموں کا گلہ؟ وہ کوئی ایسی جماعت ہے جسکے افراد کے مابین نسل، زبان، وطن، اور مشترک حقوق کے مستحکم رشتے موجود ہیں، یا پراگندہ آدمیوں کی ایک بھیڑ ہے اور صرف اس لیے جمع

ہوگئی ہے کہ مستبد کی خوراک بنے ؟

(۲) حکومت کیا ہے : آیا وہ شخص واحد یا چند اشخاص کا نام ہے جو حق رکھتے ہیں کہ انسانوں کی جان و مال اور آبرو پر جس طرح چاہیں دست درازی کریں، یا وہ ایک سیاسی نیابت ہے جسے قوم اس لیے قائم کرتی ہے کہ اُسکے عام معاملات انجام دے ؟

(۳) قومی املاک : مثلاً زمین، کانیں، دریا، ساحل، قلعے، عبادت خانے، جنگی بیڑے، سامان جنگ ، یہ چیزیں حکومت کی ملک ہیں یا وہ اُن پر بحیثیت قومی امین اور محافظ کے قابض ہے ؟ نیز خارجی حقوق و امتیازات، اوقاف، اجتماعی حالت کی ترقی اور رفاہ عام کے سامانوں سے متمتع ہونے کا حق کسے ہے ؟ صرف حکومت کو یا قوم کے جملہ افراد کو ؟

(۴) کیا حکومت کو حق حاصل ہے کہ مادی و معنوی حقوق عامہ میں جس طرح چاہے تصرف کرے، یا یہ حقوق پوری قوم اور اُس کے تمام افراد کے ہیں جن سے وہ سب یکساں فائدہ اُٹھا سکتے ہیں ؟

(۵) کیا حکومت کو افراد کی نجی کی زندگی میں مداخلت اور اُنکے خانگی کاموں اور ذاتی خیالات پر گرفت کا حق حاصل ہے، یا قوم کے تمام افراد اپنے نجی کے مشاغل و خیالات میں اُس وقت تک بالکل آزاد ہیں جب تک عام اجتماعی قوانین کی مخالفت نہیں ہوتی کیونکہ افراد اپنا شخصی مفاد زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔

(۶) حکومت کس قسم کی ہونا چاہیے ؟ مطلق العنان شاہی زیادہ مفید ہے یا مقید شاہی ؟ قیود کیا ہیں ؟ اگر شاہی نہیں تو عمر بھر کی انتخابی حکومت بہتر ہے یا موقت ؟ پھر اس انتخابی حکومت کا قیام کیونکر ہوگا : وراثت سے ؟ نامزدگی سے ؟ طاقت کے زور سے ؟ اتفاقات زمانہ اس کا فیصلہ کریں گے یا اہلیت و قابلیت کے شروط پر اسکی بنیاد ہوگی ؟ یہ شروط کیا ہیں ؟ اس قسم کی حکومت کیونکر بنائی جا سکتی ہے اور اسکی بقا کے لیے کون تدابیر ضروری ہیں

(۷) حکومت کے اختیارات کیا ہیں ؟ کیا اُسے یہ اختیار حاصل ہے کہ قومی معاملات اپنی رائے و اجتہاد سے انجام دے یا وہ کسی ایسے قانون سے مقید ہے جو بہترین نہ سہی مگر قوم کی عام رائے کے ہاتھوں بنا ہے ؟ پھر "مفید و مضر" "اچھے اور بُرے" کا فیصلہ کس کے ہاتھ میں ہے : حکومت کے یا قوم کے ؟ اگر دونوں میں اختلاف ہو جائے تو حکومت برخاست ہونے پر مجبور ہوگی یا نہیں ؟

(۸) کیا حکومت کو حق ہے کہ اپنے لیے عظمت و دولت کے جتنے مرتبے چاہے مقرر کرلے، جسے چاہے دے اور جسے چاہے محروم کردے، جسکی طرف دار ہو اُسے مالا مال کردے اور جس سے ناخوش ہو اُسے بھیک منگوا دے، یا اس طرح کے تمام اختیارات قوم کے ہاتھ میں ہیں؟

(۹) کیا حکومت کو یہ منصب حاصل ہے کہ قوم کو بلا قید و شرط اپنی اطاعت پر مجبور کرے، یا برعکس اسکے نصیحت و ارشاد اور تعلیم و تربیت سے کام لینا اُس پر فرض ہے تاکہ اطاعت، اخلاص و اختیار کے ساتھ ہو، نہ نفاق و خوف کے ساتھ؟

(۱۰) مالیات، محصول اور لگان مقرر کرنا حکومت کی رائے پر موقوف ہے، یا قوم کو اختیار ہے کہ حکومت کے لیے ضروری مصارف مقرر کرے، آمدنی کے طریقے متعین کرے، اور اُسکے جمع و حفاظت کی تدبیریں سوچے؟

(۱۱) ملکی حفاظت و دفاع کے لیے جنگی طاقت، اُسکی کمی بیشی، اُس کا استعمال، یہ چیزیں حکومت کی مرضی پر موقوف ہیں یا سراسر قوم کے اختیارات میں سے ہیں؟ حکومت کے ہاتھ میں فوجی قوت اس لیے ہوتی ہے کہ قوم کی مرضی و فیصلہ کو نافذ کرے یا اس لیے کہ اُلٹے اُسی کا گلا دبائے؟

(۱۲) کیا حکومت بے مہار چھوڑ دی جائے گی کہ بے دھڑک جو چاہے کرے، یا قوم کو اُسکی نگرانی کا حق حاصل ہے؟

(۱۳) کیا ہر فرد اپنی جان و مال کی حفاظت کا خود ذمہ دار ہے، یا سفر و حضر ہر حال میں اُسکی حفاظت حکومت کے ذمہ ہے؟

(۱۴) کیا حکومت کو یہ حق حاصل ہے کہ افراد کو اپنی رائے سے جس کام پر چاہے مجبور کردے یا اس طرح کا اختیار صرف اُس قانون کو حاصل ہے جسے قوم کی عام رائے نے بنایا ہے؟

(۱۵) انصاف کے کیا معنی ہیں؟ انصاف وہ ہے جو حکومت کی نظر میں انصاف ہے، یا وہ اُن ججوں کا فیصلہ ہے جنکا ضمیر، قانون اور حق کے سوا ہر دباؤ، حتیٰ کہ عام رائے کے دباؤ سے بھی آزاد رہے؟

(۱۶) کیا حکومت کو لوگوں کے ضمیر و عقائد کی جانچ پڑتال کا بھی اختیار ہے، یا اُسکا فرض صرف اس قدر ہے کہ قوم کو باہم جوڑنے والے رشتوں، مثلاً مذہب، قومیت، زبان، رسم و رواج، کی حتی الوسع بغیر طاقت استعمال کیے دانائی و نرمی سے حفاظت کرے، مذہب

کے معاملہ میں ہرگز دخل نہ دے اور قوم کو آزاد چھوڑ دے کہ جو عقائد چاہے رکھے۔

(۱۷) کیا تمام عمالِ حکومت: بادشاہ سے لیکر شحنہ تک سب کا ہاتھ چھوٹا ہونا چاہیے کہ اپنی عقل و تجربہ سے جو چاہیں کریں، یا ضروری ہے کہ حکومت اور اُسکے عہدہ داروں کے جملہ فرائض، واضح قوانین کے ذریعہ مقرر کر دیے جائیں اور بجز سخت خطرناک موقعوں کے کسی حال میں بھی اُن سے تجاوز جائز نہ رکھا جائے؟

(۱۸) قانون سازی کا حق کِسے حاصل ہے؟ بادشاہ اور اُسکے درباریوں کو یا خود قوم کو جو اپنی ضرورت و مصلحت، نفع نقصان خوب سمجھتی ہے؟

(۱۹) قانون سے کیا مراد ہے؟ آیا قانون وہ احکام ہیں جن کے ذریعہ زبردست کمزوروں پر دست درازی کرتا ہے، یا وہ اُن احکام کا نام ہے جنکے سامنے سب برابر ہیں، جنھیں ایسی زبردست قوتِ نافذہ حاصل ہے کہ کوئی خود غرضی، جانبداری، سفارش، انکی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی، وہ سب کی نظر میں محترم ہوتے ہیں، قوم کا ایک ایک فرد اُنکی حفاظت وحمایت میں سربکف رہتا ہے؟

(۲۰) سرکاری عہدے صرف حاکم کے عزیزوں، دوستوں اور مصاحبوں کے لیے مخصوص ہیں؟ یا ان میں پوری قوم کا حق ہے کہ جسکے زیادہ لائق و مستعد افراد اُن پر متعین ہونا چاہیے؟

(۲۱) مذہبی، سیاسی، علمی، تینوں منصب ایک ہی شخص کے حوالہ کر دینا چاہیے تاکہ مذہب، سیاست اور علم کی مجتمع طاقتوں سے مسلح ہوکر، وہ ناقابلِ مقابلہ بنجائے یا یہ تینوں عہدے الگ الگ اشخاص کے سپرد ہونا چاہییں تاکہ سوسائٹی میں توازن قائم رہے اور استبداد سر نہ اُٹھانے پائے؟

(۲۲) کیا حکومت کو حق ہے کہ قوم کو جاہل رکھے تاکہ اُسکی گرفت سے بچی رہے، یا تعلیم و تربیت عام کرنے پر وہ مجبور ہے؟

(۲۳) صنعت و حرفت، زراعت اور تجارت کی ترقی کا کام قوم کی خوشی پر چھوڑ دیا جائے گا کہ جو کچھ کر سکتی ہے کرے، یا حکومت مجبور کی جائے گی کہ قوم کو ترغیب دے کام کی راہ میں سہولتیں بہم پہنچائے، دنیا کے بازار اُسکے لیے کھولے، تجارتی مقابلہ میں اُس کی کامیابی کے ذرائع مہیا کرے تاکہ وہ خوشحال ہو، غیروں کی محتاجی سے تباہ حال اور غربت کی وجہ سے کمزور نہ ہو جائے؟

(۲۴) استبداد کی بیخکنی کس طرح کی جائے؟ کیا حکومت سے امید کی جائے گی کہ وہ ازخود اپنا استبداد ڈھا دے، یا یہ عقلاء قوم کا فرض ہے کہ آزادی قائم کریں اور استبداد کو اس طرح اُٹھا دیں کہ پھر اسکی واپسی ناممکن ہو جائے؟

ان اہم مباحث پر غور و فکر کا کام میں ناظرین کے ذمہ ڈال کر صرف اس آخری بحث، یعنی استبداد کی بیخکنی، کے متعلق چند کلمے لکھنا چاہتا ہوں۔

(۱) جس قوم کے کُل یا اکثر افراد، استبداد کا بوجھ محسوس نہیں کرتے وہ قوم آزادی کی مستحق نہیں۔

(۲) استبداد کا مقابلہ قوت و تشدد سے نہیں بلکہ عقل و تدبر کے ساتھ بتدریج ہونا چاہیے۔

(۳) استبداد کی مقاومت سے پہلے اُس حکومت کا خاکہ تیار کر لینا اشد ضروری ہے جسے استبداد کی جگہ قائم کرنا ہے۔

یہ استبداد ڈھانے کے اصول ہیں اور بظاہر ایسے ہیں کہ محکوم مایوس اور حاکم خوش ہوں، کیونکہ وہ دیکھنے میں استبداد کی عمر اور زیادہ بڑھانے والے معلوم ہوتے ہیں لیکن مستبدوں کو اُن سے خوش نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اِن ریشمی دستانوں میں فولادی پنجے چھپے ہوئے ہیں جو لازمی طور پر اُن کے استبداد کا گلا گھونٹ ڈالیں گے۔ اُفیس" فناری" کا قول ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ "مستبد اپنی طاقت و احتیاط پر نازاں نہ ہوں، کیونکہ کتنے ہی سرکش و جبار گذرے ہیں جنھیں مظلوموں نے پچھاڑ کر پھینکدیا ہے"۔

یہ کلیہ کہ جس قوم کے اکثر افراد استبداد کے مصائب محسوس نہیں کرتے وہ قوم آزادی کی مستحق نہیں، اس بنا پر ہے کہ جب قوم پر ذلت و مسکنت اس قدر چھا جاتی ہے کہ وہ چوپایوں کی زندگی ہی میں مگن رہنے لگتی ہے تو پھر وہ آزادی کا مطالبہ ہی نہیں کرتی۔ ممکن ہے اُس میں کبھی مستبد کے خلاف جوش پیدا ہو، مگر اس سے ہمیں دھوکہ نہیں کھانا چاہیے کیونکہ یہ جوش استبداد سے نجات حاصل کرنے کے لیے نہیں بلکہ صرف مستبد کی ذات سے انتقام لینے کیلئے ہوتا ہے۔ ظاہر ہے ایسے جوش سے قوم کو کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکتا۔ بلکہ اُلٹے یہ ہوتا ہے کہ اگر انتقام کامیاب ہوگیا تو ایک مرض کی جگہ دوسرا مرض آ کھڑا ہوتا ہے۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ مستبد کی ہلاکت کے بعد قوم کو آزادی مل جائے۔ آزادی تو اُسی وقت مل سکتی ہے جب اُسکی سچی طلب موجود ہو۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ غلامی پرست قوم کو کوئی اور مستبد اُسکے پرانے ظالم حاکم کے برخلاف

کھڑا کر دیتا ہے۔ اس صورت میں بھی فتح اگر بدتر نہیں تو شکست کے برابر ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ نیا مستبد بھی "مستبد" ہی ہوتا ہے اور وہ تمام وحشیانہ صفات رکھتا ہے جو اُسکے بھائی مغلوب مستبد میں تھیں۔ ایسی قوموں کو اگر مفت بھی آزادی مل جائے تو بھی اُنکے لیے بیکار ہوتی ہے۔ وہ اُس سے ذرا بھی فائدہ نہیں اُٹھا سکتیں بلکہ بسا اوقات اور زیادہ مصیبت میں پڑ جاتی ہیں۔ کیونکہ اس طرح کی آزادی بہت جلد ایک سخت ترین استبداد کی صورت اختیار کر لیا کرتی ہے جسکے مقابلہ میں ظالم سے ظالم بادشاہوں کا استبداد بھی ماند پڑ جاتا ہے۔

یہ اصول، کہ استبداد کا مقابلہ تشدد سے نہیں بلکہ عقل و حکمت سے بتدریج کیا جائے، اس بنا پر ہے کہ قومی احساس کی بیداری ہی وہ ہتھیار ہے جس سے استبداد کی جڑ کٹ سکتی ہے۔ "قومی احساس" کہہ دینے کو ایک ہلکا لفظ ہے مگر عملاً اُسکا جگانا بہت مشکل اور سخت محنت طلب ہے۔ وجہ صاف ظاہر ہے، عوام، کہ جن سے قوم عبارت ہے، کبھی بھی اپنے آرام آسایش پر شورش و پریشانی کو ترجیح نہیں دیتے۔ وہ ذات میں پڑے پڑے ذلیل ہو جاتے ہیں، عزت و آزادی کے نام سے بیزار ہوتے ہیں، کیونکہ مصائب کے دیو منہ پھاڑے راستہ میں کھڑے ہوتے ہیں۔ پس ایسی مخلوق کو جگانا، اُکسانا، سمجھانا، غیرت دلانا، حساس بنانا، اور آزادی کے جذبہ سے لبریز کر دینا کھیل نہیں ہے کہ جب چاہا کھیل لیا بلکہ سالہا سال کی اَن تھک اور انتھک کوششیں چاہتا ہے۔ پھر اگر قوم بیدار بھی ہو جائے تو بھی استبداد سے فوراً دست بدست مقابلہ کرنا دانشمندی نہیں۔ کیونکہ وہ طرح طرح کی قوتوں سے گھرا ہوتا ہے، ظلم کے ذرائع اُس کے پاس ہوتے ہیں، فوج کی قوت اُسکے ہاتھ میں ہوتی ہے، لوگوں کا ضمیر خریدنے کے لیے بے شمار روپیہ اُسکی جیب میں ہوتا ہے، دین فروش مذہبی پیشوا اُن کی ناقابل مقابلہ طاقت اُسکی پشت پناہی پر کمربستہ ہوتی ہے، غرضکہ گوناگوں قوتیں ہیں جو استبداد کو ایک بے پناہ تلوار بنا دیتی ہیں جس کا مقابلہ عام رائے کی کُند چھُری سے نہیں ہو سکتا۔ پھر اگر محرک ٹھوس نہ ہو تو یہ عام رائے کا خاصہ ہے کہ اگر سال بھر میں جوش مارتی ہے تو سال ہی بھر میں ٹھنڈی بھی ہو جاتی ہے، اور اگر ایک دن میں اُبل پڑتی ہے تو بس ایک ہی دن اُبال رہتا ہے۔ لہذا استبداد کی ان عظیم الشان قوتوں کے مقابلہ کے لیے ضروری ہے کہ جان توڑ کوشش سے قوم میں استقلال و صبر کے جوہر پیدا کیے جائیں تاکہ جب مقابلہ شروع ہو تو مضبوط اور فتحمندانہ ہو۔ استبداد کی مقاومت تشدد سے نہیں ہونا چاہیے تاکہ وہ اندھا فتنہ بنکر قوم و ملک کو برباد

نہ کر ڈالے - بلا شبہہ کبھی خود استبداد اس قدر سخت ہو جاتا ہے کہ صبر کا پیمانہ لبریز اور فتنہ کا
آتش فشاں خود بخود پھٹ پڑتا ہے - لیکن اگر قوم میں دانشمند ہوتے ہیں تو اُس پر برابر پانی ڈالتے
رہتے ہیں یہاں تک کہ جب اُسکا جوش کسی قدر ٹھنڈا ہوتا ہے تو پھر اُسکی تخریب میں لگ
جاتے ہیں -

مستبد کے خلاف عوام زیادہ تر خاص خاص فوری موثرات ہی کے ماتحت برانگیختہ ہوا
کرتے ہیں - مثلاً مستبد کسی مظلوم سے انتقام لینے کے لیے دردناک خون ریزی کر بیٹھے - بیرونی دشمن
سے جنگ میں بُری طرح مغلوب ہو جائے اور شکست کی ذمہ داری کسی سپہ سالار کے سر نہ تھوپ
سکے ، کوئی ایسی حرکت کر جائے جس سے مذہب کی توہین سمجھی جائے ، سخت خشک سالی
کے زمانہ میں رعایا سے نمایاں ہمدردی ظاہر نہ کرے ، لوگوں کی آبرو پر بر سر بازار دست درازی
کرنے لگے ، یا کوئی ایسا موقعہ پیش آ جائے جس میں عورتوں کی ایک بڑی تعداد مستبد کے خلاف
کھڑی ہو جائے ...... -

لیکن مستبد کیسا ہی کودن کیوں نہ ہو ، خطرہ کے اِن موقعوں سے خوب واقف ہوتا ہے
کیسا ہی جابر ہو مگر اپنی احتیاط سے کبھی غافل نہیں ہوتا - نیز اُسکے مددگار اور وزیر بھی یہ
کوئیں خوب پہچانتے ہیں اور اُن میں گرنے سے اُسے ہمیشہ بچائے رکھتے ہیں - البتہ اگر اُن میں
اُس کا کوئی دشمن ہوتا ہے تو غصہ دلا کر کسی ایسی ہی دلدل میں پھنسا دیتا ہے - اسی لیے کہا گیا
ہے کہ مستبد کا وزیر اعظم ، سپہ سالار اعظم ، یا اُسکا ہمنوا مذہبی پیشوا اُسکے گرانے اور ہلاک کرنے کی
سب سے زیادہ قدرت رکھتا ہے - مستبد بھی اس حقیقت سے واقف ہوتا ہے ، اسی لیے ہمیشہ
اُنکی خاطر مدارات میں لگا رہتا ہے اور اگر کسی کو گرانا چاہتا ہے تو اچانک گرا دیتا ہے -

رہا یہ اصول کہ استبداد کے مقابلہ سے پہلے اُس حکومت کی شکل تجویز کر لینا چاہیے جو استبداد
کی جگہ لے گی ، تو اس بنا پر ہے کہ ہر جد و جہد کی کامیابی کے لیے مقصد کی تعیین (اگرچہ اجمالاً ہی
ہو) ایک ناگزیر طبعی شرط ہے ، بلکہ کوئی جد و جہد بھی صحیح بنیادوں پر استوار نہیں ہو سکتی جب تک
پہلے سے اُسکا مقصد معیّن نہ کر دیا گیا ہو - لیکن حریت و استبداد کی جنگ میں مقصد کا اجمالی علم ہرگز
سود مند نہیں - اُسکی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ نہایت وضاحت کے ساتھ مقصد کی ایسی
تعیین کر دی جائے جو پوری قوم یا اکثریت کی نظر میں پسندیدہ ہو ، ورنہ کامیابی نہ ہوگی - کیونکہ
اگر مقصد کو گول مول چھوڑ دیا گیا ہے تو حملہ میں بھی قدم تیزی سے نہ اُٹھیں گے ، اور اگر سرے

ہے اُسے ظاہر ہی نہیں کیا گیا ہے یا ایسی صورت میں ظاہر کیا گیا ہے کہ عام رائے کے خلاف ہے تو یا جنگ شروع ہی نہ ہو سکے گی اور اگر ہو گی تو تمام سپاہی میدان چھوڑ کر مستبد کی گود میں جا گرینگے جسکے بعد سخت فتنہ ہو گا، آزادی کا کوئی مدتوں نام نہ لے گا، اور استبداد کی بنیادیں پہاڑ کی طرح مضبوط ہو جائیں گی۔

غرضکہ آزاد حکومت کی شکل معین کر لینا نہایت ضروری ہے۔ یہ کام آسان نہیں کہ گھنٹہ دو گھنٹہ کے بحث مباحثہ یا ایک دو آدمیوں کی ذہانت سے پورا ہو جائے، بلکہ وہ درحقیقت استبداد کی مقاومت سے بھی زیادہ مشکل اور عقل و تدبر کا محتاج ہے۔ اُسکے لیے جس دماغی استعداد کی ضرورت ہے اُسکا صرف خواص میں موجود ہونا کافی نہیں، بلکہ پوری قوم میں اُسکا عام ہونا بہت ضروری ہے۔ اس کا نتیجہ اس طرح ہونا چاہیے کہ پہلے قوم میں استبداد کی نازل کی ہوئی بربادیوں کا احساس پیدا کیا جائے۔ جب یہ حس پیدا ہو جائے اور پبلک سیاسی مباحث سے گہری دلچسپی لینے لگے، ایسی دلچسپی جو تمام طبقوں کے خیالات مشغول کر لے، تو سالہا سال تک اس ہوا کو پکنے اور بڑھنے دینا چاہیے، یہاں تک کہ قوم میں آزادی کے لیے سچی تڑپ پیدا ہو جائے۔ اُسوقت یہ ہو گا کہ مستبد خطرہ محسوس کریگا اور سخت سے سخت سزاوں پر اُتر آئے گا۔ اگر قوم اِس آزمایش میں بھی پوری اُتر جائے اور مستبد کے خوفناک دانتوں سے نہ ڈرے تو سمجھ لینا چاہیے کہ اُسکا دماغ تیار ہو گیا اور خود پر حکومت کرنے کی اُس میں صلاحیت پیدا ہو گئی ہے۔ اُسوقت قوم کو اختیار ہے کہ چاہے مستبد کا تخت اُلٹ دے یا اُسے مجبور کرے کہ اپنا استبداد اُس طرز حکومت سے بدل دے جسے وہ خود تجویز کر رہی ہے۔ اُسوقت مستبد کے لیے بجز ہتھیار ڈالدینے اور سر جھکا دینے کے کوئی چارہ نہ ہو گا۔ وہ مجبور ہو گا کہ قوم کی آواز سُنے اسکی خواہش کے مطابق عمل کرے اس طرح خطرناک خونی انقلاب کے بجائے پُرامن قدرتی انقلاب برپا ہو سکتا ہے، جو اگرچہ دیر میں ہو گا مگر کامیاب اور قوم و ملک کے لیے موجب صد خیر و برکت ہو گا۔

آخر میں اتنا اور اضافہ کرونگا کہ جو قوم اپنے نفس پر اختیار نہیں رکھتی وہ ذلیل و خوار ہو کر دوسری زبردست قوموں کی غلامی میں پڑ جاتی ہے۔ اسی طرح جب وہ سنِ تمیز کو پہونچ کر اپنا اچھا بُرا سمجھنے لگتی ہے اور اپنے دل و دماغ پر قابو حاصل کر لیتی ہے، تو بہت جلد اپنی کھوئی ہوئی عزت بھی واپس کر لیتی ہے۔ خدا کسی پر ظلم نہیں کرتا، خود انسان ہی اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارتا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تمہید۔ مولوی ظفر الملک اڈیٹر الناظر نے اپنے ایک مطبوعہ خط میں مجھسے خواہش ظاہر کی ہے کہ میں ایک انعامی مضمون میں شرکت کروں جسکا عنوان یہ ہے :-

"آزاد، حالی، نذیر احمد اور شبلی میں سب سے بڑا انشا پرداز کون تھا اور سب سے زیادہ اُردو کی خدمت کس نے انجام دی" مجھے اپنے لایق دوست کے ارشاد کی تعمیل سے قبل یہ عرض کر دینا چاہیے کہ میں نے سیر المصنفین جلد دوم میں جو زیرِ طبع ہو اس قسم کے موازنوں اور محاکموں سے پرہیز کیا ہے۔ جہاں ان بزرگوں اور ان کے دیگر ہم عصروں کے حالاتِ زندگی درج کیے ہیں اور ان کے اندازِ تحریر پر نقادانہ نظر ڈالی ہو وہاں ان کا آپس میں مقابلہ اور موازنہ نہیں کیا۔ صرف تاریخ نویسی کے اعتبار سے مولوی ذکاءاللہ، آزاد اور شبلی کا کسیقدر موازنہ کر دیا ہے۔ در اصل یہ موازنہ جسکی یہ صلائے عام یارانِ نکتہ داں کو دی گئی ہو، اگر مجھے معاف کیا جائے تو ایک بے جوڑ سی بات ہے کیونکہ ان میں سے ہر ایک مصنف کی شاہراہ دوسرے سے جداگانہ ہے اور ہر ایک کا طرزِ تحریر دوسرے سے مختلف ہے اور لطف یہ ہے کہ ہر ایک اپنے اپنے رنگ میں بے نظیر ہے۔ پس کسی ایک کو دوسروں پر ترجیح دینا ہرگز کسی اصولِ متعارفہ یا کسی اصولِ موضوعہ پر مبنی قرار نہیں دیا جا سکتا۔

یہ ایک وجدانی کیفیت ہے جس سے ہم ایک مصنف کو اپنی نظروں میں محبوب اور دلفریب سمجھتے ہیں اور دوسروں کو اُسکے درجہ سے کم پایہ خیال کرتے ہیں۔ فی الحقیقت مذاقِ صحیح اِن سب میں خوبیاں دیکھتا ہے اور لطف اُٹھاتا ہے اور موازنہ کی خاردار جھاڑیوں سے اپنے دامن کو اُلجھنے نہیں دیتا۔ انگریزی مین ایک ضرب المثل ہے کہ موازنہ ہمیشہ بدنما ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ میں اپنے میلانِ طبعی کی بدولت ایک کو دوسرے پر ترجیح دے سکتا ہوں اور دلائل بھی پیش کر سکتا ہوں لیکن یہہ ضرور نہیں ہے کہ سب آدمی میرے ہم خیال ہو جائیں اور میری رائے سے اتفاق کرین بلکہ زیادہ تعداد ایسی ہوگی جو اختلافی پہلو لئے ہوگی۔ برخلاف اِس کے اگر کسی مصنف کی تحریر کے حسن و قبح پر نظر ڈالی جائے تو وہ ناظرین کو ہرگز برانگیختہ نہیں کر سکتی لیکن موازنہ ایسی چیز ہے جو طبیعتوں میں جوش اور خروش پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ اخلاقی مسائل پیش کرتا ہے جن میں بلاشبہہ بدنمائی کی جھلک پائی جاتی ہے اور انگریزی مثل کی پوری تطبیق ہوتی ہے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ اِس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مختلف مصنفون کے درمیان محاکمہ کر کے اُن کے کارناموں کے جملہ پہلوؤں پر تنقیدی نظر ڈالنے سے ادبی سرمایہ کی جانچ پرتال ہوتی ہے اور برے بھلے میں تمیز کرنے سے لوگوں میں مذاقِ سلیم کا مادّہ پیدا ہوتا ہے جو ہر زبان کے لٹریچر کو وسعت دینے کے لئے نہایت ضروری اور مفید شے ہے۔ علاوہ ازین موجودہ نسل کا یہ فرض بھی ہے کہ وہ ایک باغبان کی طرح اُس گلشنِ ادب کی ضروری غور و پرداخت کرتی رہے جس کو اُسکے بزرگ گلہائے رنگا رنگ سے آراستہ و پیراستہ چھوڑ گئے ہیں تاکہ رطب و یابس کی خاردار جھاڑیاں اپنی کثرت سے اِن پھولوں کی نشو و نما میں ہارج نہ ہوں اور اِنکو ہمیشہ کے لیے پژمردہ نہ کر دیں۔

مضمون مندرجہ عنوان کی دو شقیں ہیں۔ پہلی شق یہ ہے کہ اِن چاروں میں

سب سے بڑا انشا پرداز کون تھا اور دوسری شق یہ ہے کہ ان میں سے کس نے اُردو کی خدمت سب سے زیادہ انجام دی؟ پہلے ہم جزوِ اوّل کو لیتے ہیں اور اُس پر اپنے ناچیز خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ اِسکے بعد دوسرے جزو کی باری آئیگی۔

انشا پردازی کی تعریف

شاعری کی طرح انشا پردازی کی بھی یہی تعریف کی جاسکتی ہے کہ سُننے والوں اور پڑھنے والوں کے دل پر اثر پیدا کرے۔ اور اگرچہ وہ بلحاظ قوافی اور وزن کے موزون نہ ہو لیکن اُسکی روانی اور برجستگی میں فرق نہ آئے۔ اکثر مؤثر نثروں کو نظم کے ہم پلہ مانا گیا ہے بلکہ نظم کہا گیا ہے۔ چنانچہ کلامِ پاک کی عربی نثر، نظمِ قرآن کے نام سے موسوم ہے۔ فی الواقع اگر کلام بے اثر ہو تو اُس کا ہونا، نہ ہونا برابر ہے اور اس قابل نہیں کہ اُس کو کلام کہا جاسکے خواہ اُس میں ہزارہا صنعتیں اور رنگ آمیزیاں پائی جائیں۔

ایک مصنّف کے نزدیک "عام لوگ کلامِ موزوں کو شعر کہتے ہیں لیکن محققین کی یہ رائے نہیں۔ وہ وزن کو شعر کا ایک ضروری جزو سمجھتے ہیں تاہم اُن کے نزدیک وہ شاعری کا اصل عنصر نہیں ہے۔ شاعری دراصل دو چیزوں کا نام ہے محاکات اور تخئیل۔ اِن میں سے ایک بات بھی پائی جائے تو شعر، شعر کہلانے کا مستحق ہوگا باقی اور اوصاف یعنی سلاست، صفائی، حسنِ بندش وغیرہ وغیرہ شعر کے اجزائے اصلی نہیں بلکہ عوارض اور مستحسنات ہیں۔"

اسی طرح انشا پردازی میں بھی محاکات اور تخئیل لازمی ہیں۔ محاکات سے مراد کسی چیز یا کسی حالت کا اس طرح ادا کرنا ہے کہ اُس شے کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے اور تخئیل سے مطلب ایک قوّتِ اختراع ہے یعنی وہ قوّت جس کا یہ کام ہے کہ اُن اشیا کو جو مرئی نہیں ہیں یا جو ہمارے حواس کی کمی کی وجہ سے ہم کو نظر نہیں آتیں، ہماری نظر کے سامنے کردیے۔

ایک اور مصنف لکھتا ہے:۔ "غالباً اس بات پر سب کا اتفاق ہوگا کہ تحریر کا اصل مقصد لوگوں کے دلوں پر اثر کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے مگر اس امر میں سب کی رائے مختلف معلوم ہوتی ہے کہ اثر کس طرح پیدا ہوتا ہے ؟ اسی ایک مقصد کے لئے کوئی الفاظ میں تراش، خراش اختیار کرتا ہے اور کوئی سادگی۔ کوئی کلام کی بنیاد متانت اور سنجیدگی پر رکھتا ہے اور کوئی مزاح و ظرافت پر۔ کوئی سج سج کر علمی اصطلاحیں اور فاضلانہ ترکیبیں استعمال کرتا ہے اور کوئی ڈھونڈ ڈھونڈ کر اہلِ زبان کے محاورے اور روزمرے بہم پہنچاتا ہے۔ اس طرح کوئی کسی ڈھنگ پر چلتا ہے اور کوئی کسی طریقہ پر مگر حق یہ ہے کہ کلام کی تاثیر کو ان باتوں سے کچھ علاقہ نہیں"

"بے شک کلام کے مؤثر ہونے کے لیے اُس کا سادہ اور بے تکلف ہونا ضرور ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو کلام سادہ اور بے تکلف ہوگا وہ مؤثر بھی ضرور ہوگا۔ کسی مصنف کے کلام میں جو تاثیر ہوتی ہے وہ درحقیقت اُس کی سچائی اور حق گوئی کا نتیجہ ہوتی ہے اور اُسکے سیدھے، سادے اور معمولی الفاظ میں جادو کا اثر پیدا کر دیتی ہے۔ تشبیہیں، استعارے، کنائے، تمثیلیں، تلمیحیں، بذلے اور لطیفے، کہاوتیں اور اشعار سب کچھ ہوں لیکن بے ساختہ پن نہ ہو تو کلام مؤثر نہیں ہو سکتا۔"

اِن دونوں مصنفین کے اقوال سے ہمارے نفسِ مضمون کے مطابق حسبِ ذیل نتائج مستنبط کیے جا سکتے ہیں:۔

(۱) ایک انشا پرداز کے لئے ضرور ہے کہ وہ محاکات میں کامل اور تخئیل میں فرد ہو یعنی وہ اپنے الفاظ سے کسی چیز یا خیال یا احساس کی ایسی تصویر کھینچ دے جو اصل سے بھی آب و تاب اور حسن و جمال میں بڑھ جائے اور سامعین پر یہ اثر ڈالے کہ یہ وہی چیز یا خیال یا احساس ہے جس کو لوگوں نے امعانِ نظر سے نہیں دیکھا تھا

یا اچھی طرح محسوس نہیں کیا تھا اور اس لئے اُس کا حسن پورا نمایاں نہیں ہوا تھا۔

(۲) یہ انشا پرداز اُس وقت انشا پرداز کہلانے کا مستحق ہوگا جبکہ لوگ اس کی تحریرات سے متاثر ہونگے یا بالفاظِ دیگر اس کا محاکات اور تخئیل میں کمال اُسوقت تسلیم کیا جائیگا جبکہ اُس کی دماغی کوشش بارآور ہوگی یعنی اُس کی تحریر سے ناظرین اثر پذیر ہوں گے۔

(۳) کسی کلام میں اثر اُس وقت پیدا ہوگا جبکہ لکھنے والا اپنے دل کی ترجمانی قلم کی زبان کے ذریعہ سے بے کم وکاست کریگا اور وہ خود راست باز اور حق گو ہوگا۔ الفاظ کی تراش، خراش یا سادگی یا تشبیہ واستعارات یا تلمیحات وغیرہ عوارض ومستحسنات ہیں لیکن کلام کی تاثیر ان باتوں پر مبنی نہیں ہے۔

اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ ان تینوں نتائج کے لحاظ سے ان چاروں بزرگوں کی تحریرات کہاں تک عہدہ برآ ہوتی ہیں اور پھر ان میں سے کون گوئے سبقت لیجاتا ہے۔

اس موقع پر یہ عرض کردینا ضروری ہے کہ شاعروں کا موازنہ اُن کا ایک ایک شعر نقل کردینے سے آسانی ہوسکتا ہے کیونکہ اکثر ایک شعر میں جو مضمون شاعر ادا کرنا چاہتا ہے پورا ہوجاتا ہے یا کسی واقعہ کے متعلق دو چار یا زیادہ سے زیادہ دس بیس اشعار سے دونوں شعرا کے کلام پر رائے زنی کی جاسکتی ہے لیکن برعکس اس کے انشاپردازوں کے پورے مضمون کو نقل کئے بغیر یہ منشا پورا نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اِدھر اُدھر سے دس بیس سطروں کا انتخاب اُن کی انشا کے جوہر کو نمایاں نہیں کرسکتا تاوقتیکہ وہ مضمون جس پر اُنھوں نے قلم اُٹھایا ہے تمام وکمال آنکھوں کے سامنے نہ آجائے اور دل ودماغ اُسکے اثرات سے متاثر نہ ہوجائیں۔

پورے مضامین نقل کرنیکی ضرورت

ظاہر ہے کہ یہ چاروں بزرگ، چاردانگِ ہند میں مشہور ومعروف ہیں اور ان کی کتابیں اور ان کے مضامین اپنی خوش ادائی اور دلفریبی سے لوگوں کو اپنا

گرویدہ کئے ہوئے ہیں۔ جو مضامین ہم نقل کرینگے اُردو خواں پبلک نے اُنھیں بارہا پڑھا ہوگا اور شاید اُس کے حافظہ میں یہ محفوظ ہونگے۔ لیکن ان مضامین کا ایک دُھندلا سا خاکہ اُس کے دماغ میں ہوگا اور موازنہ کی غرض سے غالباً اُس نے کبھی ان کو نہ پڑھا ہوگا۔ اس لئے ان مضامین کا اعادہ قندِ مکرر کا مزہ دیگا اور جو محاسن یا معائب ہم ان مضمونوں کے شمار کرائینگے، وہ سب پیش نظر ہونگے کسی دیگر کتاب کے دیکھنے کی ضرورت باقی نہ رہیگی۔ پس ہم کو معاف کیا جائے اگر ہمارا مضمون، نقولِ مضامین سے طویل ہو جائے۔

سب سے پہلے ہم مولوی نذیر احمد کی کتاب توبۃ النصوح سے جو اُن کی بہترین تصنیف ہے نصوح کا خواب نقل کرتے ہیں جو اس کتاب کا سب سے عمدہ حصہ ہے۔

نصوح کا خواب

"آنکھ کا بند ہونا تھا کہ نصوح ایک دوسری دنیا میں تھا۔ جو خیالات ابھی تھوڑی دیر ہوئی اُسکے پیشِ نظر تھے سب اُسکے دماغ میں بھرے ہوئے تھے۔ اب متخیلہ نے اُن کو اگلے پچھلے تصورات سے گڈمڈ کر کے ایک نئے پیرائے میں لا سامنے کھڑا کیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک بڑی عمدہ اور عالیشان عمارت ہے اور چونکہ نصوح خود بھی ڈپٹی مجسٹریٹ یا حاکم فوجداری رہ چکا تھا تو اُس کو یہ تصور بندھا کہ یہ گویا ہائی کورٹ کی کچہری ہے۔ لیکن حاکم کچہری کچھ اس طرح کا رعب دار ہے کہ باوجودیکہ ہزاروں لاکھوں آدمیوں کا اجتماع ہے مگر ہر شخص سکوت کے عالم میں ایسا دم بخود بیٹھا ہے کہ گویا کسی کے منھ میں زبان نہیں اور جو کوئی بضرورت بولتا اور بات بھی کرتا ہے تو اس قدر آہستہ کہ کانوں کان خبر نہ ہو۔ اتنی بڑی تو کچہری مگر مختار اور وکیل کسی طرف دیکھنے میں نہیں آتے۔ کچہری کے عملے اس طرح کے کھرے اور اپنے حاکم سے اتنا ڈرتے ہیں کہ کسی اہلِ معاملہ اور مقدمے والے کو اپنے پاس تک آنے کے روادار نہیں۔ غرض کیا مجال کہ کوئی اپنے بارے میں ناجائز پیروی

کر کے یا روپے پیسے کا لالچ دکھا کر یا سعی سفارش بہم پہنچا کر کاربرآری کر سکے ۔
اگرچہ انصاف اور معاملہ فہمی اور ہمہ دانی کی وجہ سے حاکم کی ہیبت ادنیٰ اعلیٰ سب پر
چھائی ہوئی ہے مگر جتنے مجرم ہیں، کیا خفیف، کیا سنگین، کوئی اس کے رحم سے
ناامید نہیں ۔ اختیارات اُسکے اسقدر وسیع ہیں کہ نہ اُسکے فیصلے کی اپیل ہے،
نہ اُسکے حکم کا مرافعہ ۔ کام کرنے کا ایسا اچھا ڈھنگ ہے کہ کام روز کا روز صاف،
کتنے ہی مقدمے پیشی میں کیوں نہ ہوں، ممکن نہیں کہ تاریخ مقررہ پر فیصلے نہ ہو جائیں
پھر یہ نہیں کہ کسی مقدمے کو رواروی اور سرسری طور پر تجویز کر کے ٹال دیا جائے۔
نہیں جو حکم صادر کیا جاتا ہے، ہر عذر کو رفع، ہر حجت کو قطع بلکہ خود مجرم کو قائل
معقول کر کے اور گنہگار کے مُنھ سے اُس کی خطا تسلیم کرانے کے بعد ۔ غرض جو تجویز ہے
موجّہ، جو فیصلہ ہے مدلل، جو رائے ہے حتمی داذعانی، جو حکم ہے دودھ کا دودھ،
پانی کا پانی ۔ گواہوں کے باب میں ایسی احتیاط ملحوظ ہے کہ صرف عادل، ثقہ، در
ست گو کی گواہی لی جاتی ہے اور وہ بھی ایسے کہ واقف الحال، چشم دید، بلکہ مجرم کے
رفیق اور ہم نشین کہ اُسکے رازدار اور معین و مددگار رہوں ۔ پھر کیا دیکھتا ہے کہ ہر مجرم کو
فرداً فرداً فردِ قرارداد جرم کی ایک نقل دی گئی ہے کہ وہ اُس کو پڑھ رہا ہے اور
جتنے الزام اُس پر لگائے گئے ہیں، سب کو سمجھتا اور اپنے برائت کے وجوہات کو سوچتا ہے
کچہری کا خیال نصوح کو حوالات کی طرف لے گیا تو دیکھا ہر شخص ایک علیحدہ جگہہ میں
نظر بند ہے ۔ جو جیسا مجرم ہے مناسب حالت حوالات میں سختی یا سہولت سے
ساتھ رکھا گیا ہے ۔ حوالات کے برابر جیلخانہ ہے مگر بہت ہی بڑا ٹھکانا ہے ۔ محنت
کڑی، مشقت سخت ۔ جو اُس میں گرفتار ہیں سولی کے متمنی اور پھانسی کے خواستگار
ہیں ۔ نصوح یہہ مقام ہول ناک دیکھتے ہی اُلٹے پاؤں پھرا ۔ باہر آیا تو پھر
حوالاتیوں اور زیر تجویزوں میں تھا ۔ اِن لوگوں میں ہزارہا آدمی تو اجنبی تھے

لیکن جابجا شہر اور محلّے کے آدمی بھی نظر آتے تھے مگر وہ جو مر چکے تھے۔ نصوح کو یہ سب سامان دیکھکر اُسی خواب کی حالت میں ایک حیرت تھی کہ الٰہی یہ کون سا شہر ہے کس کی کچہری ہے، یہ اتنے مجرم کہاں سے پکڑے ہوئے آئے ہیں۔ میرے ہم وطنوں نے کیا جرم کیا ہے کہ ماخوذ ہیں اور یہہ کیسے مرے تھے کہ میں اِن کو یہاں جواب دہی میں دیکھتا ہوں۔ اسی حیرت میں لوگوں کو دیکھتا بھالتا چلا جاتا تھا کہ دور سے اُسکو اپنے والدِ بزرگوار حوالاتیوں میں بیٹھے نظر پڑے۔ پہلے تو سمجھا کہ نظر غلطی کرتی ہے مگر غور کیا تو پہچانا کہ نہیں واقع میں وُہی ہیں۔ دوڑکر قدموں پر گر پڑا اور کہنے لگا یا حضرت ہم سب آپ کی مفارقت میں تباہ ہیں، آپ یہاں کہاں۔

باپ۔ میں اپنے گناہوں کی جوابدہی میں ماخوذ ہوں۔ یہہ مقام جو تم دیکھتے ہو دارالجزا ہے اور خداوند تعالیٰ جلّ و علا شانہ اِس محکمے کا حاکم۔

بیٹا۔ یا حضرت آپ تو بڑے متقی، پرہیزگار، خداپرست، نیکوکار تھے۔ آپ پر اور گناہوں کا الزام۔

باپ۔ گناہ بھی ایک دو نہیں، سیکڑوں، ہزاروں۔ دیکھو یہہ میرا نامۂ اعمال کیسی رُسوائی اور فضیحت سے بھرا ہوا ہے اور میں اُسکو دیکھ دیکھ کر سخت پریشان ہوں کہ کیا جواب دوں گا اور کون سی وجہ اپنی برارت کی پیش کروں گا۔ یہہ وہی کاغذ تھا جو نصوح نے ہر شخص کے ہاتھ میں دیکھا تھا اور اُسکو دنیا کے خیالات کے مطابق فردِ قرار دادِ جرم سمجھا تھا۔ باپ کا نامۂ اعمال دیکھا تو تھرّا اُٹھا۔ شرک اور کفر اور نافرمانی، ناشکری اور بغاوت اور بے ایمانی، کبر و نخوت، دروغ و غیبت، طمع و حسد، مردم آزادی، نفاق و ریا، حُبِّ دُنیا کوئی الزام نہ تھا کہ اُس میں نہ ہو۔ چونکہ نصوح کے دماغ میں خیالاتِ دنیوی گونج رہے تھے لگا باپ کے نامۂ اعمال میں تعزیراتِ ہند کا دفعہ اور ضمن ڈھونڈنے، سو تعزیراتِ ہند

کی دفعات کی عوض قرآن کی سورتوں اور آیتوں کا حوالہ تھا، متعجب ہوکر باپ سے پوچھا کہ یا حضرت پھر کیا آپ ان تمام جرموں کے مرتکب ہوئے ہیں۔ باپ ۔ سب کا ۔ بٹیا ۔ کیا آپ حضورِ حاکم اقرار کر چکے ہیں ۔

باپ ۔ انکار کی گنجائش ہی نہیں، میری مخالفت میں گواہی اتنی وافر ہے کہ اگر میں انکار کروں بھی تو پذیرا نہیں ہو سکتا ۔

بٹیا جناب وہ کون لوگ ہیں جو آپ کی مخالفت پر آمادہ ہیں ۔

باپ ۔ اول تو دو شخص کراً ما کا بتین اس بلا کے ہیں کہ میرا کوئی فعل اُن سے مخفی نہیں، جتنی باتیں کہتے ہیں تپے کی، اور کہتے کیا ہیں میرا روزنامچہ عمری لکھتے گئے ہیں اب جو میں اسکو دیکھتا ہوں حرف بحرف صحیح اور درست پاتا ہوں ۔ دوسرے یہی میرے اعضاء ہاتھ، پاؤں، آنکھ، کان وغیرہ کوئی میرے کہنے کا نہیں ۔ سب کے سب مجھ سے منحرف، سب کے سب مجھ سے برگشتہ ۔ میری مخالفت پر آمادہ، میری تذلیل پر کمر بستہ ہو رہے ہیں ۔

بٹیا ۔ آخر آپ کچھ اس کی وجہ بھی سمجھتے ہیں ۔

باپ ۔ میں ان کو غلطی سے اعوان و انصار، بھیدی، رازدار سمجھتا تھا مگر واقع میں یہ سب جاسوس ایزدی تھے اُنھوں نے وہ سلوک میرے ساتھ کئے کہ تسمہ لگا نہیں رکھا ۔

بٹیا ۔ پھر آپ کا کیا حال ہے ۔

باپ ۔ جب سے دنیا کو چھوڑا قبر کی حوالات میں ہوں، تنہائی سے جی گھبراتا ہے، انجام کار معلوم نہیں، شبانہ روز اسی اندیشے میں پڑا گھلتا ہوں ۔ حوالات میں مجھ کو اس قدر ایذا ہے کہ بیاں نہیں کر سکتا ۔ مگر صبح و شام ہر روز آتے جاتے جیل خانے کے پاس سے ہو کر گزرنا ہوتا ہے ۔ دوزخ وہی ہے وہاں کی تکلیفات

دیکھ کر اور سُن کر ہوش اُڑے جاتے ہیں اور غنیمت معلوم ہوتا ہے کہ اے کاش ہمیشہ کے واسطے اسی حوالات میں رہنے کا حکم ہو جاتا۔

بٹیا۔ پھر ہنوز آپ کا مقدمہ پیش نہیں ہوا۔

باپ۔ خدا نہ کرے کہ پیش ہو۔ جو دن حوالات میں گزرتا ہے غنیمت ہے۔ اوّل اوّل جب میں حوالات میں آیا تو اعمال نامہ مجھکو حوالہ کر دیا گیا۔ بس اُسی کو دیکھتا اور انجام کار سے ڈرا کرتا ہوں نجات کی کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی۔

بٹیا۔ بھلا کسی طرح ہم لوگ آپ کی اس مصیبت میں کام آسکتے ہیں۔

باپ۔ اگر میرے لئے عاجزی اور خلوص کے ساتھ دُعا کرو تو کیا عجب ہے کہ مفید ہو۔ ابھی میرے ہمسائے میں ایک شخص کی رہائی ہوئی ہے، اُس پر بھی بہت سے الزام تھے مگر جہاں اللہ تعالیٰ میں کامل درجہ کا انصاف ہے، رحم بھی پرلے ہی سرے کا ہے، اُس شخص کے پس ماندوں نے اُس کے واسطے بہت زاری کی تو پرسوں یا اترسوں اُس کو بلا کر ارشاد فرمایا کہ تیرے افعال جیسے تھے وہ اب تجھ پر مخفی نہیں رہے مگر ہمارے کئی بندے تیری معافی کے واسطے ہمارے حضور میں گڑگڑاتے ہیں اور وہ تیرے ہی زن و فرزند ہیں۔ ہم کو تیری یہی ایک بات بھلی معلوم ہوتی ہے کہ تو نے اپنے خاندان میں نیکی اور دینداری کا بیج بویا، جا ہم نے تیری خطا معاف کی۔ بٹیا! سچ کہنا تم لوگوں نے بھی کبھی میرے حق میں دُعائے خیر کی ہے۔

بٹیا۔ جناب آپ کے انتقال کے بعد رونا پیٹنا تو بہت کچھ ہوا اور اب تک اس شدت کے ساتھ ہوتا ہے کہ گویا آپ نے ابھی انتقال فرمایا ہے اور یہ رونا تو ہم لوگوں کے دم کے ساتھ ہے، آپ کی عنایتیں، آپ کی شفقتیں جب تک جئیں گے یاد کریں گے رسم دنیا کے مطابق آپ کا کھانا بھی برادری میں تقسیم کر دیا ہے۔ لوگ شاید میرے منھ پر خوش آمد سے کہتے ہوں مگر کہتے تھے کہ اسی مہنگے سمے میں باپ کا کھانا اچھا کیا۔

دُعا کے بارے میں غلط بات کیونکر عرض کروں اہتمام نہیں ہوا۔ آپ کے بعد ترکہ و میراث کے ایسے جھگڑے پڑ گئے کہ آج تک نہیں سلجھے مگر یہ تو فرمائیے کہ آپ تو صوم و صلوٰۃ کے بڑے پابند تھے، کیا اعمال و افعال کچھ بھی کام نہ آئے۔

باپ۔ کیوں نہیں یہ اُن ہی اعمال کا طفیل ہے کہ تم مجھ کو اِس حالت میں دیکھتے ہو ورنہ بہتیرے مجھ سے بھی زیادہ تکلیف میں ہیں، حوالات میں جیل خانے کی سی ایذا ہے مگر یہاں اعمال میں خلوصِ نیت شرط ہے۔ میں نے اپنے اعمال کو آکر دیکھا تو اکثر جیسے جھوٹے موتی، کھوٹے روپے۔ نمازیں بے حضورِ قلب اکارت گئیں اور روزے چونکہ پابندیِ رسم کے طور پر رکھنے کا اتفاق ہوتا تھا خالی فاقے کے شمار میں آئے۔

بٹیا۔ پھر اِس دربار میں کچھ سعی سفارش کا دخل نہیں۔

باپ۔ استغفر اللہ! کوئی کسی کی بات تو پوچھتا ہی نہیں، نفسی نفسی پڑی ہے ہر شخص اپنی بلا میں مبتلا اور اپنی مصیبت میں گرفتار ہے، دوسرے کی نجات تو کوئی کیا کرائیگا پہلے آپ تو سُرخ رو ہولے۔

بٹیا۔ کیوں جناب! معاذ اللہ یہ شرک و کفر کا الزام آپ پر کیسا! ہم لوگ تو خیر، سارا شہر آپ کے اتقا کا معتقد تھا۔ کیا آپ خدا کے قائل نہ تھے؟

باپ۔ قائل تو تھا۔ دل سے معتقد نہ تھا۔

بٹیا۔ جناب آپ کے تمام اعمالِ ظاہر سے مستنبط ہوتا تھا کہ آپ کو خدائے کریم کے ساتھ بڑی راسخ عقیدت ہے۔

باپ۔ وہ تمام عقیدت معلوم ہوا کہ اوپری دِل سے تھی۔ جب اوّل اوّل میرا اظہار لیا گیا تو پہلا سوال مجھ سے یہی پوچھا گیا کہ تیرا رب کون ہے؟ چونکہ مرتے وقت مجھکو ایمان کی تلقین کی گئی تھی میں نے جواب دیا کہ اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ۔ تب اُس پر جرح کیا گیا کہ بھلا جب تو نوکری سے برخاست ہوکر گھر آیا اور مدت تک خانہ نشین رہا

اور جو کچھ کما کر لایا تھا سب صرف ہو گیا اور نانِ شبینہ کو محتاج ہو کر نوکری کی جست و جو میں اِدھر اُدھر پھرتا اور مضطر ہو ہو کر ہم سے دُعائیں مانگتا تھا اگر ہم تیرا صبر و استقلال آزمانے کے لئے تیرے مدعا کو حیزِ التوا میں ڈالے ہوئے تھے اور ایک انگریز حاکمِ ضلع نے کہ وہ بھی مثل تیرے ہمارا بندہ تھا، ہمارے ایما سے تیری پرورش کا وعدہ کیا اگر ہم نے تجھپر اپنے ایما کو ظاہر نہیں ہونے دیا اور تو یہی سمجھا کہ وہ تیری ہی کوشش کا نتیجہ تھا، سچ بتا کہ تجھکو اُس انگریز کے وعدۂ زبانی کا زیادہ آسرا تھا یا ہمارے تحریری تمسک وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا کا۔ اگر تو ہم کو صمیمِ قلب سے حاضر و ناظر سمیع و بصیر و قادر جانتا تھا تو گناہ پر تجھکو کیوں کر جسارت ہوتی۔ تھی تو بھول کر کبھی پہاڑ میں تو نہیں کودا، کبھی کھولتے پانی میں تو تُو نے ہاتھ نہیں ڈالا۔ کبھی جلتی ہوئی آگ کو تو نے مٹھی میں نہیں لے لیا اگر تو گناہوں کا نہایت بے باکی سے مرتکب ہوتا تھا ضرور ہے کہ یا تو تجھ کو ہمارے فرمانے کا یقین نہ تھا کہ گناہ کی سزا آتشِ دوزخ ہے یا اگر یقین تھا تو تو اُس کو دنیا کی آگ سے کمتر سمجھتا تھا۔ دنیا میں جو کچھ رفاہ۔ جو کچھ عیش و آرام ہم نے تجھکو بے استحقاق صرف اپنی مہربانی سے عطا کیا تھا کیا تو نے اُسکو ہمیشہ اپنی حسنِ تدبیر کی طرف منسوب نہیں کیا، جو تکلیف تجھکو دنیا میں پہنچی اگرچہ تو اپنے ہاتھ سے اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارا کرتا تھا مگر کیا تو اُسکا الزام ہماری ذاتِ مجمع الصفات پر نہیں لگاتا تھا۔ اے احسان فراموش! ہزاروں لاکھوں احسان میں نے تجھپر کیے اور تجھ سے اتنا نہ ہو سکا کہ بھلا منہ سے اقرار تو کرتا۔ اے ناشکرے بے شمار نعمتیں میں نے تجھکو عطا فرمائیں مگر تجھپر اتنا بھی اثر نہ ہوا کہ کبھی زبان پر تو لاتا۔ جتنا میں نے تیرے ساتھ سلوک کیا، اُتنا ہی تو میری مخالفت پر کمربستہ رہا۔ جتنی میں تیری رعایت کرتا رہا اُسی قدر تو گستاخ اور شریر ہوتا گیا۔ اس حیاتِ بے ثبات پر تجھ کو اتنا گھمنڈ ہو گیا تھا کہ تو اپنے تئیں ہماری خدائی سے باہر لے چلا تھا۔ اس

چند روزہ زندگی پر تو اس قدر مغرور تھا کہ دائرۂ عبودیت سے اپنے تئیں خارج کرنا چاہتا تھا۔ ہم نے تجھکو نیست سے ہست کیا اور خلعتِ انسانیت سے سرفراز بنایا، جو تجھ کو درکار تھا سو دیا، جس کا تو حاجت مند تھا سب مہیا کیا، ہر حال میں تیرے حافظ، ہر کیفیت میں تیرے نگہبان رہے کیا اس واسطے کہ تو کبھی بھولکر بھی ہماری طرف توجہ نہ کرے اور ہمیشہ اپنی ڈیڑہ اینٹ کی مسجد ہم سے جدا رکھے۔ جب تو ایک مضغۂ گوشت تھا، ضعیف ولا یعقل، نادان وجاہل، ضعیف اتنا کہ نقل وحرکت پر قادر نہیں، نادان ایسا کہ خویش وبیگانے کا امتیاز نہیں، ہم نے تجھکو دودھ پلوا پلوا کر توانا کیا اور اپنے بندے جو تجھپر ہر طرح کا شرف رکھتے تھے یعنی تیرے ماں باپ تیری خدمت گزاری کو مقرر کئے اور اُن کے دلوں میں محبت ڈال دی کہ انھوں نے ہمارے حکم سے تجھکو پالا پوسا اور تو روز بروز چونچال اور خوش حال ہوتا گیا، پھر ہم نے عقل کو تیرا صلاح کار بنایا تو اُس کی مدد سے اپنی آسائش جائز کے واسطے ہر طرح کا سامان بہم پہنچائے۔ دنیا کے چرند، پرند، حیوانات بناتات، جمادات سب کو تیرا مطیع فرمان بنا دیا کہ تو اُن پر حکمرانی کرے اور اُن میں متصرف رہے کیا اس لئے کہ تو بہک کر بھی کبھی ہماری طرف رُخ نہ کرے اور سدا ہم سے بھاگا بھاگا پھرے۔ تیری زندگی محض ایک ہستی بے بود تھی۔ دو لمحے تجھکو تنفس کے لئے ہوا نہ ملتی تو تیرا دم نکل جاتا۔ ایک رات دن بے آب ودانہ تجھکو جینا دشوار ہوتا، منوں ہوا تو سونگھ گیا اور کبھی نہ سوچا کہ ہمارے طفیل سے، غلّہ انبار کے انبار ٹھونس گیا اور کبھی نہ سمجھا کہ ہماری بدولت۔ زندگی بھر کئی کنوئیں تو نے خالی کئے ہونگے مگر کبھی دھیان نہ کیا کہ ہمارے صدقے میں۔ او، ایک پانی اور ہوا اور غلّہ غذا کیا، ضرورت کی کل چیزیں تو کہاں سے لاتا اور کہاں سے بہم پہنچاتا تھا ہمارے توشہ خانۂ عام سے۔ مگر اس پر تیری یہ ہکیڑی تھی کہ گویا ہم تیرے قرضدار ہیں یا ہم پر کچھ تیرا اُدھار آتا ہے۔ تو کھاتا تھا اور مکرتا تھا، لیتا تھا اور بھول جاتا تھا۔

دنیا کی باتوں میں تو تیری عقل بڑی رسا تھی مگر تو جان بوجھ کر ہمارے ہی ساتھ
تجاہل کرتا تھا ۔ منھ پر آنکھیں تھیں اور اندھا ۔ ایک چھوڑ دو دو کان تھے اور بہرا
زمین، آسمان، چاند، سورج، ستارے، جنگل، دریا، میدان، انواع و اقسام کے
درخت، پھل پھول کھانے کو الوانِ نعمت، پہننے کو رنگا رنگ خلعت، جواہر بیش بہا،
نقرہ و طلا، دنیا بھر کا سامان ہم نے تیرے واسطے مہیا کیا اور ایک تیرے دم کیلئے اس قدر
لوازمہ بہم پہنچایا، ہم کو یہاں تک تیری خاطر عزیز اور تو ہم سے منحرف، ہم کو اس قدر
تیری بزرگ داشت ملحوظ اور تو ہم سے برگشتہ ۔ ہم چاہتے تو ایک ادنیٰ سی چیونٹی
تیرے ہلاک کرنے کو کافی تھی، ہم حفاظت نہ کرتے تو خود تیرے جسم میں فساد کا مادہ
ایسا تھا کہ ایک ذرا سا روگ تیرے فنا کر دینے کو بہت تھا مگر ہم تجھ سے دوستی کرتے تھے
اور تو ہم سے عداوت ۔ ہم عنایت کرتے تھے اور تو بغاوت ۔ کیا یہی تھا بدلہ جو تو نے
ہم کو دیا ۔ کیا یہی تھا صلہ جو تجھ سے ہم کو ملا ۔ ہم نے تجھکو دنیا میں بھیجتے وقت کیسا
تاکید کی تھی کہ دیکھ روح ایک جوہر لطیف ہے اور مجھ کو بہت ہی عزیز ہے ایسا نہ کرنا
کہ اس کو دنیا میں جا کر بگاڑ لائے ۔ یہ میری عمدہ امانت اور نفیس ودیعت ہے،
دیکھ اس کی احتیاط کما ینبغی اور حفاظت کما حقہ کیجیو، جیسا اُجلا، شفاف، بُراق،
روشن یہاں سے لئے جاتا ہے ایسا ہی دیکھ لوں گا ۔ آج تو اسے روسیاہ اُس کو لایا ہے
یونہ سے بدتر اور ٹھیکری سے کمتر بنا کر نجس، ناپاک، تیرہ، بے آب، بے رونق خراب
ہم نے تجھ سے چلتے چلتے کہدیا تھا کہ تو دنیا میں دل مت لگائیو اور اس طرح رہیو
جیسے سرائے میں مسافر ۔ تو وہاں گیا تو بس وہیں کا ہو رہا اور ایسی لمبی تان کر
سو یا کہ قبر میں آکر جاگا ۔ تھا تو مسافر اور بن بیٹھا مقیم، تھا تو سیاح اور ہو گیا متوطن
کیا تو تمام عمر دنیا میں مال نہیں جمع کرتا رہا اور کیا تو نے پکی پکی عمارتیں اس خیال سے
نہیں بنوائیں کہ مدتوں اُن میں رہیگا ۔ مسافر کا یہی کام ہے، سیاح کا یہی شیوہ

تو تو جانتا تھا کہ تجھکو یہاں لوٹ کر آنا ہے، پھر مرنے کے نام سے تجھکو موت کیوں آتی تھی اور چلنے کی خبر سنکر تو مچلتا کیوں تھا۔ اوّل تو تجھکو ہماری عبادت کا اتفاق ہی نہیں ہوا۔ لیکن جب کبھی تو لوگوں کی شرم حضور یا دکھا دے یا اتباع رسم کی وجہ سے مصروفِ عبادت ہوا بھی تو کس طرح کہ دل کہیں تھا اور تو کہیں، کوئی نماز بھی تیری سجدۂ سہو سے خالی تھی۔ دنیا کی برسوں کی بھولی بسری باتیں تجھکو نماز میں یاد آتی تھیں اور نماز تو کیا پڑھتا تھا گھاس کاٹتا تھا۔ نہ تعدیلِ ارکان ٹھیک، نہ قومہ درست، نہ قعدہ صحیح۔ برس بھر تو دوزخ شکم کو اناپ شناپ بھرتا رہتا تھا، برسویں دن صرف ایک مہینے کے روزے رکھنے کا ہم نے تجھکو حکم دیا تھا کہ تجھکو ہماری نعمتوں کی قدر ہو، تجھکو اپنے ابنائے جنس پر جو مبتلائے مصیبت ہیں رحم آئے اور تیری صحتِ بدنی کو بھی نفع پہنچے، تیرے مزاج میں فروتنی اور انکسار کی صفتِ محمودہ پیدا ہو کہ یہ ادا ہم کو بہت بھاتی ہے پیدا ہو لیکن یوں دنیا کے کام دھندے میں تو تو دن دن بھر بے آب و دانہ مصروف رہا نہ شکوہ نہ گلہ، تازہ دم، ہشاش بشاش، پھر کھانا کھونے کو موجود، مگر روزہ چونکہ ہمارے حکم سے تھا، دن میں سیکڑوں مرتبہ تو پیاس کی شکایت اور جو آیا اس سے ضعف و ناتوانی کی حکایت العطش اور الجوع یہی تیرے دو وظیفے تھے۔ روزہ افطار کیا اور تو بدحواس ہو کر چارپائی پر ایسا گرا کہ گویا جان نہیں، باوجودیکہ تو دو دو دن کا کھانا ایک ہی رات میں کھا لیتا تھا، پھر بھی اس تصور سے کہ کل پھر روزہ رکھنا ہے، تیری جوع البقر کو کسی چیز سے سیری نہیں ہوتی تھی۔ تو عید کا اس طرح منتظر رہتا تھا جیسے کوئی قیدی تاریخ رہائی کا۔ تیرا بس چلتا تو وہ کیا دا کی عید کرتا۔ کیا ایسے ہی روزوں کے ثواب کا تو اُمیدوار اور اجر کا متوقع ہے۔ میں نے تجھکو انسان بنا کر بھیجا تاکہ مصیبت زدوں کی ہمدردی کرے مگر تو نے

ایسی تن آسانی اختیار کی کہ راحت پہنچانا تو درکنار، دوسروں کو تکلیف دیکر بھی اپنی آسائش حاصل کرنے میں تجھکو باک نہ تھا۔ تیرے ہمسائے میں ہمارے بندے رات کو فاقے سے سوتے تھے اور تجھکو سوءِ ہضم کے علاج سے اُن کی پرداخت کی پروا نہ تھی تیرے پڑوس میں ایسے لوگ بھی تھے کہ جاڑے کی لمبی راتیں آگ تاپ تاپ کر سحر کرتے اور تو دوہرے دوہرے لحاف اور بھاری بھاری توشکوں میں چین سے پاؤں پھیلا کر سوتا، نعمت، مال و دولت جو ہم نے تجھکو عطا کی تھی تو نے تکلفاتِ لایعنی اور نمود و نمائش کی غیر ضروری چیزوں میں بہت کچھ تلف کی اور جو لوگ اُس کے سخت حاجتمند تھے ترستے کے ترستے رہ گئے۔ تیری سب خباثتیں مجھ کو معلوم ہیں، تو نے درماندگی کا نام خدا رکھ چھوڑا تھا۔ جب تک سعی و تدبیر سے تجھکو کاربرآری کی امید ہوتی تھی، تجھکو ہرگز پروا نہیں ہوتی تھی کہ خدا بھی کوئی چیز ہے اور انتظامی دنیا میں اُس کو بھی کچھ دخل ہے، مگر ہاں جب تو عاجز اور درماندہ ہوتا تھا، تب تو خدا کو یاد کرتا تھا، اگر ہماری خدائی اور سلطنت تیری فرمانبرداری کی محتاج ہوتی تو تو نے اُسکے اُٹھا دینے میں کچھ کوتاہی نہیں کی۔ تو نے ہمارے فرمان واجب الاذعان کی بے حرمتی اور احکام لازم الاحترام کی بے توقیری کی اور تو نے اپنا بُرا نمونہ دکھا کر میرے دوسرے بندوں یعنی اپنے فرزندوں کو بھی گمراہ کیا، ہر روز تو لوگوں کو مرتے دیکھتا اور سُنتا تھا، کیا تجھکو نہیں سمجھنا چاہیے تھا کہ ایک دن تو بھی مریگا۔ خود تیری حالت میں کتنے کتنے انقلاب واقع ہوئے، لڑکے سے جوان ہوا، جوان سے بڈھا ناتوان، بال تیرے سفید ہوئے، دانت تیرے ٹوٹے، کمر تیری جھکی، قوتوں میں تیری فتور آیا، غرض ہم نے تجھکو سوتا دیکھکر بہتیرا جھنجھوڑا، بہتیرے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے ڈالے کئی بار اُٹھا اُٹھا کر بٹھا دیا گر تیرے نصیب کچھ ایسے سوتے تھے کہ تو نے کروٹ ہی نہ لی سہ۔

تمامی عمر تو غفلت میں سویا ہمارا کیا کیا کچھ اپنا کھو یا

سخت گیری خود ہماری عادت نہیں اور سخت گیری ہم کریں بھی تو کس پر، اپنے بندوں پر، جن کا مارنا اور جلانا ہر وقت ہمارے اختیار میں ہے، مگر جب بندہ بندہ ہو اور ہم کو اپنا مالک سمجھے، نہ خرنا شخص کہ ہم تو دیں نوں اور وہ کہے کہ آنکھیں پھوٹیں۔ ہم سے زیادہ بھی کوئی درگزر کرنے والا ہوگا کہ ایک معذرت پر عمر بھر کے گناہوں کو ہم نے قاطبتہً بھلا بھلا دیا ہے۔ لیکن توبہ واستغفار، ندامت وحسرت کا اظہار بھی تو کوئی کرے، ہماری رحمت حیلہ جو، ہماری رافت بہانہ طلب کتنی کتنی بار جوش میں آئی مگر ہم نے اُس کو صرف کرنے کا موقع نہ پایا۔ اگر بندہ ہمارے ساتھ نسبتِ عبودیت صحیح رکھتا تو ہم اُس کی لاکھ برائیوں پر خاک ڈالتے۔ ہم کو تو بڑی شکایت یہی ہے کہ اُس نے ہم کو معبود ہی نہ گردانا۔ عالم اسباب میں رہ کر اسباب پرست ہوگیا۔ پھر ہم جو دیکھتے ہیں تو ہمارے احکام بھی کچھ سخت نہ تھے۔ کھانے کو ہم نے نہیں روکا، سونے کو ہم نے منع نہیں کیا۔ تمتعاتِ دنیوی سے ہم نے باز نہیں رکھا، پھر جو تو نے اُن کی بجا آوری نکی تو سوائے تیری بدنفسی کے اور تو کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ اے شخص جس نجات کا تو اب نہایت آرزومندی کے ساتھ خواہاں ہے، اے کاش زندگی میں تجھ کو اُس کی اتنی ہی پرواہ ہوتی جیسے اُردو پر سفیدی۔ دنیا کے چھوٹے چھوٹے نقصان اور ذرا ذرا سے زیاں تجھ کو مضطر اور بے چین کر دیا کرتے تھے۔ اگرچہ کیا دنیا اور کیا دنیا کا خسارہ؟ کیا بدّی اور کیا بدّی کا شوربا لیکن تباہیِ دین کی تجھ کو خبر تک بھی تو نہیں ہوئی۔ اے کاش تجھکو نماز کے قضا ہونے کا اتنا ہی رنج ہوتا جتنا ایک مٹی کے پرانے آبخورے کے ٹوٹ جانے کا ہوتا تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ اب تجھکو بہت ہی بڑی ندامت ہے، لیکن اِس ندامت کا کچھ ماحصل نہیں، اِس واسطے کہ یہ دارالجزا ہے، دارالعمل نہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ تو ایک بات کا جواب بھی نہیں دے سکتا لیکن حجت تمام کرنے کی نظر سے ہم تجھکو مہلت دیتے ہیں، جا اپنے نامۂ اعمال کو دیکھ اور اچھی طرح سوچ سمجھکر کوئی بات ہم سے بیان کر بشرطیکہ معقول اور قابلِ قبول ہو۔"

اس مضمون میں تینوں نتائج متذکرہ بالا کے لحاظ سے سب خوبیاں موجود ہیں۔ یعنی اس میں محاکات بدرجۂ کمال پائی جاتی ہیں اور تخئیل بھی ہے اگرچہ مضمون نہایت عام ہے اور ہر مسلمان اس کو خوب جانتا ہے اور اسکو خوبی کے ساتھ ادا کرنا مشکل بھی ہے لیکن مولانا نے ایسا خوب لکھا ہے کہ اس طرز سے بہتر ایسے مشہور و معروف مضمون کا ادا کیا جانا ممکن نہیں ہے۔ تخئیل سے کام لیکر ......

...... مولوی نذیر احمد صاحب نے خدائے عزّ و جل کی عدالت العالیہ قائم کی اور وہی الفاظ استعمال کئے ہیں جو اس دنیا کی عدالتوں اور کچہریوں میں روزانہ لکھے اور بولے جاتے ہیں۔ خواب میں جیسا کہ سب لوگ جانتے ہیں ناممکن باتیں بھی ممکن الوقوع ہو جاتی ہیں پس ما ڈیس کے یہے بھی جائے اعتراض باقی نہ رہی۔ جو لوگ حشر و نشر کا یقین رکھتے ہیں اُن کی آنکھوں کے سامنے روزِ قیامت کی تصویر کھینچدی ہے۔ مخئیل مشہور سنگ تراش، نقاش، مصوّر اور شاعر نے "میدانِ حشر کی تصویر" کامل آٹھ برس میں تیار کی تھی جسکی وجہ سے وہ دنیا میں لاجواب مصوّر مانا گیا ہے مولانا کو شاید اس مضمون کے لکھنے میں آٹھ دن بھی نہ لگے ہونگے لیکن مولانا کی تصویر مخئیل کی تصویر سے زیادہ صاف، زیادہ واضح اور مکمل ہے کیونکہ اپنے خیالات اور احساسات کو جس خوبی سے ادا کیا گیا ہے تصویر میں ان کو دکھایا ہی نہیں جا سکتا۔ روانی اور برجستگی الفاظ سے ہویدا ہے۔ اثر بھی کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے۔ القصہ جو ماحصل تھا وہ پورا ہو گیا۔ مجموعی حیثیت سے یہ مضمون بے نظیر ہے۔ اور انشا پردازی اسی کا نام ہے لیکن چند محاورے اور الفاظ ایسے آ گئے ہیں کہ ایک تبصرہ نگار کی حیثیت سے

مضمون نگار کی رائے نصوح کے خواب پر

الفاظ اور محاورات کا بے محل استعمال

ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ ہم اُن کا بھی اظہار کر دیں کیونکہ وہ موقع اور محل کے لحاظ سے مناسب نہیں ہیں۔

(۱) "بیٹیا۔ جناب وہ کون لوگ ہیں جو آپ کی مخالفت پر آمادہ ہیں؟

باپ۔ اوّل تو دو شخص کراماً کاتبین اس بلا کے ہیں کہ میرا کوئی فعل اُن سے مخفی نہیں......"

کراماً کاتبین کے لئے "دو شخص" کا لفظ غلط ہے "دو فرشتے" ہونا چاہیے تھا۔ کیونکہ وہ شخص نہیں ہیں بلکہ فرشتے ہیں۔

(۲) "کئی بار اُٹھا اُٹھا کر بٹھا دیا مگر تیرے نصیب کچھ ایسے سوتے تھے کہ تو نے ہی کروٹ نہ لی"۔

یہاں یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ جب کئی بار اُٹھا اُٹھا کر بٹھا دیا تو کروٹ نہ لینا کیا معنی۔ کروٹ نہ لینا ایک محاورہ ہے جسکے معنی ہیں ٹس سے مس نہ ہونا۔ لیکن اُس کو حرکت دی جا چکی ہے اُسکو کئی بار اُٹھا اُٹھا کر بٹھا یا گیا ہے۔ اس موقع پر سونے کی رعایت سے اگر کہا جاتا "کہ تو ہی نہ جاگا" تو زیادہ موزوں ہوتا

یہاں اس امر کا ذکر کر دینا ضروری ہے کہ مولوی نذیر احمد صاحب کی تحریرات میں محاوروں کی بوچھار ہوتی ہے وہ محاورہ کی خاطر متانت اور سنجیدگی کو خیر باد کہکر پھکڑ بازی پر اُتر آتے ہیں۔ اور یہہ اُن میں ایک نقص ہے اور بڑا نقص ہے انھیں محاورات کے بے موقع استعمال سے بعض بعض جگہ اُن کے ناظرین تلخ کام ہوتے ہیں اور سارا مزہ کرکرا ہو جاتا ہے۔

(۳) "نہ نرا مشخص کہ ہم تو دیں نون اور وہ کہے کہ آنکھیں پھوٹیں"۔

خدائے تعالیٰ کی زبان سے غیظ و غضب میں بھی ایسے الفاظ جاری ہونا موقع اور محل کے لحاظ سے بالکل نامناسب ہیں۔ وقار اور متانت کو ہاتھ سے نہیں دینا چاہیئے تھا۔ خدا کی گفتگو سوقیانہ الفاظ میں کبھی نہ ادا ہونی چاہیئے۔

(۴) "اگرچہ کیا دنیا اور کیا دنیا کا خسارہ! کیا بدی اور کیا بدی کا شور رہا"
یہہ پڑھکر بے اختیار ہنسی آجاتی ۔یہاں مولانا نذیر احمد اپنے جوش و خروش میں
اپنے ناظرین کو اس قدر متاثر کیے بغیر کہ الفاظ کے حسن و قبح کا خیال باقی نہ رہے
بہت آگے چلے گئے ہیں ۔یعنی اُن کے ناظرین اسقدر اثر پذیر نہیں ہیں جسقدر کہ وہ
خود متاثر ہوگئے ہیں ۔پس ایسے محاورات کا استعمال ایسے موقع پر اصولِ انشا پردازی کے
بالکل خلاف ہے ۔تمام مضمون پڑھکر جو اثر پیدا ہوتا ہے وہ اس محاورہ کی بدولت
ہنسی میں رفوچکر ہوجاتا ہے یا اتنا گہرا اثر باقی نہیں رہتا جتنا کہ دلوں میں سرایت
کرچکا تھا ۔اگر یہہ دونوں محاورے مضموں میں سے نکال دئے جائیں تو مطلب
سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہوگی اور مضمون کا اثر بیش از بیش ہو جائیگا ۔یہ دونوں
محاورے بالکل غیر ضروری ہیں ۔

مولانا شبلی کی بہترین تصنیف سیرت النبیؐ ہے، ہم اُس کے دیباچہ سے
کچھ عبارت بطور نمونہ نقل کرتے ہیں:۔

سیرت نبوی کی تالیف کی ضرورت

"عالم کائنات کا سب سے بڑا مقدم فرض، اور سب سے زیادہ مقدس خدمت
یہ ہے کہ نفوسِ انسانی کے اخلاق و تربیت کی اِصلاح و تکمیل کی جائے ۔یعنی پہلے
ہر قسم کے فضائلِ اخلاق، زہد و تقویٰ، عصمت و عفاف، احسان و کرم، حلم و عفو،
عزم و ثبات، ایثار و لطف، غیرت و استغنا کے اصول و فروع نہایت صحیح طریقہ سے
قائم کئے جائیں، اور پھر تمام عالم میں اُن کی عملی تعلیم رائج کی جائے ۔

اس مقصد کے حصول کا عام طریقہ وعظ و پند ہے ۔اس سے زیادہ متمدن
طریقہ یہہ ہے کہ فنِ اخلاق میں اعلیٰ درجہ کی کتابیں لکھی جاکر تمام ملک میں پھیلائی
جائیں، اور لوگوں کو ان کی تعلیم دلائی جائے، ایک طریقہ یہ ہے کہ لوگوں سے بہ جبر
محاسنِ اخلاق کی تعمیل کرائی جائے اور رذائل سے روکے جائیں ۔

یہی طریقے ہیں جو ابتدا سے آج تک تمام دُنیا میں جاری ہیں، اور آج اِس انتہائی ترقی یافتہ دور میں بھی اِس سے زیادہ کچھ نہیں کیا جاسکتا، لیکن سب سے زیادہ صحیح، سب سے زیادہ کامل، سب سے زیادہ عملی طریقہ یہ ہے، کہ نہ زبان سے کچھ کہا جائے، نہ تحریری نقوش پیش کئے جائیں، نہ جبر وزور سے کام لیا جائے، بلکہ فضائلِ اخلاق کا ایک پیکرِ مجسم سامنے آجائے جو خود ہمہ تن آئینۂ عمل ہو، جس کی ہر جنبشِ لب ہزاروں تصنیفات کا کام دے، اور جس کا ایک ایک اشارہ، اوامرِ سلطانی بن جائے۔ دنیا میں آج اخلاق کا جو سرمایہ ہے، سب انہی نفوسِ قدسیہ کا پرتو ہے، دیگر اسباب صرف ایوانِ تمدن کے نقش و نگار ہیں لیکن اسوقت تک دنیا کی جس قدر تاریخ معلوم ہے، اُس نے اِس قسم کے نفوسِ قدسیہ جو پیش کئے ہیں، وہ فضائلِ اخلاق کی کسی خاص صنف کے نمونے تھے مثلاً جنابِ مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مکتب درس میں صرف حلم وتحمل، صلح وعفو، قناعت وتواضع کی تعلیم ہوتی تھی، حکومت وفرمانروائی کے لئے جو فضائلِ اخلاق درکار ہیں، مسیحی تعلیم کی بیاض میں اِن سطروں کی جگہ سادی ہے۔ حضرت موسیٰ اور نوح علیہما السلام کے اوراقِ تعلیم میں عفوِ عام کے صفحے خالی ہیں۔ اِس بنا پر ہر قدم نئے نئے رہنما کی ضرورت پیش آئی، اور اِس لئے عالمِ انسانی اپنی تکمیل کے لئے ہمیشہ ایسے جامع کا محتاج رہا جو صاحبِ شمشیر ونگین بھی ہو، اور گوشہ نشیں بھی، بادشاہِ کشورکشا بھی ہو اور گدا بھی، فرمانروائے جہاں بھی ہو اور بحر گرداں بھی، مفلسِ قانع بھی ہو اور غنیِ دریا دل بھی، یہ برزخِ کامل، یہ ہستیِ جامع، یہ صحیفۂ یزدانی، عالمِ کون کی آخری معراج ہے، اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ۔

عالمِ فانی کی کوئی چیز ابدی نہیں، اِس لئے یہ ہستیِ جامع، دنیا میں آکر ہمیشہ نہیں رہ سکتی۔ اِس لئے ضرور ہے کہ اُسکی زبان کا ایک ایک حرف اُسکی

حرکات و سکنات کی ایک ایک ادا، اُس کے حلیۂ وجود کے ایک ایک خط و خال کا عکس لے لیا جائے کہ مراحلِ زندگی میں جہاں ضرورت پیش آئے رہنمائی کے کام آئے۔ لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس طرح دیگر تمام بانیانِ مذہب جامعیتِ کبریٰ کے وصف سے خالی تھے اُن کے کارنامۂ زندگی کی تصویریں بھی ناتمام رہ گئیں جنابِ مسیح کی ۳۳ سالہ زندگی میں سے صرف تین برس کے حالات معلوم ہیں۔ پارس کے مصلحانِ دین صرف شاہنامہ کے ذریعہ سے روشناس ہیں، ہندوستان کے پیغمبر افسانوں کے حجاب میں گم ہیں، حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی نسبت آج جو کچھ معلوم ہے اُس کا ذریعہ صرف موجودہ توراۃ ہے، جو حضرتِ موسیٰ کے تین سو برس بعد عالمِ وجود میں آئی۔ یہ قدرت کی طرف سے اشارہ تھا کہ ان کے کارنامے اور اصولِ تعلیم ابدی نہ تھے، اس لئے نقل و روایت کے آئینہ میں جس قدر اُن کا ناتمام عکس اُترا اُس سے زیادہ ضروری بھی نہ تھا۔ قدرت، خود ضرورت کی اندازہ داں ہے، اور جب جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے وہ خود مہیا کر دیتی ہے۔

تمام اربابِ مذاہب میں سے ہر ایک کو اپنا مذہب اُسی قدر عزیز ہے جس قدر دوسرے کو ہے، اس لئے اگر بے پردہ یہ سوال کیا جائے کہ دنیا میں کون ہستی تھی جس میں جامعیتِ کبریٰ کا وصف نمایاں تھا؟ تو ہر طرف سے مختلف صدائیں آئینگی، لیکن اگر یہی سوال اس پیرایہ میں بدل دیا جائے، کہ دنیا میں وہ کون شخص گزرا ہے جس کا کارنامۂ زندگی، اس طرح قلمبند ہوا کہ ایک طرف تو صحت کا یہ انتظام تھا کہ کسی صحیفۂ آسمانی کے لئے بھی نہ ہو سکا، اور دوسری طرف وسعت اور تفصیل کے لحاظ سے یہ حالت ہے کہ اقوال و افعال، وضع و قطع، شکل و شباہت، رفتار و گفتار، مذاقِ طبیعت، اندازِ گفتگو، طرزِ زندگی، طریقِ معاشرت کھانے پینے، چلنے پھرنے، اُٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے، ہنسنے بولنے کی ایک ایک ادا

محفوظ رہ گئی، تو اس سوال کے جواب میں صرف ایک صدا بلند ہو سکتی ہے (محمدؐ عربی فداہ ابی و امی)۔

علمی حیثیت

یہ جو کچھ کہا گیا، مقصدِ تصنیف کا مذہبی پہلو تھا، اسی مسئلہ کو علمی حیثیت سے دیکھو، علوم و فنون کی صف میں سیرت (بیوگرافی) کا ایک خاص درجہ ہے، ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کے حالاتِ زندگی بھی حقیقت شناسی اور عبرت پذیری کے لئے دلیلِ راہ ہیں، چھوٹے سے چھوٹا انسان بھی کیسی عجیب خواہشیں رکھتا ہے، کیا کیا منصوبے باندھتا ہے، اپنے چھوٹے سے دائرۂ عمل میں کس طرح آگے بڑھتا ہے، کیونکر ترقی کے زینوں پر چڑھتا ہے، کہاں کہاں ٹھوکریں کھاتا ہے، کیا کیا مزاحمتیں اٹھاتا ہے، تھک کر بیٹھ جاتا ہے، سستاتا ہے، اور پھر آگے بڑھتا ہے، غرض سعی و عمل، جد و جہد، ہمت و غیرت کی جو عجیب و غریب نیرنگیاں سکندرِ اعظم کے کارنامۂ زندگی میں موجود ہیں، بعینہٖ یہی منظر ایک غریب مزدور کے عرصۂ حیات میں بھی نظر آتا ہے۔

اس بنا پر اگر سیرت اور سوانح کا فن، عبرت پذیری اور نتیجہ رسی کی غرض سے درکار ہے تو "شخص" کا سوال نظرانداز ہو جاتا ہے، صرف یہ دیکھنا رہ جاتا ہے کہ حالات اور واقعات جو ہاتھ آتے ہیں، وہ کس وسعت اور استقصاء و تفصیل کے ساتھ ہاتھ آتے ہیں، تاکہ مراحلِ زندگی کی تمام راہیں، اور اُن کے پیچ و خم ایک ایک کر کے نظر کے سامنے آجائیں، لیکن اگر خوش قسمتی سے فردِ کامل اور مفصل واقعات دونوں باتیں جمع ہو جائیں تو اس سے بڑھ کر اس فن کی کیا خوش قسمتی ہو سکتی ہے۔

وجوہِ مذکورۂ بالا کی بنا پر کون شخص انکار کر سکتا ہے کہ صرف ہم مسلمانوں کو نہیں، بلکہ تمام عالم کو اُس وجودِ مقدس کی سوانحِ عمری کی ضرورت ہے

جس کا نامِ مبارک "محمد" (رسول اللہ ہے) اللھم صل علیہ وسلم صلوٰۃ کثیراً کثیراً،
یہ ضرورت صرف اسلامی یا مذہبی ضرورت نہیں ہے، بلکہ ایک علمی ضرورت
ہے، ایک اخلاقی ضرورت ہے، ایک تمدنی ضرورت ہے، ایک ادبی ضرورت ہے،
اور مختصر یہ ہے کہ مجموعۂ ضروریاتِ دینی ودنیوی ہے۔

میں اِس بات سے ناواقف نہ تھا کہ اسلام کی حیثیت سے میرا فرضِ اولین
یہی تھا کہ تمام تصنیفات سے پہلے میں سیرتِ نبوی کی خدمت انجام دیتا۔ لیکن
یہ ایک ایسا اہم اور نازک فرض تھا کہ میں مدت تک اس کے ادا کرنے کی جرأت
نہ کر سکا، تاہم میں دیکھ رہا تھا کہ اِس فرض کے ادا کرنے کی ضرورتیں بڑھتی
جاتی ہیں۔

علم کلام کی حیثیت سے سیرت کی ضرورت

اگلے زمانہ میں سیرت کی ضرورت، صرف تاریخ اور واقعہ نگاری کی حیثیت سے
تھی، علمِ کلام سے اِس کو واسطہ نہ تھا، لیکن معترضین حال کہتے ہیں کہ اگر مذہب،
صرف خدا کے اعتراف کا نام ہے تو بحث یہیں تک رہ جاتی ہے۔ لیکن جب اقرارِ نبوت
بھی جزوِ مذہب ہے تو یہ بحث پیش آتی ہے کہ جو شخص حاملِ وحی اور سفیرِ الٰہی تھا
اُس کے حالات اخلاق اور عادات کیا تھے؟

یورپ کے مورخین، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو اخلاقی تصویر کھینچتے ہیں
وہ (نعوذ باللہ) ہر قسم کے معائب کا مرقع ہوتی ہے۔ آجکل مسلمانوں کو جدید ضرورتوں نے
عربی علوم سے بالکل محروم کر دیا ہے، اِس لئے اِس گروہ کو اگر کبھی پیغمبرِ اسلام کے
حالات اور سوانح کے دریافت کرنیکا شوق ہوتا ہے تو اُنہی یورپ کی تصنیفات کی
طرف رجوع کرنا پڑتا ہے، اس طرح یہ زہر آلود معلومات آہستہ آہستہ اثر
کرتی جاتی ہیں، اور لوگوں کو خبر تک نہیں ہوتی، یہاں تک کہ ملک میں ایک ایسا
گروہ پیدا ہو گیا ہے جو پیغمبرؐ کو محض ایک مصلح سمجھتا ہے جس نے اگر مجمعِ انسانی

میں کوئی اصلاح کردی تو اُس کا فرض ادا ہوگیا - اس بات سے اُس کے منصب نبوت میں فرق نہیں آتا کہ اُسکے دامن اخلاق پر معصیت کے دھبے بھی ہیں -

یہ واقعات تھے جنھوں نے مجھکو بالآخر مجبور کیا، اور میں نے سیرتِ نبوی پر ایک بسوط کتاب لکھنے کا ارادہ کرلیا - یہ کام بظاہر نہایت آسان تھا، عربی زبان میں سینکڑوں کتابیں موجود ہیں، اُن کو سامنے رکھکر ایک ضخیم اور دلچسپ کتاب لکھدینا زیادہ سے زیادہ چند مہینوں کا کام تھا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ کوئی تصنیف اس تصنیف سے زیادہ دیرطلب اور جامع مشکلات نہیں ہوسکتی"

سیرت نبوی کی تالیف کی ضرورت پر اظہار رائے

سیرتِ نبوی کی تالیف کی ضرورت اس عمدگی کے ساتھ دکھائی گئی ہے کہ کسی کو بھی اس کے تسلیم کرنے میں تامل نہیں ہوسکتا - الفاظ شاندار ہیں ور کانوں کو خوشگوار معلوم ہوتے ہیں - علمیت ٹپکی پڑتی ہے - متانت حد سے زیادہ ہے - استدلال کا طریقہ نہایت عمدہ ہے - اپنے احساس کو کس خوبی سے محسوس کرایا ہی کیا قابلِ تعریف نتیجہ اخذ کیا ہے "اس لئے نقل و روایت کے آئینہ میں جس قدر اُن کا ناتمام عکس اُترا اُس سے زیادہ ضروری بھی نہ تھا - قدرت، خود ضرورت کی اندازہ داں ہے اور جب جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے وہ خود مہیا کردیتی ہے" علمی حیثیت سے جو سیرت النبی کی تالیف کی ضرورت دکھائی ہے وہ بھی خوب ہے مسلمان تو اس تمام مضمون کو پڑھکر جھومنے لگتا ہے لیکن عام ناظرین پر بھی یہ عبارت اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہ سکتی - فی الحقیقت جو کچھ مولانا شبلی کے دل میں جاگزیں تھا اُس کا اظہار کردیا ہے - ع

کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کے

اس لئے اس تحریر میں اثر پیدا ہونا لازمی ہے - انشاپردازی اس سے زیادہ اور کیا دکھا سکتی ہے ؟ -

عجیب بات ہے کہ جس مضمون کی تعریف میں ہم رطب اللساں ہیں جب اُنکی تحلیل و تقسیم کی جاتی ہے تو اُس میں کچھ خرابیاں بھی نظر آنے لگتی ہیں، چنانچہ اِس تحریر میں بھی بعض الفاظ ایسے استعمال کئے گئے ہیں جو اُکھڑے اُکھڑے معلوم ہوتے ہیں۔ اِس مضمون کی پہلی ہی سطر اگرچہ مہتم بالشان ہے لیکن 'مقدم' اور 'مقدس' کے ساتھ الفاظ 'سب سے بڑا' اور 'سب سے زیادہ' استعمال کرنے کی چنداں ضرورت نہ تھی کیونکہ 'مقدم' وہی ہے جو سب سے پہلے ہو، چھوٹے اور بڑے کا کیا ذکر اور 'مقدس' ہمیشہ مقدس ہے کم اور زیادہ مقدار کیا؟ 'عالمِ کائنات' سے اگر اہلِ عالم مراد ہیں تو فعل مجہول نہ لانا چاہیئے تھا یعنی "کہ نفوسِ انسانی کے اخلاق و تربیت کی اصلاح و تکمیل کی جائے" کے بجائے "کہ وہ نفوسِ انسانی کے اخلاق و تربیت کی اصلاح و تکمیل کرے" ہونا چاہیے تاکہ مطلب سمجھنے میں کسی قسم کی دقت اور رکاوٹ نہ ہو۔ اِسی فقرہ کے بعد 'یعنی' کا لفظ بے موقع اور بے محل ہے۔ جو بات پہلے کہی گئی ہے 'یعنی' سے اُسی مطلب کو سمجھانا مقصود ہوتا ہے حالانکہ دوسرا فقرہ معلول ہے اور پہلا علت۔ جب دنیا کی علتِ غائی یہ ہے کہ وہ نفوسِ انسانی کے اخلاق و تربیت کی اصلاح و تکمیل کرے تو نتیجتاً اُسکو چاہیے کہ وہ ہر قسم کے فضائلِ اخلاق کے اصول و فروع نہایت صحیح طریقہ سے قائم کرے اور پھر تمام عالم میں اُن کی عملی تعلیم رائج کرے۔ پس 'یعنی' کی جگہ 'لہذا' یا 'اِس لئے' کا لفظ ہوتا تو خوب ہوتا کیونکہ مطلب آسانی سے سمجھ میں آجاتا۔

آگے چل کر جس ترتیب سے الفاظ "صاحب شمشیر و نگیں بھی ہو، اور گوشہ نشین بھی، بادشاہِ کشور کشا بھی ہو اور گدا بھی، فرمانروائے جہاں بھی ہو اور سجہ گرداں بھی" استعمال کئے گئے ہیں وہاں اُس ترتیب کو بدل دینا اور یہ کہنا کہ "مفلسِ قانع بھی ہو اور غنی دریادل بھی" مناسب نہیں ہے بلکہ اُسی ترتیب کو

قائم رکھکر "غنیِ دریا دل بھی ہو اور مفلس قانع بھی" کہنا چاہیے تھا۔ علاوہ اس بے ترتیبی کے، صاحبِ مضمون جو متضاد الفاظ استعمال کرنا چاہتا ہے وہ بعض بعض جگہ متضاد نہیں رہے بلکہ صرف مختلف ہو گئے ہیں۔ مثلاً "صاحبِ شمشیر و نگین" اور "گوشہ نشیں"، متضاد نہیں ہیں بلکہ مختلف ہیں۔ نیز اس فقرہ میں کہ "بادشاہِ کشور کشا بھی ہو اور گدا بھی" لفظ گدا قابل اعتراض ہے۔ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم 'سائل' نہ تھے اگرچہ فقر و فاقہ سے زندگی بسر کرتے تھے۔ گدا کے لفظ سے یہ پہلوئے ذم بھی نکلتا ہے۔

مولانا حالی کا مضمون "زبانِ گویا" زبان زدِ خاص و عام ہے لہذا ہم اسکو یہاں نقل کرتے ہیں:-

"اے میری بلبلِ ہزار داستاں! اے میری طوطیِ شیوا بیاں! اے میری قاصد! اے میری ترجمان! اے میری وکیل! اے میری زبان! سچ بتا تو کس درخت کی ٹہنی اور کس چمن کا پودا ہے؟ کہ تیرے ہر پھول کا رنگ جدا اور تیرے ہر پھل میں ایک نیا مزا ہے۔ کبھی تو ایک ساحرِ فسوں ساز ہے، جس کے سحر کا رد، نہ جادو کا اتار، کبھی تو ایک افعیِ جاں گداز ہے، جسکے زہر کی دارو، نہ کاٹے کا منتر۔ تو وہی زبان ہے کہ بچپن میں کبھی اپنے ادھورے بولوں سے غیروں کا جی لبھاتی تھی اور کبھی اپنی شوخیوں سے ماں باپ کا دل دکھاتی تھی۔ تو وہی زبان ہے کہ جوانی میں کہیں اپنی نرمی سے دلوں کا شکار کرتی تھی اور کہیں اپنی تیزی سے سینوں کو فگار کرتی تھی۔

اے میری زبان! دشمن کو دوست بنانا اور دوست کو دشمن کر دکھانا تیرا ایک کھیل ہے۔ جسکے تماشے سینکڑوں دیکھے اور ہزاروں دیکھنے باقی ہیں۔

اے میری بنی بات کی بگاڑنے والی! اور میرے بگڑے کاموں کی سنوارنے

کہلائیں اور جب تیرے دربار میں آئیں تو سچے بنکر آئیں"۔

زبان گویا پر اپنی رائے کا اظہار

یہ مضمون پڑھکر بے اختیار زبان سے سبحان اللہ اور واہ واہ کے نعرے نکل جاتے ہیں۔ کمال انشاپردازی اسی کو کہتے ہیں کہ الفاظ اور معانی برابر برابر ہوں۔ ایک دوسرے کا ساتھ نہ چھوڑے۔ جو مضمون، صاحب مضمون الفاظ کے ذریعے سے ادا کرنا چاہتا ہو وہ الفاظ اُس کے دل کی پوری پوری ترجمانی کریں اور معانی سے پیچھے نہ رہ جائیں۔ کلام میں کہیں اہمال یا اشکال نہ ہو۔ جس موقع کے لئے جو لفظ موزوں اور مناسب ہو وہی استعمال کیا جائے اور اگر اُسکی جگہ دوسرا لفظ بٹھانا چاہیں تو وہ نہ بیٹھ سکے۔ "زبانِ گویا" کیا خشک اور دل اُکتانے والا مضمون ہے لیکن مضمون نگار نے کیا شاداب سرسبز اور دل چسپ کر دکھایا ہے اور معانی کے دریا بہادئے ہیں۔ محاکات اور تخئیل اس میں دونوں موجود ہیں اور دونوں بدرجۂ اتم۔ اثر جو غائتِ مضمون ہونا چاہیے لفظ لفظ سے پیدا ہے اور زبانِ گویا کی راست گفتاری کی عظمت و اہمیت کا نقش برابر دل و دماغ پر منقوش کر رہا ہے۔ متضاد الفاظ کس خوبی سے ادا ہوئے ہیں، صفائی اور سلاست اس مضمون کا حصہ ہے۔

لیکن۔ اور ہمیشہ نقد و تبصرہ میں "ایک لیکن" بھی ہوتا ہے۔ جہاں مولانا حالی نے لکھا ہے کہ "تو وہی زبان ہے کہ بچپن میں کبھی اپنے ادھورے بولوں سے غیروں کا جی لبھاتی تھی اور کبھی اپنی شوخیوں سے ماں باپ کا دل کھاتی تھی۔ تو وہی زبان ہے کہ جوانی میں کہیں اپنی نرمی سے دلوں کو شکار کرتی تھی اور کہیں اپنی تیزی سے سینوں کو فگار کرتی تھی" وہاں بچپن اور جوانی کے علاوہ بڑھاپے کی زبان کا بھی ذکر ہونا چاہیئے تھا اور اُس کی بھی توصیف و مذمت ہونی چاہیئے تھی کیونکہ انسان کی زندگی کے تین زمانے ہیں، بچپن، جوانی،

بڑھاپا بھر کیا وجہ کر بڑھاپے میں زبان کی جو کیفیت ہوتی ہے وہ نہ دکھائی جائے۔
اس لئے اس موقع پر زبانِ گویا کی تصویر کسی قدر نامکمل ہے۔ اگرچہ صرف ایک
یا دو سطر سے یہ کمی پوری ہو سکتی تھی۔ مثلاً "تو وہی زبان ہے کہ بڑھاپے میں کہیں
اپنی کڑوی پند و نصیحت سے سامعین کو تلخ کام کرتی ہے اور کہیں اپنی شیریں
صلاح و مشورہ سے لوگوں کو شکر وہاں بناتی ہے۔" (یہ جوڑ بلاشبہ زر بفت کے
لباس میں ٹاٹ کا پیوند ہے)۔

اب ہم پروفیسر آزاد کی بہترین تصنیف "آبِ حیات" سے ملک الشعرا خاقانیِ ہند
شیخ ابراہیم ذوق کا حال نقل کرتے ہیں۔ چونکہ ذوق، آزاد کے استادِ شعر تھے
ظاہر ہے کہ انھوں نے اپنے استاد کا حال لکھنے میں انشا پردازی کا کوئی دقیقہ
فروگزاشت نہ کیا ہوگا اور جس قدر ان کی زبان اور ان کا قلم یاری دے سکتا ہوگا
انھوں نے دونوں سے کام لیا ہوگا اور جیسا کہ ناظرین پر جلد منکشف ہو جائیگا انھوں
نے ذوق کی مدح سرائی میں اپنے کمالِ انشا پردازی کو واقعی صرف کیا ہے:۔

شیخ ابراہیم ذوق آبِ حیات۔

"جب وہ صاحبِ کمال عالمِ ارواح سے کشورِ اجسام کی طرف چلا تو فصاحت کے
فرشتوں نے باغِ قدس کے پھولوں کا تاج سجایا۔ جن کی خوشبو شہرتِ عام بنکر
جہاں میں پھیلی اور رنگ نے بقائے دوام سے آنکھوں کو طراوت بخشی۔ وہ تاج
سر پر رکھا گیا تو آبِ حیات اس پر شبنم ہوکر برسا کہ شادابی کو کملاہٹ کا اثر نہ پہنچے
ملک الشعرائی کا سکہ اس کے نام سے موزوں ہوا اور اس کے طغرائے شاہی میں
یہ نقش ہوا کہ اس پر نظمِ اردو کا خاتمہ کیا گیا۔ چنانچہ اب ہرگز امید نہیں کہ ایسا
قادر الکلام پھر ہندوستان میں پیدا ہو۔ سبب اس کا یہ ہے کہ جس باغ کا بلبل تھا
وہ باغ برباد ہو گیا۔ نہ ہم صفیر رہے نہ ہم داستان رہے۔ نہ اس بولی کے
سمجھنے والے رہے۔ جو خراب آباد اس زبان کے لئے ٹکسال تھا۔ وہاں بھانت بھانت کا

جانور بولتا ہے شہر چھاؤنی سے بدتر ہوگیا۔ اُمرائے گھرانے تباہ ہوگئے۔ گھرانوں کے وارث علم و کمال کے ساتھ روٹی سے محروم ہوکر حواس کھو بیٹھے۔ وہ جہاد و کار طبیعتیں کہاں سے آئیں جو بات بات میں دل پسند انداز اور عمدہ تراشیں نکالتی تھیں۔ آج جن لوگوں کو زمانہ کی فارغ البالی نے اس قسم کی ایجاد و اختراع کی فرصتیں دی ہیں۔ وہ اَور اَور اصل کی شاخیں ہیں، اُنھوں نے اور پانی سے نشو و نما پائی ہے۔ وہ اَور ہی ہواؤں میں اُڑ رہے ہیں، پھر اس زبان کی ترقی کا کیا بھروسہ۔

کیسا مبارک زمانہ ہوگا جبکہ شیخ مرحوم اور میرے والد مغفور ہم عمر ہونگے۔ تحصیلِ علمی اُن کی عمروں کی طرح حالتِ طفلی میں ہوگی۔ صرف و نحو کی کتابیں ہاتوں میں ہونگی اور ایک اُستاد کے دامنِ شفقت میں تعلیم پاتے ہوں گے۔ اُن نیک نیت لوگوں کی ہر ایک بات استقلال کی بنیاد پر قائم ہوتی تھی۔ وہ رابطہ اُن کا عمروں کے ساتھ بڑھتا گیا اور اخیر وقت تک ایسا بندھ گیا کہ قرابت سے بھی زیادہ تھا۔ اُن کے تحریرِ حالات میں بعض باتوں کے لکھنے کو لوگ فضول سمجھینگے مگر کیا کروں جی یہی چاہتا ہے کہ کوئی حرف اس گراں بہا داستان کا نہ چھوڑوں۔ یہ شاید اس سبب سے ہو کہ اپنے پیارے اور پیار کرنے والے بزرگ کی ہر بات پیاری ہوتی ہے۔ لیکن نہیں۔ اُس شعر کے پُتلے کا ایک رونگٹا بھی بیکار نہ تھا۔ ایک صنعت کاری کی کل میں کونسے پرزے کو کہہ سکتے ہیں کہ نکال ڈالو، یہ کام کا نہیں اور کون سی حرکت اُس کی ہے جس سے کچھ حکمت انگیز فائدہ نہیں پہنچتا ہے۔ اسی واسطے میں لکھوں گا اور جو بات اُن کے سلسلۂ حالات میں مسلسل ہو سکیگی اُس کا ایک حرف نہ چھوڑوں گا۔

شیخ مرحوم کے والد شیخ محمد رمضان ایک غریب سپاہی تھے۔ مگر زمانہ کے

تجربہ اور بزرگوں کی صحبت نے اُنھیں حالاتِ زمانہ سے ایسا باخبر کر دیا تھا کہ اُن کی زبانی باتیں کتبِ تواریخ کے قیمتی سرمائے تھے۔ وہ دلّی میں کابلی دروازے کے پاس رہتے تھے اور نواب لطف علی خاں نے اُنھیں معتبر اور بالیاقت سمجھکر اپنی حرم سرا کے کار و بار سپرد کر رکھے تھے۔ شیخ علیہ الرحمۃ اُن کے اکلوتے بیٹے تھے کہ سنہ ۱۲۰۴ ہجری میں پیدا ہوئے اُس وقت کسے خبر ہوگی کہ اِس رمضان سے وہ چاند نکلیگا جو آسمانِ سخن پر عید کا چاند ہو کر چمکے گا۔ جب پڑھنے کے قابل ہوئے تو حافظ غلام رسول نام ایک شخص بادشاہی حافظ اِن کے گھر کے پاس رہتے تھے۔ محلّے کے اکثر لڑکے اُنھیں کے پاس پڑھتے تھے۔ اِنھیں بھی وہیں بٹھا دیا۔ حافظ غلام رسول شاعر بھی تھے شوق تخلص کرتے تھے۔ اگلے وقتوں کے لوگ جیسے شعر کہتے ہیں، ویسے شعر کہتے تھے۔ محلّے کے شوقین نوجوان دلوں کی اُمنگ میں اُن سے کچھ کچھ کہوا لے جایا کرتے تھے اکثر اصلاح بھی لیا کرتے تھے۔ غرض ہر وقت اُن کے ہاں یہی چرچا رہتا تھا۔

شیخ مرحوم خود فرماتے تھے کہ وہاں سُنتے سُنتے مجھے بہت شعر یاد ہو گئے۔ نظم کے پڑھنے اور سُننے میں دل کو ایک روحانی لذت حاصل ہوتی تھی اور ہمیشہ اشعار پڑھتا پھرا کرتا تھا۔ دل میں شوق تھا اور خدا سے دُعائیں مانگتا تھا کہ الٰہی! مجھے شعر کہنا آجائے۔ ایک دن خوشی میں آکر خود بخود میری زبان سے دو شعر نکلے اور یہ فقط حُسنِ اتفاق تھا کہ ایک حمد میں تھا اور ایک نعت میں۔ مجھے اتنا ہوش تو کہاں تھا کہ اِس مُبارک کام کو خود اس طرح سمجھ کر شروع کرتا کہ پہلا حمد میں ہو اور دوسرا نعت میں۔ جب یہ خیال بھی نہ تھا کہ اِس قدرتی اتفاق کو مبارک فال سمجھوں مگر اُن دو شعروں کے موزوں ہو جانے سے جو خوشی دل کو ہوئی۔ اُس کا مزہ اب تک نہیں بھولتا۔ اُنھیں لکھیں اپنی کتاب میں، لکھیں جا بجا کاغذوں پر رنگ برنگ کی روشنائی سے لکھتا تھا۔ ایک ایک کو سُناتا تھا اور خوشی کے مارے پھولوں نہ سماتا تھا۔ غرض کہ

اسی عالم میں کچھ کہتے رہے اور حافظ جی سے اصلاح لیتے رہے۔

اسی محلہ میں میر کاظم حسین نام ایک ان کے ہم سن، ہم سبق تھے۔ بیقرار تخلص کرتے تھے اور حافظ غلام رسول ہی سے اصلاح لیتے تھے مگر ذہن کی جودت اور طبیعت کی برّاقی کا یہ عالم تھا کہ کبھی برق تھے اور کبھی باد و باراں۔ انھیں اپنے بزرگوں کی صحبت میں اچھے اچھے موقع ملتے تھے۔ شیخ مرحوم اور وہ اتحاد طبعی کے سبب سے اکثر ساتھ رہتے تھے اور مشق کے میداں میں ساتھ ہی گھوڑے دوڑاتے تھے۔

ایک دن میر کاظم حسین نے غزل لاکر سنائی۔ شیخ مرحوم نے پوچھا یہ غزل کب کہی؟ خوب گرم شعر نکالے ہیں۔ انھوں نے کہا ہم تو شاہ نصیر کے شاگرد ہو گئے۔ انھیں سے یہ اصلاح لی ہے شیخ مرحوم کو بھی شوق پیدا ہوا اور ان کے ساتھ جاکر شاگرد ہو گئے۔

سلسلۂ اصلاح جاری تھا۔ مشاعروں میں غزلیں پڑھی جاتی تھیں۔ لوگوں کی واہ واہ طبیعتوں کو بلند پروازیوں کے پر لگاتی تھی۔ کہ رشک جو تلامیذ الرحمٰن کے آئینوں کا جوہر ہے استاد، شاگردوں کو چمکانے لگا۔ بعض موقع پر ایسا ہوا کہ شاہ صاحب نے ان کی غزل کو دیکھ کر بے اصلاح پھیر دیا اور کہا کہ "طبیعت پر زور ڈال کر کہو" کبھی کہہ دیا یہ کچھ نہیں، پھر سوچ کر کہو۔ بعض غزلوں کو جو اصلاح دی اُس سے بے ادائی پائی گئی۔ ادھر انہیں کچھ تو یاروں نے چمکا دیا، کچھ اپنی غریب حالت نے یہ آزردگی پیدا کی کہ شاہ صاحب اصلاح میں بے توجہی یا پہلوتہی کرتے ہیں۔ چنانچہ اس طرح کئی دفعہ غزلیں پھیریں۔ بہت سے شعر کٹ گئے۔ زیادہ تر قباحت یہ ہوئی کہ شاہ صاحب کے صاحبزادے شاہ وجیہ الدین منیر تھے جو برّاقیِ طبع میں اپنے والد کے خلف الرشید تھے۔ اُن کی غزلوں میں توارد سے یا خدا جانے کس اتفاق سے وہی مضمون پائے گئے۔ اس لئے انہیں

زیادہ رنج ہوا۔

اگرچہ ان کی طبیعت حاضر، فکر رسا، بندش چست، اس پر کلام میں زور کے سب کچھ تھا مگر چونکہ یہ ایک غریب سپاہی کے بیٹے تھے۔ نہ دنیا کے معاملات کا تجربہ تھا، نہ کوئی ان کا دوست ہمدرد تھا۔ اس لئے رنج اور دل شکستگی حد سے زیادہ ہوتی تھی۔ اسی قیل وقال میں ایک دن سودا کی غزل پہ غزل کہی "دوش نقش پا، آغوشِ نقشِ پا" شاہ صاحب کے پاس لے گئے۔ انھوں نے خفا ہوکر غزل پھینک دی کہ استاد کی غزل پر غزل کہتا ہے۔ اب تو مرزا رفیع سے بھی اونچا اڑنے لگا۔ ان دنوں میں ایک جگہ مشاعرہ ہوتا تھا۔ اشتیاق نے بیقرار کرکے گھر سے نکالا مشاعرہ میں جاکر غزل پڑھی۔ وہاں بہت تعریف ہوئی۔ اس دن سے جرأت زیادہ ہوئی اور بے اصلاح مشاعرہ میں غزل پڑھنے لگے۔ اب کلام کا چرچا زیادہ تر ہوا۔ طبیعت کی شوخی اور شعر کی گرمی سننے والوں کے دلوں میں اثر برق کی طرح دوڑنے لگی۔ اس زمانہ کے لوگ منصف ہوتے تھے۔ بزرگانِ پاک طینت جو اساتذۂ سلف کے یادگار باقی تھے مشاعرہ میں دیکھتے تو شفقت سے تعریفیں کرکے دل بڑھاتے بلکہ غزل پڑھنے کے بعد آتے تو دوبارہ پڑھواکر سنتے۔

اکبر شاہ بادشاہ تھے۔ انھیں تو شعر سے کچھ رغبت نہ تھی مگر مرزا ابوظفر ولیعہد کہ بادشاہ ہوکر بہادر شاہ ہوئے، شعر کے عاشقِ شیدا تھے اور ظفر تخلص سے ملکِ شہرت کو تسخیر کیا تھا اس لئے دربار شاہی میں جو جو کہنہ مشق شاعر تھے، وہیں آکر جمع ہوتے تھے اپنے اپنے کلام سناتے تھے۔ مطلع اور مصرع جلسہ میں ڈالتے تھے۔ ہر شخص مطلع پر مطلع کہتا تھا۔ مصرع پر مصرع لگاکر طبع آزمائی کرتا تھا، میر کاظم حسین بیقرار کہ ولیعہد موصوف کے ملازم خاص تھے اکثر ان صحبتوں میں شامل ہوتے تھے۔ شیخ مرحوم کو خیال ہوا کہ اس جلسہ میں طبع آزمائی ہوا کرے تو قوت فکر کو خوب بلند پروازی ہو۔

لیکن اُس عہد میں کسی امیر کی ضمانت کے بعد بادشاہی اجازت ہوا کرتی تھی، جب کوئی قلعہ میں جانے پاتا تھا۔ چنانچہ میر کاظم حسین کی وساطت سے یہ قلعہ میں پہنچے اور اکثر دربار ولیعہدی میں جانے لگے۔

شاہ نصیر مرحوم کہ ولیعہد کی غزل کو اصلاح دیا کرتے تھے، دکن چلے گئے۔ میر کاظم حسین اُن کی غزل بنانے لگے۔ اُنھیں دنوں میں جان الفنسٹن صاحب تسکار پور سندھ وغیرہ سرحدات سے لیکر کابل تک عہدنامے کرنے کو چلے۔ اُنھیں ایک میر منشی کی ضرورت ہوئی کہ قابلیت وعلمیت کے ساتھ امارتِ خاندانی کا جوہر بھی رکھتا ہو۔ میر کاظم حسین نے اُس عہدہ پر سفارش کے لئے ولیعہد سے شقّہ چاہا۔ مرزا مغل بیگ اُن دنوں میں مختارِ کُل تھے اور وہ ہمیشہ اِس تاک میں رہتے تھے کہ جس پر ولیعہد کی زیادہ نظرِ عنایت ہو اُس کو سامنے سے سرکاتے رہیں۔ اِس قدرتی پیچ پر میر کاظم حسین کو شقّۂ سفارش آسان حاصل ہوگیا اور وہ چلے گئے۔

چند روز کے بعد ایک دن شیخ مرحوم جو ولیعہد کے ہاں گئے تو دیکھا کہ تیراندازی کی مشق کر رہے ہیں، اُنھیں دیکھتے ہی شکایت کرنے لگے کہ میاں ابراہیم! اُستاد تو دکن گئے۔ میر کاظم حسین اُدھر چلے گئے۔ تم نے بھی ہمیں چھوڑ دیا۔ اُسی وقت ایک غزل جیب سے نکال کر دی کہ ذرا اِسے تو بنا دو۔ یہہ وہیں بیٹھ گئے اور غزل بنا کر سُنائی۔ ولیعہد بہادر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ "بھئی کبھی کبھی تم آکر ہماری غزل بنا جایا کرو"۔ غرض چند روز اصلاح جاری رہی اور آخر کو سرکار ولیعہدی سے چار روپیہ مہینا بھی ہوگیا۔

چند سال کے بعد اُنھوں نے ایک قصیدہ لکھکر اکبر شاہ کے دربار میں سُنایا۔ جس کے مختلف شعروں میں انواع واقسام کے صنائع، بدائع صرف کئے تھے مطلع اُس کا یہہ ہے!۔

جبکہ سرطان واسدمہر کا ٹھہرا مسکن | آب دالیولہ ہوئے نشو و نمائے گلشن

اسپر بادشاہ نے "خاقانیٔ ہند" کا خطاب عطا کیا - اس وقت شیخ مرحوم کی عمر ۱۹ برس کی تھی -

اواخر ایام میں ایک بار بادشاہ (بہادر شاہ) بیمار ہوئے - جب شفا پائی اور اُنھوں نے ایک قصیدۂ غرا کہکر نذر گزرانا تو خلعت کے علاوہ خطاب "خان بہادر" اور ایک ہاتھی مع حوضۂ نقرئی انعام ہوا - پھر ایک بڑے زور شور کا قصیدہ کہکر گزرانا جس کا مطلع یہ ہے :-

شب کو میں اپنے سر بستر خواب راحت | نشۂ علم میں سرمست غرور و نخوت

۲۴ - صفر ۱۲۷۱ ہجری جمعرات کا دن تھا - ۱۷ دن بیمار رہ کر وفات پائی - مرنے سے تین گھنٹے پہلے یہ شعر کہا تھا :-

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گزر گیا

کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے"

اوّل ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ آزاد نے جہاں یہ لکھا ہے کہ "اسی واسطے میں لکھونگا اور جو باتیں اُن کے سلسلۂ حالات میں مسلسل ہو سکینگی اُس کا ایک حرف نہ چھوڑوں گا" ہم نے آزاد کی اس آزادی کو اس موقع پر کسی قدر جکڑ بند کردیا ہے یعنی الف سے ی تک ذوق کے حالات کی آبِ حیات سے نقل نہیں کی بلکہ تسلسل کو صدمہ پہنچائے بغیر اکثر باتیں چھوڑ دی ہیں - کیونکہ تمام و کمال حالات کا نقل کرنا نہ صرف ہمیں اجیرن معلوم ہوا بلکہ مضمون کی حد سے زیادہ طوالت غالباً ناظرین کے دل و دماغ پر بھی بُرا اثر ڈالتی -

شاید یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ لوح سے تمت تک آبِ حیات کا یہ قطرہ موتی سے زیادہ آبدار ہے اور انشا پردازی کے آسمان کا درخشندہ ستارہ ہے -

ذوق کے حالات پر رائے -

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم　　　　چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

اگرچہ[1] اس کا بے ساختہ پن، ساختہ ہے اور اس میں آمد، آورد کے زور سے پیدا کی گئی ہے کیونکہ بقولِ بعض، آزاد نے آبِ حیات کے مسودہ کو آٹھ آٹھ دس دس مرتبہ کاٹا چھانٹا ہے، تب یہ روانی، برجستگی، بے ساختگی اور پاکیزگی پیدا ہوئی ہے۔ آزاد نے سیدھے، سیدھے، صاف اور سادے بیان میں جا بجا رنگینیِ طبع کی ایسی جدولیں کھینچی ہیں کہ واہ وا۔

الفاظ کی شستگی اور سلاستِ بیان ہر فقرہ سے نمودار ہے۔ آبِ حیات میں محاکات اور تخیل دونوں پانی بھرتے ہیں۔ اثر بھی اس بلا کا ہے کہ پڑھنے والا اُس کو ناول اور قصہ سے زیادہ دلچسپی کے ساتھ پڑھتا ہے۔ نثر میں نظم کا سا لطف ہے بلکہ اُس سے بھی زیادہ۔ مگر آزاد کی نہ صرف یہ تصنیف بلکہ اور تصنیفات بھی اس عیب سے بری نہیں کہ اُن میں جنبہ داری پائی جاتی ہے۔ وہ ہندو مسلمانوں کے معاملات میں بے تعصب تھے اور اکثر صاحبِ قلم اہلِ ہنود اس کا اعتراف بھی کرتے ہیں لیکن دہلی اور لکھنؤ کے معاملہ میں ضرور اُنھوں نے لکھنؤ کے بعض باکمال اصحاب کو اپنی اسی کتاب آبِ حیات میں نظر انداز کر دیا ہے مولوی عبد الحلیم شرر نے اپنے ایک مضمون اردو لٹریچر میں اس کی سخت شکایت کی ہے۔ اور ایک حد تک صحیح ہے اسی مضمون میں آزاد نے اپنے اُستاد ذوق کو کس قدر آسمان پر چڑھایا ہے اور بے جا و بیجا اُن کی مدح سرائی کی ہے۔ حالانکہ آج زمانے نے ورق اُلٹ کر ثابت کر دیا ہے کہ وہ ہرگز اُس تعریف کے قابل نہ تھے جس کی بوچھار اُن پر کی گئی ہے۔ الحاصل آزاد فنِ تنقید سے دراصل ناآشنا نہ تھے لیکن اپنے محسن اُستاد کی تعریف میں رطب اللسان ہوتا ہی، وہ جو ہر شرافت جانتے تھے اور یہ نہ سمجھتے تھے کہ اپنے ممدوح کو فرشتہ بنا دینا

---

[1] یہاں سے ہم نے اپنی کتاب سیر المصنفین جلد دوم سے جو زیرِ طبع ہی کچھ عبارت مستعار لی ہی۔ تنہا۔

اِس قدر لکھنے کے بعد میں سوچ رہا تھا کہ اِن چاروں بزرگوں میں کس کو ترجیح دی جائے۔ چونکہ رات زیادہ آگئی تھی اور دماغ مسلسل لکھنے کی وجہ سے تھک گیا تھا میں اپنے پلنگ پر آرام کرنے کے لئے جا لیٹا۔ کچھ دیر تک اسی اُدھیڑ بن میں لگا رہا کہ کس کو سب پر تفوق حاصل ہے؟ اور یہی سوچتے سوچتے مجھے نیند آگئی۔

خواب

یکایک کیا دیکھتا ہوں کہ میں علی گڑھ کالج کے پرانے یونین کلب میں بیٹھا ہوں اور وہاں اسی مضمون پر کہ "اردو کے زندہ انشا پردازوں میں سب سے بڑا انشاپرداز حالی ہے" مباحثہ ہو رہا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ دیکھکر مجھکو کس قدر خوشی حاصل ہوئی اور میری طبیعت نے جو بیداری میں بےچین تھی کسقدر سکون محسوس کیا۔ چنانچہ میں اس مباحثہ کو غور سے سُننے لگا۔

پہلا طالب علم "جناب والا! سر سید مرحوم کے بعد اُردو کے انشا پردازوں میں میں سب سے زیادہ صحیح طور پر اپنے خیال کو ادا کرنے والی اور موزوں الفاظ استعمال کرنے والی صرف دو ہستیاں ہیں۔ آزاد اور حالی۔ یہ سچ ہے کہ مولوی نذیر احمد کی تحریر میں بھی بکثرت موزوں الفاظ پائے جاتے ہیں اور برمحل محاوروں کے استعمال سے اُن کی عبارت میں لُطف پیدا ہو جاتا ہے بلکہ میں کہوں گا کہ اُنھوں نے محاورات اور روزمرہ کو اس نہج پر استعمال کیا ہے کہ اُن کا اندازِ تحریر خاص ہو گیا ہے۔ الفاظ کی شوکت، عبارت کی متانت، طرزِ ادا کی بلاغت اُن کے قلم کی خاص اور مابہ الامتیاز صفت ہے۔ بعض لوگ معترض ہیں کہ مولانا مغلق الفاظ لکھتے ہیں اور غیر مانوس لغت لاتے ہیں۔ یہ ایک حد تک صحیح ہے لیکن اُن کے اس انداز سے زبان میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ بہت سے نئے الفاظ جو مقبول عام ہیں اُن کی بدولت زبان میں داخل ہو گئے ہیں۔ اس لئے اُن کا یہ انداز قابلِ ستائش ہے

نہ لایق ملامت ایسے ہی مصنفوں کی بدولت زبان وسعت پاتی ہے نہ لکیر کے فقیروں سے
اُن کا اسلوب بیان بھی نرالا ہے محاورے کو وہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے مگر عام
اسلوب کی شاہراہ پر چلنا اُن کو پسند نہیں۔ جہاں عام طرزِ ادا ابتذال پاتے ہیں
خود اکثر رفعت و متانت اختیار کرتے ہیں۔ اگر کسی باب میں عام روش، ثقاہت
و متانت کے دوش بدوش ہوتی ہے اور اُس کا بدلنا دشوار ہوتا ہے تو خود بلندی سے
پستی کی طرف آجاتے ہیں۔ متانت و رزانت چھوڑ کر سبکی اختیار کر لیتے ہیں مگر عام
پامال رستہ پر نہیں چلتے۔ تاہم اُن کی تحریرات میں بعض بعض موقع پر محاورات کا استعمال
برمحل نہیں۔ وہ انشا پرداز ہیں لیکن انشا پردازوں میں فوقیت کے مستحق نہیں۔

مولانا شبلی کی تصانیف کی سب سے بڑی خصوصیت فلسفیانہ تحقیق و تدقیق،
مضبوطیٔ رائے اور منطقی استدلال ہے۔ ان میں ایک قسم کی جدت بھی ہے اور طرزِ ادا
میں دل آویزی اور عام فہمی کا خیال ملحوظ رکھا گیا ہے۔ جو خصوصیتیں اوائلِ اسلام
کے ائمہ و مجتہدین میں پائی جاتی تھیں اُن کی جھلک یہاں بھی نمودار ہے۔ عالمانہ
عبور، غور و خوض کی قوت، تحقیق و تجسس، درایت، علمی جانچ پرتال کی عادت،
اپنی طبیعت سے کسی نتیجہ پر پہنچنا، پیچیدہ مسئلہ کو تیرہ و تاریک جھاڑیوں اور خارستان
سے نکال کر سلجھانا اور پھر تقسیم و تحلیل کرنا بعد ازاں اُسے ایسے طور سے ترتیب دینا
کہ وہ شے اپنی اصلی حالت میں نظر آنے لگے۔ یہ اُن کی خصوصیات ہیں۔ مولانا شبلی
میں ایک عجیب خوبی یہ ہے کہ قدیم و جدید میں ایسا پیوند لگاتے ہیں کہ مطلق اجنبیت
باقی نہیں رہتی معاملہ فہمی اور دور اندیشی بھی آپ کے خصائص میں سے ہے۔

آپ کی تصانیف کے مطالعہ سے دنیائے اسلام کی وسعت و عظمت اور
خوبیوں اور ترقیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ غیر اقوام پر ان کے پڑھنے سے اسلام
کی حقیقی عظمت اور خوبیاں منکشف ہو جاتی ہیں۔ یہ کتابیں سہل پسندی،

عام فہمی اور دلاویزی میں اپنی آپ نظیر ہیں۔

باایں ہمہ موجودہ انشا پردازوں پر اُن کو ترجیح نہیں دی جاسکتی۔ وہ ہمیشہ تصویر کا ایک رُخ دکھاتے ہیں اور دوسرے رُخ سے چشم پوشی اختیار کرتے ہیں۔ اپنے ممدوح کی تعریف میں حد سے گزر جاتے ہیں۔ جو آئینِ جہانبانی اِس زمانہ سے وابستہ ہیں، اُن میں سے بعض بعض کو وہ خلفائے راشدین کے زمانہ میں موجود بتاتے ہیں جن کو صحیح ماننا اور تسلیم کرنا صرف راسخ العقیدہ مسلمانوں کا کام ہے۔ غیر مذہب والے ہرگز اُن کی اِس قسم کی تحریرات سے مطمئن نہیں ہوسکتے۔

جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے اب صرف آزاد اور حالی رہ جاتے ہیں مولوی ذکاء اللہ کا شمار انشا پردازوں میں نہیں ہوسکتا اگرچہ اُن کی تصنیفات کی تعداد (۱۴۳) ہے۔ بے شک ہماری بدقسمتی سے آزاد باوجود زندہ ہونے کے اُردو کی خدمت سے معذور ہیں کیونکہ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ وہ جنون کے مرض میں مبتلا ہیں تاہم جو کچھ اُردو کی خدمت اُن سے ظہور میں آئی ہے۔ میں بلا تامل کہہ سکتا ہوں کہ وہ موجودہ مصنفیں کی خدمات سے بہت زیادہ اور ارفع ہے۔

ایک طالب علم (درمیان میں اُٹھکر انگریزی میں) جناب! مقرر نفس مضمون سے علیحدہ ہوکر دوسری طرف جارہا ہے۔ اُسکو روک دیا جائے۔

نائب صدر۔ (یہ بھی ایک طالب علم ہے اور اگرچہ پرنسپل یونین کلب کا صدر ہوتا ہے لیکن صدارت ہمیشہ ہی نائب صدر کیا کرتا ہے۔ مقرر سے انگریزی میں مخاطب ہوکر) کیا آپ مہربانی فرماکر اصل مضمون کی طرف رجوع کریں گے اور اعتراض کا موقع نہ دیں گے؟

پہلا طالب علم (اپنی تقریر کو شروع کرتے ہوئے) آزاد کی انشا پردازی سے کون منکر ہو سکتا ہے؟ اب کا تو کیا ذکر لیکن جب اُن کا دماغ جنون کے اثر سے محفوظ تھا تو قلم اُن کی چوب تھی اور کاغذ اُن کا نقارہ اور انھیں سے اُن کی شہرت کا آوازہ سارے ہندوستان میں گونج اُٹھا۔ لیکن آبِ حیات میں ذوق کا حال پڑھو اور دربارِ اکبری میں اکبر کا تو معلوم ہوگا کہ اُردو کا لارڈ میکالے آزاد ہے۔ جس طرح انگریزی میں لارڈ میکالے کی تاریخ پایۂ اعتبار سے گری ہوئی ہے یا اُسکے مضامین کو وہ وقعت نہیں دی جاتی جس کے وہ زبان کی سلاست اور روانی کے لحاظ سے مستحق ہیں، اسی طرح اُردو میں ذوق اور اکبر کے حالات شوق سے ضرور پڑھے جاتے ہیں لیکن دونوں کی نسبت صحیح رائے اُن تحریرات کے مطالعہ سے قائم نہیں ہو سکتی۔

برخلاف اس کے مولانا حالی کا ڈھنگ جداگانہ ہے۔ وہ فنِ تنقید کے بادشاہ ہیں اور سوانح عمری لکھنے میں اپنی آپ نظیر ہیں۔ طرزِ عبارت سادہ اور مؤثر ہے۔ مبالغہ سے پاک ہے اور واقعیت سے وہ کبھی تجاوز نہیں کرتے۔ تعریف ہے تو حدود کے اندر، اور اعتراض ہے تو صحیح۔ نہ اُستادی کا خیال ہے نہ دوستی کا، نہ بزرگی کا خیال ہے نہ پبلک کے مذاق کا، بلکہ جو کچھ کہنا ہوتا ہے صاف صاف بے کم و کاست کہتے ہیں اور کبھی بیجا طور پر نکتہ چینی نہیں کرتے اور واقعی نقائص کے دکھلانے میں کبھی کوتاہی نہیں کرتے۔

اُن کو انگریزی کے مشہور مصنف مسٹر جان مارلے[1] سے تشبیہ دی جا سکتی ہے بعینہٖ جو فرق میکالے اور مارلے میں ہے وہی آزاد اور حالی میں ہے۔ میکالے کا اندازِ تحریر اب مفقود و متروک ہے اور مارلے کا اسلوبِ بیان دلکش و مقبول ہے

[1] بعد ازاں لارڈ مارلے ہوئے اور وزیرِ ہند بھی رہ چکے ہیں۔ اب فوت ہو گئے ہیں تنہا۔

اسی طرح افسوس آزاد ہی کی زندگی میں آزاد کا رنگ مفقود و متروک ہو گیا ہے اور حالی کے طرز کا سب اتباع کرتے ہیں اور میں یہ کہوں گا کہ حالی کا رنگ ہمیشہ مقبول رہیگا۔ میرا امن کو میرے ہوئے غالباً ستو برس ہوئے ہیں لیکن اُن کی باغ و بہار اب بھی زندہ ہے۔ کیا وجہ؟ سادگی کے ساتھ اُن کی زبان میں لوچ ہے اور یہی بات حالی میں موجود ہے۔ لہٰذا میری رائے میں اُردو کے موجودہ انشا پردازوں میں حالی سب سے فائق ہے۔"

دوسرا طالب علم:- "مجوز صاحب نے جو یہ تجویز پیش کی ہے کہ "اُردو کے زندہ انشا پردازوں میں سب سے بڑا انشا پرداز حالی ہے" میں اُسکی تردید کے لئے یہاں کھڑا ہوا ہوں۔ مجھے ہرگز مجوز سے اتفاق نہیں اور میں یہ کہنے کے لیے مجبور ہوں کہ آزاد کے ہوتے ہوئے مجوز صاحب کی زبان سے حالی کا کیونکر نام نکلا۔ اُن کو چاہیے تھا کہ وہ موجودہ تجویز کی بجائے یہ تجویز پیش کرتے کہ "اُردو کے زندہ انشا پردازوں میں سب سے بڑا انشا پرداز آزاد ہے"۔ کیا مجوز صاحب کو یہ معلوم نہیں کہ حالی جا بجا انگریزی الفاظ اپنی تحریرات میں استعمال کرتے ہیں؟۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حالی اپنی زبان کے لحاظ سے بے بضاعت ہیں اگر یہ کہا جائے کہ ہماری اُردو زبان خود بے بضاعت ہے۔ تو میں یہ امر ہرگز تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ میں حالی کی تحریرات میں ایک جگہ نہیں بیسیوں جگہ دکھلا سکتا ہوں کہ اُنھوں نے خواہ مخواہ انگریزی الفاظ ٹھونس دئے ہیں حالانکہ اُن کے مرادف الفاظ ہماری زباں میں موجود ہیں۔ اور اگر وہ ذرا غور و تامل سے کام لیتے تو جن انگریزی الفاظ کو انھوں نے استعمال کیا ہے اُن کی جگہ عربی کے لفظ لکھ سکتے تھے۔ غالباً عربی زبان کے خزانہ کو اتنا خالی نہ سمجھا جائیگا جتنا کہ اُردو زبان کو مفلس و نادار سمجھا جا رہا ہے۔ آزاد نے کسی انگریزی لفظ کو جب تک کہ وہ ہماری

زباں میں مروّج نہیں ہو گیا اور خود ہماری زبان کا لفظ نہیں بن گیا استعمال نہیں کیا۔
اسی ایک بات کے موازنہ سے حالیؔ، آزادؔ سے کم درجہ پر نظر آتے ہیں ۔
جہانتک انشا پردازی کا تعلق ہے آزادؔ پر یہ اعتراض بیجا ہے کہ وہ اپنے ممدوح کا روشن پہلو دکھاتے ہیں یا اُسے آسمان پر چڑھا دیتے ہیں ۔ ہمارا مقصود بالذات تو یہ ہے کہ وہ "کیسا" لکھتے ہیں نہ یہ کہ وہ "کیا" لکھتے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ اُن کی تحریرات کا کوئی مدِّ مقابل نظر نہیں آتا ۔ کسی کی تحریر میں اُن صفات کا شائبہ تک نہیں جن سے اُن کی تصنیفات مالامال ہیں ۔ وہ تشبیہ و استعارات، وہ طرزِ بیان، وہ سلاستِ زبان، وہ شستگی الفاظ، وہ برجستگی، وہ بے ساختہ پن کسی اَور تصنیف میں کہاں ہے ؟ ۔
آزادؔ نے اُردو نثر کے باغ میں نئے گل بوٹے لگائے ۔ نئی کیاریاں اور نئی روشیں نکالیں اور اسکے بوسیدہ جسم میں نئی روح پھونکی ۔ ایجاد اور نو آئینی اسے کہتے ہیں کہ انہدام کے ساتھ تعمیر بھی ہو ۔ سادگی کے ساتھ رنگ آمیزی بھی ہو ۔ آزادؔ نے پرانے ملبہ میں ایک اینٹ بھی کام کی ہوئی تو اُٹھائی اور نئے چونے سے نئی عمارت میں چُن دی ۔ ماضی کی عزت، حال پر شفقت، مستقبل کی فکر یہ طرزِ عمل اس ادبی مصلح کا رہا ہے اور حق یہ ہے کہ اُردو ادب میں یہ اختراع و اصلاح کر کے پروفیسر آزادؔ نے زباندانانِ ملک کے لئے ایک شاہراہ بنا دی ہے خواہ کوئی اس پر چلے یا نہ چلے۔
آزادؔ نے آبِ حیات لکھکر احیائے قدامت کیا ہے، اُردو نثر کو نظم کا ہمپایہ بنا دیا، اور اُردو زبان کو تاریخی حیثیت بخشی ہے ۔
دربارِ اکبری بھی اپنی عبارت کی رنگینی کے اعتبار سے اُن کی بہترین تصنیفات میں سے ہے اگرچہ یہ کتاب وہ خود ترتیب و نظرِ ثانی کے بعد نہیں چھپوا سکے تاہم کتاب کے دلاویز ہونے میں کوئی شک نہیں ۔ اس کتاب میں اکبر کے زمانہ کی تاریخ کو صرف شاہی کارناموں تک محدود نہیں کیا ہے بلکہ اُس زمانہ کے رسم و رواج، طرزِ ماندوبود،

ملک کی عام حالت، رعایا کی مرفہ الحالی اور دیگر خیالات کا نقشہ کھینچکر پڑھنے والوں کو یہ یقین دلا دیا ہے کہ وہ اُس زمانہ میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور اپنی آنکھوں سے تمام حالات مشاہدہ کر رہے ہیں۔

ان وجوہات کی بنا پر میں اِس تجویز سے اتفاق نہیں کرتا اور یہ ترمیم پیش کرتا ہوں کہ بجائے حالی کے آزاد کا نام تجویز میں درج کیا جائے۔ بہرحال میں موجودہ تجویز سے سخت اختلاف رکھتا ہوں اور اِس کا مخالف ہوں۔

تیسرا طالب علم۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ آج کا مضمون نہایت ہی دلچسپ ہے اور ممبرانِ کلب اس میں کافی دلچسپی لے رہے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انشا پردازی سے کیا مراد لی جارہی ہے؟ کیا شاعری کی طرح اسے بھی مبالغہ اور رنگینی کا آماجگاہ سمجھا گیا ہے۔ اگر یہ خیال ہے تو بالکل غلط ہے۔ انشا پردازی سے مطلب صرف لوگوں کے دلوں پر اثر پیدا کرنا ہے خواہ یہ مقصد تشبیہ و استعارات سے حاصل ہو، خواہ تلمیحات سے، خواہ محاورات سے، خواہ مثلوں اور کہاوتوں سے خواہ لطیفوں اور بذلوں سے۔ لہٰذا میں یہ کہنے کے لئے تیار ہوں کہ مولوی نذیر احمد کی تحریرات دل میں جاگزیں ہو جاتی ہیں۔ اُن کی کتابیں مرآۃ العروس اور بنات النعش اور توبۃ النصوح اپنی آپ نظیر ہیں۔ پہلی دو کتابیں عورتوں کی تعلیم میں نہایت ممد و معاون ثابت ہوئی ہیں اور توبۃ النصوح تربیت اولاد اور مذہبی تعلیم کے لحاظ سے لاجواب کتاب ہے۔ قرآن شریف کا ترجمہ ہر مسلمان کیلیے کارآمد اور مفید ہے۔ ابتک جو ترجمے ہماری زبان میں تھے وہ عبارت کی بے ترتیبی کی وجہ سے سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ مولانا نذیر احمد نے اپنی انشا پردازی سے کام لیکر ایسا بامحاورہ ترجمہ کیا ہے جو اب کوئی اور شاید نہ کر سکے۔ یہ ایسا مشکل کام تھا کہ جسکے اہل نہ شبلی تھے نہ حالی اور نہ آزاد۔ بس میں اس تجویز

کی مخالفت کرتے ہوئے عرض کروں گا کہ میرے نزدیک موجودہ انشا پردازوں میں سب سے فایق و برتر مولوی نذیر احمد ہیں ۔

چوتھا طالب علم ۔"جس قدر عبور اپنی زبان پر آزاد کو حاصل ہے وہ دوسرے کو میسّر نہیں ۔ مولوی نذیر احمد بھی کسی مصنّف سے اس بارہ میں کم نہیں ۔ مولانا حالی بھی ضرور قادر الکلام ہیں ۔ یہ اور بات ہے کہ اُنھوں نے انگریزی الفاظ ضرورت سے زیادہ استعمال کئے ہیں ۔ اِس سے اُن کی قادر الکلامی میں بٹّہ نہیں لگتا ۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو اُنھوں نے انگریزی الفاظ اُسی موقع پر استعمال کئے ہیں جہاں اُردو کے الفاظ اُس مطلب کو جس کو وہ ادا کرنا چاہتے ہیں ظاہر کرنے میں قاصر ہیں ۔ علاوہ ازیں ہماری زبان کی خصوصیت یہی ہے کہ وہ ہر زبان کے الفاظ کو آسانی سے جگہ دے دیتی ہے ۔ ایک انشا پرداز اجتہاد کا درجہ رکھتا ہے ۔ اُس کے لئے ضرور نہیں کہ وہ اُنھیں الفاظ کو استعمال کیا کرے جو اگلے مصنفین اُسکو ترکہ کے طور پر چھوڑ گئے ہیں ۔ اُسکو اختیار ہے کہ وہ متروک لفظ کو مستعمل بنا دے اور مروّج کو متروک کر دے ۔ ہماری زبان میں جو لچک ہے اس کے لحاظ سے اسکو بے مایہ کہنا سراسر غلطی ہے ۔ اِس کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ جو لفظ چاہے کسی دوسری زبان سے چھین لے اور اُسکو اپنے میں ایسا ملالے کہ مطلق اجنبیت باقی نہ رہے ۔ پس مولانا حالی پر جو اعتراض انگریزی الفاظ کے استعمال کے بارہ میں کیا گیا ہے وہ بیجا ہے اور میں اُسکے ماننے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہوں (شنو شنو کے نعرے) ۔ کیا مولوی نذیر احمد اور علامۂ شبلی اِس سے مستثنٰی ہیں ؟ ۔ ہرگز نہیں ۔ آزاد بھی اِس سے آزاد نہیں صرف فرق کم و بیش کا ہے جو نظر انداز کئے جا سکنے قابل ہے ۔ البتہ میری رائے میں حالی کی جگہ شبلی کو یہ درجۂ امتیاز حاصل ہے کہ وہ انشا پردازوں میں سب سے بیش بیش اور برتر

مانے جائیں ۔ اُنھوں نے مختلف النوع کتابیں تحریر کی ہیں ۔ اُن کی تصنیفات سے ہم کو سلفِ صالحین کے عادات و حالات کا پتہ چلتا ہے ۔ تاریخ اسلام کا علم جو ہمارے لئے نہایت ضروری اور ناگزیر ہے شبلی کی تحریرات میں موجود ہے۔ قرآنِ شریف کا ترجمہ جو مولوی نذیر احمد نے کیا ہے بے شک وہ با محاورہ اور سہل الفہم ہے لیکن مولوی صاحبان اُس پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ بعض بعض جگہ غلط ترجمہ ہوا ہے ۔ حالی کی تصنیف حیاتِ جاوید بے شک عمدہ اور کار آمد ہے اور مجھکو بد قسمتی سے شاعری سے کوئی دلچسپی نہیں ہے مگر سُنتا ہوں کہ شعر و شاعری پر اُن کا مقدمہ لاجواب ہے ۔ شاید ایسا ہو لیکن حال ہی میں شبلی کی کتاب موازنۂ انیس و دبیر شائع ہوئی ہے ۔ کیا اس سے زیادہ موشگافیاں اور نکتہ سنجیاں حالی کے مقدمۂ شعر و شاعری میں پائی جاتی ہیں ؟ ۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ چاروں بزرگ قابلِ احترام اور لایقِ عزت ہیں اور سچ یہ ہے کہ اپنی اپنی پسند ہے ۔ میں تو علامۂ شبلی کو سب پر ترجیح دیتا ہوں اور تجویز موجودہ سے اختلاف کرتا ہوں ''

اس کے بعد کئی طالب علموں نے تقریریں کیں دو چار نے تجویز سے موافقت کی اور ایک دو نے مخالفت کی بعد ازاں مجوز نے مخالفین کا جواب دیا وہ تقریریں حافظہ میں محفوظ نہیں رہیں لہٰذا اُن کے لکھنے سے معذوری ہے ۔ جب تمام تقریریں موافق و مخالف ختم ہو چکیں تو تجویز کو دوبارہ پڑھا گیا اور نائب صدر نے ممبران کی آراء طلب کیں ۔ کثرتِ رائے سے تجویز پاس ہو گئی اور جلسہ برخاست ہوا ۔ علی گڑھ کے طالب علم شور و شغب کرنے میں مشہور آفاق ہیں اور شرارت اُن کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے ۔ جلسہ برخاست ہوتے ہی اُنھوں نے اتنا شور و غل مچایا کہ میں پلنگ پر سوتا سوتا اُچھل پڑا اور میری آنکھ کھل گئی ۔ کیا دیکھتا ہوں کہ نہ علی گڑھ کالج ہے

نہ یونین کلب ہے، نہ علی گڑھ کے شریر طلباء۔ نہ ۱۹۵۰ء کا وہ مباحثہ ہے بلکہ ۱۹۶۴ء کی ۲۸ دسمبر کی صبح نمودار ہے۔ اور میں غازی آباد میں اپنے مکان پر موجود ہوں۔

میں نے جلدی جلدی حوائجات سے فارغ ہوکر وضو کی اور نمازِ فجر ادا کی۔ بعد ازاں فوراً رات کے خواب کی سرگزشت جو کچھ حافظہ میں قائم تھی لکھنی شروع کی۔ الحمدللہ کہ بحث کا ضروری حصہ یاد رہ گیا۔

سوال کا جواب۔

اور میں نے اسکو تائیدِ غیبی سمجھا کہ مولوی ظفرالملک صاحب علوی کے سوال کا جواب یہی دیا جائے کہ مولانا حالؔی سب سے بڑے انشا پرداز تھے۔ صبح صادق کا خواب کبھی جھوٹا نہیں ہوتا۔ پس میں تو اس رائے پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہوں کہ مولانا حالی انشا پردازی میں سب سے گوئے سبقت لیگئے ہیں۔ آپ اس کو مانیں یا نہ مانیں۔

جو بات تھی صلاح کی سو ہم نے دی بتا   آیندہ اپنے فعل کا ہے تم کو اختیار

سوال کا دوسرا جزو اور اسکا جواب

لیکن مولوی ظفرالملک کے سوال کا دوسرا جزو ابھی حل طلب ہے۔ وہ یہ کہ "سب سے زیادہ اُردو کی خدمت کس نے انجام دی؟" بلاشبہ مولانا حالی نے اپنی نظم و نثر سے قومی خدمت سب سے زیادہ کی ہے مگر سوال اُردو کی خدمت کا ہے۔ سوانح عمری کا رواج اُردو زبان میں مولانا حالؔی کی بدولت ہوا مقدمۂ شعر و شاعری سے، شاعری کی اصل حقیقت کا پتہ چلا اور طبیعتیں قدیم طرز کی شاعری سے نفور ہوگئیں۔ مجالس النساء سے تعلیمِ نسوان کو بہت مدد پہنچی اور مسلمانوں میں تعلیم نسواں کی تحریک پیدا ہوگئی۔ یہ چاروں انشا پرداز عجیب اتفاق ہے کہ تھوڑے بہت شاعر بھی تھے۔ ہم نے تھوڑے بہت کا لفظ مولوی نذیر احمد صاحب کی وجہ سے استعمال کیا ہے کیونکہ وہ کبھی کبھی نظمیں کہہ لیتے تھے۔ آزاد، شبلی اور حالؔی پورے شاعر تھے لیکن حالؔی کا درجہ میدانِ شاعری میں ان تینوں سے بہت ارفع اور اعلیٰ ہے اس لیے

اُردو کی جو بلحاظ شاعری خدمت دیکھی جائے تو اس میں بھی حالی ہی سب سے آگے نظر آئینگے۔ لیکن سوال کے پہلے جزو کو دوسرے جزو کے ساتھ پڑھنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ بلحاظ انشا پردازی ان میں سے کس نے سب سے زیادہ اُردو کی خدمت انجام دی؟ مجھکو اپنے خواب پر جس کا میں ابھی ذکر کر چکا ہوں بیحد اعتقاد ہوگیا ہے۔ چنانچہ پہلے طالب علم نے اپنی تقریر کے دوران میں یہ الفاظ ادا کئے تھے۔

"بے شک ہماری بدقسمتی سے آزاد باوجود زندہ ہونے کے اُردو کی خدمت سے معذور ہیں کیونکہ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ وہ جنون کے مرض میں مبتلا ہیں تاہم جو کچھ اُردو کی خدمت اُن سے ظہور میں آئی ہے میں بلا تامل کہہ سکتا ہوں کہ وہ موجودہ مصنفین کی خدمات سے بہت زیادہ اور ارفع ہے" اسپر ایک طالب علم نے اعتراض کیا تھا کہ مقرر نفس مضمون سے علیحدہ ہوکر دوسری طرف جا رہا ہے اور نائب صدر نے مقرر سے کہا تھا کہ وہ اصل مضمون کی طرف رجوع کریں۔ مجھکو اب تک اُس طالبعلم پر غصہ آرہا ہے کہ اُسنے مقرر کو خواہ مخواہ ٹوک دیا۔ ورنہ وہ اپنی تقریر میں ضرور اس مسئلہ پر بھی کافی روشنی ڈالتا اور مجھکو سوال کے اس دوسرے جزو کے جواب دینے میں آسانی ہوجاتی۔ تاہم جواب تو وہ طالب علم دے ہی چکا ہے اب مجھے صرف اِس جواب کو مدلل کرنا باقی ہے میں بھی فی الواقع سمجھتا ہوں کہ آزاد نے اِن سب اصحاب سے زیادہ اُردو کی خدمت انجام دی ہے۔ آزاد نہ کسی ایسوسی ایشن کے ممبر تھے نہ وہ کسی کانفرنس میں شریک ہوئے اور نہ وہ کسی ملی و ملکی تحریک کے بانی ہوئے۔ اُن کو شروع سے اپنی زبان کے تحفظ کا خیال تھا اور اسی کو دلچسپ اور ہردلعزیز بنانے میں اُنھوں نے اپنی تمام عمر صرف کردی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کرنل ہالرائڈ جو ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم صوبہ پنجاب تھے اُنھوں نے آزاد کی مدد سے صوبۂ پنجاب میں اُردو کو ہردلعزیز بنا دیا۔ اور دلی اور لکھنؤ کی تباہی کے بعد اُردو کا صدر مقام لاہور ہوگیا۔ سیکڑوں اخبارات

ورسائل پنجاب سے شائع ہونے لگے اور اب بھی اُردو اخبارات ورسائل جسقدر صوبۂ پنجاب سے شائع ہوتے ہیں کسی اور صوبہ میں اتنی تعداد میں نہیں نکلتے - کیا کوئی اور مصنف دعویٰ کر سکتا ہے کہ اُسنے کسی ایسے صوبے میں جہاں عوام کی زبان اُردو نہ ہو اُردو کو رائج کر دیا ہے اور اُردو کی قدر وطن سے زیادہ غربت میں کی گئی ہے - یہ فخر آزاد ہی کو حاصل ہے اور اِس میں چون و چرا کرنے کی حاجت نہیں مختلف النوع کتابیں لکھنا اَور بات ہے اور اُردو کو اپنی تحریرات سے مطبوع و مقبول کرا دینا دوسری بات ہے -

فر بھی چیزے دگر آماس چیزے دیگر است

یوں تو اِن سب بزرگوں نے حتی المقدور اُردو کی خدمت کی ہے اور اُردو زبان اِن کے احسانات سے کسی آیندہ زمانہ میں بھی سبکدوش نہیں ہو سکتی لیکن آزاد کی خدمات نہایت وسیع اور نہایت اعلیٰ ہیں - اور اُس زمانہ میں اُن سے ظہور میں آئی ہیں جب اُردو کے مخالفین خواب غفلت میں تھے - یعنی اُنھوں نے اُردو کی خدمت کسی مخالفت کی بنا پر نہیں کی بلکہ اُن کا ذوقِ زبان اُن کو مجبور کرتا تھا کہ وہ اپنی زبان کا تحفظ کریں اور اپنے اردگرد کے لوگوں میں اِسی کا چرچا کریں - جب اُردو ناگری کا قضیۂ نامرضیہ اِس صوبہ میں اُٹھا تو سوائے سرسید کے اَور اہلِ زبان یا مصنفین نے کیا کیا؟ کچھ بھی نہیں کیا اور اب تک کچھ نہیں کرتے تصنیفات سے بلاشبہ اُردو کی خدمت ہوتی ہے لیکن آجکل کے زمانہ میں سب سے بڑی خدمت اُردو کی یہی ہے کہ تصنیفات کو اہلِ ملک کے ہاتوں تک پہنچایا جائے - ورنہ کتابوں کا لکھا جانا اور کیڑوں کی نذر ہونا بے سود ہے آزاد کی خدمت اِس بارہ میں ظاہر ہے - پنجاب میں اُردو کتابیں نہ صرف لکھی جاتی ہیں بلکہ خوب فروخت ہوتی ہیں - اُردو اخبارات ورسائل نہ صرف

شائع ہوتے ہیں بلکہ عوام دلچسپی سے خریدتے اور پڑھتے ہیں۔ اور یہ حالت جو اس وقت پنجاب میں ہے، میں بلا خوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ یہ حضرتِ آزاد ہی کے دم قدم سے ہے ورنہ پنجاب میں کوئی اُردو کا نام بھی نہ جانتا۔

محمد یحییٰ تنہا (بی۔اے)
وکیل غازی آباد